گلیوں اور بازاروں میں

(افسانے/کہانیاں)

محمد الیاس

گلیوں اور بازاروں میں

(افسانے/کہانیاں)

محمد الیاس

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Muhammad Ilyas
Galion Aur Bazaaron Main/
Muhammad Ilyas.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2016.
256pp.
1. Urdu Literature - Fiction.
I. Title.

2016ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2929-4
ISBN-13: 978-969-35-2929-6

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall) Lahore-54000 PAKISTAN
Phones 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

ابتدا

میرے اللہ کے نام سے

اِس اِلتجا کے ساتھ

کہ زمین پر انصاف دے

یا اسے نابود کر۔

پروفیسر محمد عبدالحیؔ کے نام

جو دُور ہو کر بھی دل کے قریب ہے۔

فہرست

آخری دُعا

تحریر میں کوئی ابہام نہ پایا گیا۔ خوش خط، واضح اور سلیس۔ گویا طویل عرصے سے شعور کے کسی پرت میں ترتیب پاتی رہی اور سطحِ قرطاس پر یوں منتقل ہوئی جیسے محض پرنٹ اتارا گیا ہو۔ لکھا تھا:

''میرے اس اقدام کا کسی کو دوش نہ دیا جائے۔ میری شریکِ حیات، اولاد میرے عزیز رشتہ دار، اڑوس پڑوس اور دوست احباب، کوئی بھی خطاوار نہیں۔ نہ کسی سے مجھے گلہ ہے۔ بیوی نے میری اجازت سے ملک چھوڑا تا کہ بیٹے اور بیٹی کے پاس رہے۔ میں اپنی مرضی سے تنہا ہوا۔ موجودہ آئی جی میری لکھائی کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اُس کو صرف اطلاع دی جائے۔ وہ خود ہی پڑھ لے گا۔ چوتھی سے دسویں جماعت تک ہمارے ڈیسک پہلو بہ پہلو جُڑے ہوا کرتے تھے۔ لوگ اس کو سخت گیر پولیس افسر کے طور پر جانتے ہیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ اپنی فطرت میں کتنا معصوم اور نرم دل ہے۔ دسویں جماعت میں اُس نے جو 'My Best Friend' '' مضمون لکھا، اُس میں مجھے اپنا بہترین دوست قرار دیا اور مجھے بڑے شوق سے پڑھایا۔ میں نے اپنے مضمون میں کوئی خیالی پیکر تراش لیا اور جو نام لکھا، وہ ہم عصر لڑکوں میں سے کسی کا نہ تھا۔ وہ میری

انگریزی کی کاپی مانگتا رہا تا کہ مضمون پڑھ سکے۔ میں ٹال گیا۔ تفریح کے پیریڈ میں اُس نے تنہا بیٹھ کر میری تحریر پڑھ لی اور اتنا رویا کہ کاپی کے صفحات پر ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں سے الفاظ سیاہی کے دھبوں میں بدل گئے۔ میرے اچانک آ جانے سے اُس نے کاپی فوراً میرے ڈیسک کے خانے میں رکھی اور زار وقطار روتے ہوئے باہر بھاگ گیا۔

میں نے یہ اس نیت سے لکھا ہے کہ میرا ہم مکتب اب ذمہ دار افسر ہے۔ اُس کو سب یاد آ جائے اور میری تحریر کی تصدیق کر دے تا کہ کوئی الجھاوا نہ پیدا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے سوال اٹھیں گے۔ مثلاً یہ کہ کیسے بظاہر ایک خوش اور مطمئن شخص اپنی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ یقیناً انہونی ہوئی ہوگی۔ دل پر بڑا صدمہ وارد ہوا ہوگا۔ بے وفائی کی گہری چوٹ لگی ہوگی۔ ممکن ہے، کوئی محرومی نارسائی جان کا روگ بنی ہو۔ بعید نہیں کہ زوج کے بہت قریب کسی ہم نفس نے مایوس کیا ہو۔ کوئی ملال، کوئی جگر خراش پچھتاوا بھی جان کا رگ بن سکتا ہے۔ امید کا فقدان بھی ان عوامل میں شامل ہے، جس کے نتیجے میں، مزید زندہ رہنے میں دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

ایسا کچھ نہیں۔ دراصل میں خود اپنی توقعات پر ہی پورا نہیں اُترا اور اپنے آپ سے مایوس ہو چکا ہوں۔ ازراہ کرم میرے بارے میں قیاس کے تنکوے نہ اڑائے جائیں۔ میں نے اس بنا پر مرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ آج نہیں تو کل مرنا ہے۔ میں زندگی بھر کوئی بھی اہم کام اپنی مرضی کے مطابق نہیں کر سکا۔ اللہ کی ذات پر میرا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ لیکن ماسوائے معمولی خواہشوں کے کوئی بھی بڑی آرزو پوری نہ ہوئی۔ باوجود اس کے کہ اللہ کے حضور دل کی گہرائیوں سے دعائیں مانگیں۔ جس شعبے میں تعلیم حاصل کرنے کی تمنا تھی، پوری نہ ہو سکی۔ نہ صرف یہ کہ اپنی مرضی کا پیشہ اختیار نہ کر سکا، ستم بالائے ستم، جو ذریعۂ معاش بنا، وہ یکسر میرے مزاج کے خلاف تھا۔ مجھے

حسرت ہی رہی کہ فراغت کا کچھ وقت اپنے گھر میں والدین کے ساتھ گزار سکوں لیکن میرے مقدر میں لکھی مصروفیات اور مسافتیں اُن کی زندگی میں ختم نہ ہوئیں۔ جن پُر سکون مناظر کی آغوش میں آشیانہ بنانا چاہا، اس کے برعکس، پُر شور ہنگامہ خیز شہر میں کنکریٹ کا قید خانہ میرا مسکن بنا رہا۔ مجھے اچھی شریکِ حیات ملی لیکن میں اُس کو وہ آسائشیں مہیا نہ کر سکا، جو خواہش تھی۔ اولاد کو عملی زندگی کی کامیابیوں کے اُس درجے پر نہ دیکھ، جو سوچ رکھا تھا۔

گزری عمر کی چند دہائیوں کو محیط عرصے میں فرصت کے لمحات میسّر ہی نہ آئے۔ گہری لمبی پرسکون نیند کو ترس گیا تھا۔ کام ہی کام اور جاں گسل ذہنی مشقت سے بدن ٹوٹ جایا کرتا تھا۔ اب فرصت ہی فرصت ہے لیکن نیند نہیں آتی۔ کرنے کو کام نہیں۔ بے کار پڑے رہنے سے بدن شل ہوا رہتا ہے۔

سوچتا ہوں، اپنی اصل عمر میں نے گزار لی۔ فضول جیئے جانے سے لاحاصل مشقت اٹھا رہا ہوں۔ جسم سے کچھ ایسے سگنل ملنے لگے ہیں کہ مفلوج ہونے کو ہے۔ کچھ عرصے سے اللہ کے حضور آسان موت مرنے کی بڑی دعائیں مانگی ہیں۔ میرا وہم رفتہ رفتہ یقین میں بدلنے لگا ہے کہ ماضی کی طرح میری یہ اہم دعا بھی قبول نہیں ہوگی اور بالآخر مجھے سسک سسک کر بے چارگی کی موت مرنا ہوگا۔ آج تک لمحہ بہ لمحہ مقدر کا لکھا بھگت لیا۔ لیکن بے بسی کے عالم میں لمحہ لمحہ موت کے انتظار کی اذیت کو محسوس کرتے ہوئے میری ہمتیں پسپا ہونے لگی ہیں۔ تنہائی میں مجھے اپنی روح کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ یہ رُوح کُل سے جا ملنے کو بے قرار ہے۔ میں اپنے ارادے سے جسم کی فصیل توڑ کر اسے اَزلی سفر پر روانہ کرنے لگا ہوں۔

کفن کا سامان پڑا ہے اور کچھ رقم بھی۔ خیر النساء نے میری بہت خدمت کی۔ بانوے ہزار تین سو ستر روپے کا چیک اُس کے نام لکھ کے لفافے میں ڈال رکھا

ہے۔ میرے اہل و عیال کو طویل سفر کی مشقت میں نہ ڈالا جائے۔ وہی چہرہ ہے جو وہ مدتوں دیکھتے رہے۔ خدا حافظ......"

o

لگے بندھے معمول کے مطابق خیرالنساء تقریباً دس بجے آئی اور اپنی چابی سے گیٹ کھول کے بند کیا۔ اخبار اٹھا کر گھر کے داخلی دروازے کی جانب قدم اٹھانے لگی۔ بائیں ہاتھ میں لیے اخبار پر چھپی تصویر کو دیکھتی جا رہی تھی۔ تالے میں چابی گھمائی اور دروازہ دھکیل کر اندر چلی گئی۔ بآوازِ بلند "السلام علیکم صاحب جی" کے الفاظ ادا کیے۔ چند لمحے خاموش رہی اور پھر حواس باختہ ہوئی باہر کو دوڑتی چلی گئی۔ سڑک پر پہنچتے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر مدد کو پکارنے لگی۔ اڑوس پڑوس سے لوگ نکلتے چلے آئے۔

پروفیسر صادق، ایڈووکیٹ لیاقت، ڈاکٹر شفیق، ان کی بیوی ڈاکٹر فرزانہ اور کرنل رفیق اندر چلے گئے۔ باقی لوگوں کو باہر پورچ میں ہی رکنے کا مشورہ دیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کمیونٹی کی سیکیورٹی وین اور ایمبولینس آ گئی۔

ڈاکٹر میاں بیوی نے موت کی تصدیق کر دی۔ پانچوں معزز ہمسائے خط کی عبارت پڑھ کر دل گرفتہ ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بوڑھے کرنل نے متوفی کے داہنے ہاتھ کے قریب پڑے پسٹل کو نالی کی طرف سے چٹکی میں پکڑ کر اٹھا لیا۔ نالی کو سونگھا۔ پڑوسیوں پر ایک نگاہ ڈال کر بولا: "اس سے کوئی فائر نہیں کیا گیا۔" ڈاکٹر شفیق نے کہا: "جسم پر گولی کا نشان تو درکنار کہیں خراش تک نہیں......" سارے ششدر ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے گئے۔ اتنے میں کرنل نے پسٹل کی میگزین دیکھ کر بتایا کہ گولیاں جوں کی توں بھری رہ گئیں......" ڈاکٹر فرزانہ آبدیدہ ہو گئی اور بولی: "آخری دعا دراصل قبول ہو چکی تھی......"

ooo

عبرت

چند روز پہلے کی بات ہے، صبح اُٹھتے ہی بیوی نے سال گرہ کی مبارک باد دیتے ہوئے یاد دلایا کہ وہ ساٹھ سال کا ہو چکا ہے۔ لیکن آج دفتری اوقات کار کے دوران ایسا واقعہ پیش آیا کہ نصف صدی پرانی بچپن کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ تصدق اُن دنوں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ والد صاحب کے دوستوں میں سے صرف حافظ جان محمد اس کو اچھے نہ لگتے تھے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ عمر میں بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے اور اس کے باپ سے مخاطب ہوتے ہوئے، تُو، تم اور برخوردار جیسے الفاظ بکثرت استعمال کرتے۔ مزید یہ کہ فجر پڑھ کر اپنے گھر جانے کی بجائے اکثر و بیشتر اس کے والد صاحب کا ہاتھ پکڑے ان کے ہاں آ جاتے۔ بہت اونچی آواز میں بولتے۔ آیتیں پڑھتے۔ ناشتا کرتے ہوئے بآوازِ بلند اللہ کا شکر ادا کرتے۔ سورۂ رحمان کے الفاظ دہرانے لگتے۔ علامہ اقبال اور دیگر شعرا کے اَن گنت اشعار از بر کر رکھے تھے۔ خصوصاً ایسے اشعار جن میں مسلم اُمہ کو جھنجھوڑا گیا ہے۔ ایک شعر زیادہ ہی پسندیدہ تھا:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تُو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر......

کچھ اس انداز سے بولتے، گویا اسٹیج پر کھڑے ہو کر قوم کے جوش و جذبے کو للکار رہے ہوں۔ تصدق سوچا کرتا کہ حافظ صاحب کو پہاڑوں کی چٹانیں اتنی ہی اچھی لگتی ہیں تو چندرہ مرلے کے اتنے اچھے کوٹھی نما گھر میں کیوں رہتے ہیں۔

ایک روز چھٹی کے بعد تصدق حسین دیگر لڑکوں کے ہمراہ گھر جا رہا تھا کہ سرِ راہ حافظ صاحب سے سامنا ہو گیا۔ اس نے حافظ صاحب کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا اور ساتھی لڑکوں سے باتیں کرنے لگ گیا۔ یوں ظاہر کیا، گویا اس نے اُنھیں دیکھا ہی نہیں۔ وہ جہاں دیدہ شخص، کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھے۔ سڑک کے کنارے پر چل رہے تھے۔ یک دم رُخ بدلا اور ترچھے زاویے سے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کو آن لیا۔ لڑکوں کی ٹولی میں سے اس کو بازو سے پکڑ کر الگ کیا، گال پر ہلکا سا تھپڑ لگایا اور گرج کر بولے: نامعقول! سلام کیوں نہیں کیا؟...... اسکول میں عرصہ تک اس کا مذاق بنا رہا۔ لڑکے دور سے ہی ہانک پکار کر کہتے: نامعقول! سلام کیوں نہیں کیا؟

کمپنی کے مالک نے تصدق حسین کے ذمہ لگا رکھا تھا کہ فہرست میں درج مختلف اشیا کے حصول کی خاطر ملک کے بڑے درآمد کنندگان سے رابطہ کر کے کم سے کم نرخوں پر مال دینے والی پارٹی کا تعین کرے۔ اُس نے کراچی کے ایک بہت بڑے سیٹھ کا فون نمبر ملایا تو دوسری طرف سے پہلی گھنٹی پر ہی اٹھالیا گیا۔ ٹھک سے ''ہیلو'' کی ایسی آواز آئی گویا انگریزی کے اس لفظ کو H اور O کی جانب سے ہائیڈرالک پریس میں دبا کر بُری طرح پچکا دیا گیا ہو۔

تصدق، سیٹھ کو اس حوالے سے جانتا تھا کہ چند بہت اہم اور منفرد آئٹمز کی درآمد میں اُس نے ایک لحاظ سے اجارہ داری قائم کر رکھی ہے اور گاہکوں سے معاملات کرنے میں ملازموں پر اعتماد نہیں کرتا۔ اس نے پچکی ہوئی ''ہیلو'' کے جواب میں حسبِ عادت بڑے پرسکون لہجے میں ''السلام علیکم'' کہا۔ سیٹھ نے جھٹ جواب دیا: ''ہاں

بولو!!!'' اِس کو مایوسی ہوئی، تاہم اُسی تحمل سے بولا: ''سیٹھ صاحب! میں نے سلام کیا ہے، یعنی آپ پر سلامتی ہو......''

سیٹھ نے اُسی عجلت سے جواب دیا: ''ارے بابا! ہم کو مسلمان کرنے کا نہیں، ہم آل ریڈی مسلمان ہے، بھروسا رکھو۔ اب کام کا بات کرو۔ ٹیم نہیں ہے بابا! ٹیم کا قدر کرو......'' وہ time کو tame بول رہا تھا۔

ٹیم کی قدر کر کے تصدق فارغ ہوا اور سوچنے لگا کہ اُس نے گزری زندگی کے تقریباً بیس ہزار ایام میں اوسطاً دس سلام روزانہ کے حساب سے کم از کم دو لاکھ سلام لیے اور دیے ہوں گے۔ کوئی اجنبی ہو یا واقف کار، قرابت دار ہو یا کوئی دل کے بہت قریب ہستی، ہم کلام ہوتے ہوئے ''السلام علیکم'' سے زیادہ بامعنی اور مناسب ابتدائیہ اور کوئی نہ ہوا ہوگا۔

زمانۂ طالب علمی کے دوران نویں جماعت میں موسمِ گرما کی تعطیلات ہونے پر پھوپھی زاد بھائی نے ہفتہ دس کے لیے اپنے پاس بلا لیا، جو اُن دنوں میانوالی کے قریب محکمہ انہار کی کالونی میں مقیم تھا۔ تصدق کے وہاں پہنچنے کے تیسرے روز بھائی کو سرکاری دورے پر جانا پڑ گیا تو اس نے داؤدخیل سیمنٹ فیکٹری میں ملازم ایک رشتہ دار کے پاس جانے کا پروگرام بنا لیا۔

سرکاری رہائش گاہ کے ملازموں نے باتوں باتوں میں بتایا کہ ویسے تو داؤدخیل زیادہ دور نہیں لیکن راستہ اجاڑ ہے لہٰذا پیدل جانا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ خصوصاً خانساماں نے مقامی لوگوں کے بارے میں تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے پیدل جانے سے منع کر دیا۔ تصدق نے سوچا کہ بھائی کے واپس آنے تک وہ داؤدخیل والے رشتہ دار سے مل آئے۔ خانساماں کے مشورے کو نظرانداز کرتے ہوئے پیدل چل دیا۔ موسم کے مطابق ململ کا کرتہ اور سفید شلوار پہن رکھی تھی اور دھوپ سے بچنے کے لیے سر کو

بڑے سے رومال کے ساتھ ڈھانپ لیا تھا۔

راستہ واقعی ویران پایا۔ تیز دھوپ میں مٹی دھول کے علاوہ سرِ راہ کوئی درخت حتیٰ کہ گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ بھی نظر نہ آیا۔ دل میں ہلکا سا ہول سمایا لیکن وہ اپنی ہی دھن میں تیز قدموں سے چلتا گیا۔ کوئی اندازہ نہ ہوا کہ داؤدخیل کتنا دور رہ گیا ہے۔ اتنے میں سامنے سے ایک لمبا تڑنگا مرد، سفید شٹل کاک برقع اوڑھے عورت کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔ اس نے دیکھا کہ مرد کے چہرے پر سیاہ کالی داڑھی مونچھیں اور سر پر خاصی بڑی سفید پگڑی ہے۔ اُس کا حلیہ ہُو بہُو بلوچ سرداروں کا سا نظر آیا۔ عورت نے سر پر اُلٹائے ہوئے برقعے کا پلّو کھینچ کر چہرہ اور جسم پوری طرح چھپا لیا۔

مرد نے کسی قدر جارحانہ انداز میں تصدق کی طرف قدم اٹھائے اور دبنگ آواز میں ''السلام علیکم'' کا کلمہ بولتے ہوئے مصافحہ کرنے کو ہاتھ بڑھا دیا۔ اُس نے اُلٹے ہاتھ میں چار پانچ فٹ لمبی پتلی بید کی چھڑی لے رکھی تھی۔ تصدق نہ جانے اُس اجنبی کی اچانک لپک جھپٹ اور گونج دار آواز پر کیوں سہم گیا اور ہاتھ ملانے یا سلام کا جواب دینے کی بجائے جھکائی دیتے ہوئے اچانک وہاں سے نکل بھاگا۔ اُس کو اپنی پُشت پر دھاڑ سنائی دی: ''اوہ یہودی!! سلام کا جواب......'' جملہ ادھورا رہ گیا اور آناً فاناً پیچھے سے چھڑی ٹانگوں پر آن لگی۔ عورت کی فریاد سنائی دی: ''نہ کر بھیروا...... قُبِہدا مسُوم اے۔'' مرد نے اُسی بلند آہنگ میں ڈانٹ پلائی: ''چپ کر کُتّی عورت! کافر کو سبق سکھانے دے۔'' ساتھ ہی اُس نے تصدق کو ماں کی وہی گالی دی، جو اس علاقے سے مخصوص تھی اور آئندہ زندگی میں بھی مُلک کے کسی اور حصے میں کم ہی سُنی گئی۔

چھڑی ہوا میں اُڑتی ہوئی آئی تھی۔ چوٹ تو زیادہ نہ لگی، البتہ خوف طاری ہو گیا۔ تصدق اس ناگہانی افتاد پر سنبھل نہ سکا اور گر گیا۔ مرد نے آتے ہی جہادی جذبے سے گردن دبوچ لی، تاہم دست درازی نہ کی اور سیدھا کھڑا کر کے آنکھوں میں آنکھیں

ڈالتے ہوئے چھنچنا کر بولا: ''کافر ہو یا مسلمان؟؟؟''

اُس شخص کی تیز چمکیلی عقابی آنکھیں، نوکیلی ناک، کالی سیاہ داڑھی اور گل مچھے دیکھ کر اُسی لمحے تصدق کی آنکھوں کے سامنے علامہ اقبالؒ کا شاہین پھڑ پھڑاتا ہوا آ گیا۔ تصدق نے پہلی بار اس پرندے کو اتنے قریب سے دیکھا اور جانا کہ کتنا خونخوار اور خوفناک دکھائی دیتا ہے۔ وہ گھگیا کر بولا: ''مسلمان۔'' اُس نے کہا: ''پڑھ کلمہ۔'' وہ مولویوں کی اولاد ہونے کے ناتے لرزتی آواز میں فرفر کلمے سنانے لگ گیا۔ تیسرے کلمے پر ''شاہین'' بول پڑا: ''بس بس، اس سے آگے مجھے بھی نہیں آتے......'' اُس نے گردن چھوڑ دی تھی۔ لب و لہجے کو متوازن کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور بولا: ''اچھے بھلے مسلمان ہو کر یہودیوں والی حرکت کیوں کی؟''

تصدق ''تنگ تنگ دیدم دم نہ کشیدم'' کی عملی تصویر بنا رہا۔ ''شاہین'' نے کہا: ''بولتا کیوں نہیں؟'' وہ بدبدا کر رہ گیا۔ اُس کے سارے جسم پر عقابی نگاہ دوڑائی اور جیب میں ہاتھ ڈال کر دو دو روپے کے دو اور ایک روپے والا ایک نوٹ نکال لیا۔ عورت کی فریاد پھر سنائی دی: ''نہ کر بھیڑا! آو غج۔'' مرد نے پھر عورت کو ڈانٹ دیا: ''چپ کر، اس کو اتنی سزا دینا ضروری ہے تا کہ آئندہ ایسی کافروں والی حرکت نہ کرے۔''

جان چھوٹی سو لاکھوں پائے۔ پانچ روپے کی رقم کم نہ تھی۔ راولپنڈی تک کا کرایہ تھا لیکن وہ دل میں ملال لائے بغیر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ سامنے داؤد خیل میں قائم فیکٹریوں کی اونچی عمارتیں اور خصوصاً پانی کی ٹینکی نظر آنے پر جسم میں توانائی عود کر آئی اور تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اچانک پیچھے سے گونج دار آواز سنائی دی: ''ٹھہر اوئے! میں نے مذاق کیا ہے، اپنے پیسے لے جا......''

تصدق نے گردن گھما کر دیکھا۔ ''شاہین'' ہاتھ میں نوٹ پکڑے، شاہ پر پھڑ پھڑاتا، گویا ایک بار پھر سے جھپٹنے کو اس کی طرف تیزی سے بڑھتا دکھائی دیا۔ وہ

پچکار کر بولا: ''شاباش! اپنے پیسے پکڑ اور آئندہ یہ کافروں والی حرکت بالکل نہ کرنا......''
تصدق کو خدا جانے کیا وہم ہوا کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس واقعہ نے تصدق پر گہرے اثرات مرتب کیے اور دوبارہ ایک مرتبہ بھی ایسی غلطی نہ دہرائی جس پر ''شاہین'' نے عبرت دلائی تھی۔ بلکہ سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کی۔ آج سیٹھ کے نامناسب رویے پر دکھ ہوا کہ ایمان کی کمزوری غالب آ گئی، جس کے باعث خاموشی سے پسپائی اختیار کر لی۔ کاش! سیٹھ کا سامنا بھی بچپن میں ہی کسی شاہین سے ہو جاتا تو پورے اہتمام سے سلام لینا اور دینا اس شخص کی پختہ عادت بن چکی ہوتی۔

ooo

چور

رات کے پچھلے پہر گاؤں کی پُر سکون فضا "چور چور" کی پُر شور ہاہا کار سے گونج اُٹھی۔ اہلِ دیہہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے اور جو ہتھیار دستیاب تھا، ہاتھوں میں لیے گھروں سے نکل آئے۔شور، چوہدری کرم الٰہی کی حویلی سے بلند ہو رہا تھا۔باہر گلی میں جمگھٹا ہو گیا۔ہاتھوں میں ڈنڈے، سونٹے، برچھیں اور رائفلیں لیے دیہاتی جوان ممکنہ خطرے سے نپٹنے کے لیے چوکس کھڑے للکارنے لگے۔

تھوڑی ہی دیر میں بوڑھوں اور لڑکوں بالوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی ہجوم میں شامل ہونے لگ گئیں۔سبھی کے لبوں پر کم و بیش ایک سا ہی سوال مچلنے لگا کہ کون کم بخت اس وقت چوہدری کرم الٰہی کے احاطے میں گھسنے کی جرأت کر سکتا ہے۔لگ بھگ بیس کنال رقبے پر تعمیر کی گئی عمارت اب بھی مرحوم چوہدری کرم الٰہی کے نام سے مشہور ہے۔علاقے بھر کی معزز شخصیت، جس کو دربار سرکار میں کرسی ملتی تھی۔اب اِس حویلی میں موصوف کے تین بیٹے مع اہل و عیال رہائش پذیر ہیں۔درمیان میں سب سے بڑا چوہدری عبدالغفار، اُس کے دائیں پہلو والے مکان میں منجھلا، چوہدری عبدالجبار اور بائیں ہاتھ چوہدری عبدالستار۔

احاطے کے اگواڑے، تینوں گھرانوں کے اپنے اپنے مویشی خانے، اجنبی مہمانوں کے لیے کمرے اور بیٹھکیں بنی ہوئی ہیں۔ایک وسیع کمرے میں چوہدری غفار کے بیٹے خالد کی دکان قائم ہے، جس میں کریانہ کپڑا اور خیاری کا سامان بھرا پڑا ہے۔احاطے کے پچھلے حصے پر تینوں بھائیوں کے رہائشی مکان ہیں اور درمیان میں کھلا صحن۔باہر ہجوم میں اکثر لوگ حیرت کا اظہار کرنے لگے ہیں کہ چوہدریوں نے اندر ہی شور مچا رکھا ہے، دروازہ کیوں نہیں کھول رہے۔گھر میں اسلحہ رکھا ہے، کسی نے فائر نہیں کیا اور کتے بھی شور بلند ہونے پر بھونکنا شروع ہوئے تھے،لیکن اب وہ بھی خاموش ہو گئے ہیں۔البتہ اہلِ خانہ کے مابین بدستور واویلا ہو رہا ہے۔ہر کسی کو اپنی فکر پڑی ہے۔چوہدری غفار کی آواز سنائی دی: ''اوئے خالد، جاوید! دیکھو کہیں دکان میں نقب نہ لگی ہو۔'' منجھلا، چوہدری جبار خدشے کا اظہار کرتا ہے: ''میرے ڈنگر چوری کرنے آیا ہوگا، اُسی طرف بھاگا تھا، کوئی رسّہ گیر لگتا ہے۔ چھوٹا، چوہدری ستار بیوی سے مخاطب ہوا: ''اندر پسار میں ٹرنک پیٹیاں چیک کرو، کہیں صفائی نہ ہوئی پڑی ہو......''

چور ہے یا بھوت پریت، کہاں غائب ہوگیا۔ تینوں بیرونی گیٹ اندر سے بدستور بند ہیں۔دُکان یا گھروں کے اندر کہیں کوئی تالہ نہیں ٹوٹا ہوا۔مال مویشی پورے ہیں۔چور کہاں چلا گیا۔ پہلے کس نے دیکھا تھا؟ ''میں نے دیکھا تھا۔ہمارے صحن میں کھڑا ہوا......'' چوہدری جبار نے کہا۔

چھوٹا بھائی عبدالستار اور اس کی بیوی بچے بدستور بڑے بھائی کے صحن میں کھڑے سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔جبار اور اس کی بیوی کے ساتھ گزشتہ دو تین مہینوں سے بول چال بند تھی۔خواتین کی لڑائی میں مرد بھی کود پڑے تھے۔بڑے بھائی چوہدری غفار نے بہت سمجھایا لیکن بے زار ہو کر لاتعلق سا ہو گیا۔حالانکہ وہ علاقے کا داتا اور معتبر سرپنچ تھا مگر گھر کا قضیہ چکانے سے عاجز آ گیا۔اُس نے چھوٹے بھائی کے قریب آ کر

پوچھا: ''صفدر کہاں ہے؟'' وہ ایک لمحہ کو ٹھٹکا گیا اور اتنا ہی کہہ پایا: ''خدا معلوم کہاں گیا۔ اندر تو نہیں......'' بڑے بھائی نے تحمل سے دھیمی آواز میں کہا: ''جاؤ! باہر گلی میں لوگوں سے کہو، سب اپنے اپنے گھروں کو جائیں......''

چوہدری غفار نے اپنے بیٹوں خالد اور جاوید کو سرگوشی میں ہدایت کی کہ جبار کو قابو رکھیں۔ وہ خود اُس کے گھر میں گھستا چلا گیا اور سب سے پچھلے سٹور نما کمرے میں سے صفدر کو نکال کر باہر لے آیا۔ چوہدری جبار اور اس کی بیوی بشیراں دونوں غضب ناک ہو کر صفدر کی طرف لپکے لیکن انھیں باقی لوگوں نے بیچ میں حائل ہو کر روک لیا۔ چیخم دھاڑ بچ گئی کہ جس کمرے میں نقدی اور سونا پڑا ہے، یہ لڑکا اسی کمرے میں چوری کرنے کی نیت سے گیا ہوگا۔ ہم پرچہ درج کروائیں گے۔ اب اس گھرانے سے صلح ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......

بیٹھک میں پنچایت خانگی جُڑ گئی۔ تینوں گھرانوں کے لڑکوں لڑکیوں کو صفدر سے ہمدردی تھی۔ وہ اپنے رشتہ داروں میں ہی نہیں، گاؤں کے چھوٹے بڑے مرد عورتوں، سب میں مقبول تھا۔ ہنس مکھ ذہین اور بلا کا حاضر جواب نوجوان۔ اپنے بزرگوں کی آنکھوں کا تارا۔

چوہدری غفار نے بھتیجے کو دونوں کندھوں سے تھام رکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا: ''تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تیرے دماغ میں ایسی گھٹیا سوچ کیوں آئی؟''...... عبدالجبار نے اپنے بھتیجوں کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا: ''لالہ جی! چوروں سے اس طرح نرم سلوک نہیں کیا جاتا۔ بشیراں بی بی نے بھی چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ چوہدری غفار نے بھائی اور بھاوج کو بُری طرح ڈانٹتے ہوئے خاموش رہنے کو کہا اور صفدر سے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ وہ بلا خوف بول پڑا: ''تایا ابا! چور میں نہیں، یہ دونوں میاں بیوی میرے چور ہیں۔ میری سب سے قیمتی

دولت انھوں نے مجھ سے چھین کر اندر چھپا رکھی ہے۔میں برآمدگی کرنے گیا تھا۔لڑائی دیورانی جیٹھانی یا بھائیوں کی ہوگی۔میری اپنی بیوی سے نہیں۔ہمیں کیوں جدا کیا ہوا ہے۔میں سلمیٰ سے ملنے گیا تھا......"

جبار اور بشیراں کف بہانے لگے اور اُچھل اُچھل کر حملہ کرنے کو لپکتے۔لیکن دیگر خواتین اور مردوں نے اُنھیں بے بس کیے رکھا۔نوجوان لڑکے لڑکیاں ہنسی ضبط نہ کر سکے اور بڑے بھی اس طرفہ تماشا پر محظوظ ہونے لگے۔ایسی صورتِ حال پر جبار اور اس کی بیوی انگاروں پر لوٹنے لگے۔دونوں نے فیصلہ سنا دیا کہ وہ صبح ہوتے ہی وکیل کے ذریعے بیٹی کو خلع دلوانے کی غرض سے عدالت میں درخواست دے رہے ہیں۔ہم ایسے بدمعاش کو داماد قبول ہی نہیں کرتے، جو رات کو چوری چھپے گھر میں گھس آئے۔

بڑے تایا نے بھتیجے کے گال پر کچھ اس انداز سے تھپڑ مارا کہ کسی کو سمجھ نہ آئی، آیا پیار کیا ہے یا سزا دی ہے۔کہنے لگا: "اوئے کھوتے! یہ کیا بیہودہ طریقہ ہے بیوی سے ملنے کا؟"

ٹیوب کی روشنی صفدر کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔تایا کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے گردن کو دائیں جانب ہلکا سا خم دیا اور بول پڑا: "تایا ابا! آپ تو ایسی بات نہ کریں۔علاقے کے سردار ہیں...... لوگوں کے فیصلے کرنے والے۔آج اپنے گھر میں بھی انصاف کریں۔پچیس چھبیس سال پہلے تائی اماں کے والدین نے آپ سے لڑ کر انھیں اسی طرح گھر میں روک لیا تھا۔میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔آپ کا پیغام تائی اماں کو دیا کرتا اور رات کو......"

"چپ کر بدمعاش......" چوہدری نے بھتیجے کی بات مکمل نہ ہونے دی اور پہلے جیسا ہی ہلکا پھلکا ہاتھ جھاڑتے ہوئے ہنس پڑا۔لڑکیاں اور عورتیں کھی کھی کرتی منہ چھپانے لگیں اور مرد کھل کے ہنسے۔بشیراں بی بی یوں رونے لگی، گویا بین کر رہی ہو۔

جبار سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ چوہدری نے بیوی سے کہا: ''سلمیٰ پچھلے کمرے میں ہے۔اُس کو ادھر لے آؤ۔''

گردن جھکائے سلمیٰ حاضر ہو گئی۔تایا نے پوچھا: ''یوں چھپ چھپا کے کب سے مل رہے ہو میاں بیوی؟'' وہ اسی طرح سر جھوڑائے منمنائی: ''جب سے دونوں گھروں میں لڑائی ہوئی ہے......''

چوہدری نے چھوٹی بھاوج کو اشارے سے قریب بلالیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا: ''چل ہاتھ پکڑ اپنی بہو کا اور گھر لے جا...... بڑے آپس میں لڑو مرو، جو جی میں آئے کرو۔ میری بلا سے۔ جو پیار محبت سے رہنا چاہتے ہیں، اُن میں کسی کو جدائی نہیں ڈالنے دوں گا۔جن کے دل حُب اور اتفاق کی نعمت سے خالی ہیں، اُن کے لیے یہی سزا کافی ہے۔''

ooo

اَلحَمدُ لِلّٰہ

میں نے حج اور عمرے کیے۔ وضع قطع بھی ماشاءاللہ پکے مومنوں والی ہے۔
لیکن کبھی کبھی نہ جانے سچ بولنے کو دل کیوں چاہتا ہے۔ دراصل جب سے میں بہت زیادہ دولت مند ہوا ہوں، رُوح سچ بولنے کو پکارتی ہے اور مجھے رُوح کی پکار پر عمل کرتے ہوئے اب خوف بھی محسوس نہیں ہوتا۔ امیر ہو جانے سے بندے کی بنیاد مضبوط ہو جاتی ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ دولت کیسے اکٹھی کی۔ لوگ جھک جھک کے سلام کرتے ہیں۔ ہائی پروفائل شخصیت پر عموماً انگلی نہیں اٹھتی۔ بچپن میں غربت کی وجہ سے مڈل سے آگے نہ پڑھ سکا۔ لیکن چالیس سال سے انگلینڈ میں رہتے ہوئے سب کچھ سیکھ گیا ہوں۔ ہائی پروفائل کا مطلب ہی نہیں سمجھتا، فرفر انگریزی بھی بولتا ہوں۔

عجیب قسمت پائی ہے۔ دنیا کی ہر خوشی ملنے کے باوجود والدین اور اولاد کی خوشنودی حاصل نہ ہو سکی۔ شاید دنیا کا واحد شخص ہوں، جس سے والدین اور جوان اولاد بیک وقت ناخوش رہی۔ ابا جی نے اپنی زندگی میں میرے خرچے پر حج کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے! شراب اور سُود کی کمائی حرام ہے۔ اس پر حج نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھ سے خرچہ بھی نہیں لیتے تھے۔ میں نے اکثر کہا: ابا جی! شراب بیچنے کا کاروبار چندرہ

بیس سال پہلے میں نے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بولے: باقی کے تمہارے سارے کاروبار بھی حرام ہیں، اس لیے کہ بینک سے سُود پر سرمایہ لے کر قائم کیے تھے۔

سچی بات ہے میں دل کا بُرا نہیں۔ صرف دولت کمانا میرا جنون ہے اور آج کے دور میں دولت سمیٹنے کے یہی رائج طریقے ہیں جو غیر قانونی نہیں۔ لیکن ابا جی مرحوم کہا کرتے: حرام کمائی میں برکت نہیں ہوتی۔ اللہ کے فرمان کے مطابق، سُود کے سرمائے سے کاروبار کرنا جائز نہیں۔ برکت والی ابا جی کی بات میری سمجھ میں کبھی نہ آ سکی۔ اس لیے کہ میرے کاروبار میں بے پناہ ترقی ہوئی اور دولت کے انبار لگ گئے۔

اولاد میں اللہ پاک نے صرف دو بیٹے ہی عطا کیے۔ بڑے فرماں بردار اور نیک۔ والدین اللہ کو پیارے ہو گئے اور بیٹے جوانی میں قدم رکھتے ہی اتنے بدلے کہ میں لرز کر رہ گیا۔ ایسے دور میں دونوں نے داڑھیاں رکھ لیں، جب پوری دنیا میں ہر داڑھی والے کو دہشت گرد سمجھا جانے لگا۔ نمازی شروع سے ہی تھے۔ میں نے بڑے پیار سے سمجھایا کہ میری بات اور ہے۔ اس ملک کا بہت پرانا اور بوڑھا شہری ہوں۔ میری شناخت مضبوط ہے اور مشکوک قطعاً نہیں۔ تم نوجوان ہو۔ دہشت گردوں والا حلیہ بنانا، آ بیل مجھے مار والی بات ہے۔ یونیورسٹیوں کے مسلمان طلبا پر خفیہ اداروں کی کڑی نظر ہے۔ خدا کے لیے یہ داڑھیاں منڈواؤ اور نارمل شریف شہریوں کی طرح رہو......

دونوں بڑے ادب سے بیٹھے میری گفتگو سنتے رہے۔ بڑے نے کہا: ''ابا جی! مولانا مودودیؒ سے کسی دردمند شہری نے بڑے دُکھ سے کہا کہ داڑھیوں والے چوریاں کرنے لگ گئے ہیں۔ داڑھی بدنام ہو رہی ہے۔ مولانا صاحب نے فرمایا: برخوردار! داڑھی والے چور نہیں، چوروں نے داڑھیاں رکھ لی ہیں...... اب بھی ایسا ہی ہوا ہے کہ دہشت گردوں نے داڑھیاں رکھ لی ہیں۔ اس جعل سازی سے خوف کھا کر ہم اپنا حلیہ کیوں بدلیں۔ آپ جمع خاطر رکھیں۔ بظاہر دین اسلام پر کڑا وقت آیا ہوا ہے۔ یہی

امتحان ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے نوجوان نسل میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ لڑکیاں لڑکے دین کی طرف بڑی شدت سے راغب ہو رہے ہیں...... انشاءاللہ ابتلا کا یہ دور گزر جائے گا اور ہم سرخرو ہوں گے......

شروع میں قدم مضبوطی سے جمانے کی خاطر رات دن محنت کی اور وقت ہی نہ ملا کہ گھر بساؤں۔ دیر سے شادی کرنے کے نتیجے میں اولاد بھی دیر سے نصیب ہوئی۔ جب وہ جوان ہو کر پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو گئے تو بظاہر بڑی عزت اور احترام سے پیش آتے لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے مرحوم دادا کے نقشِ قدم پر چلنے لگے ہیں۔ یعنی میری کمائی سے غرض نہیں رکھتے۔ میری شدید خواہش تھی کہ بیٹوں کی شادی ہو اور میں جلد سے جلد پوتے پوتیاں کھلاؤں۔ اُن سے اپنی دیرینہ آرزو کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگے: آپ کا حکم بجا۔ یہ دینی فریضہ بھی ہے۔ اگر کوئی مناسب رشتہ نظر میں ہو، ضرور بتائیں۔ ہماری ایک ہی شرط ہے کہ لڑکیاں صوم وصلوٰۃ کی پابند ہونے کے علاوہ شرعی احکام کے مطابق حجاب بھی کرتی ہوں۔ مومنہ کو جاب کرنے کی ممانعت نہیں، بشرطیکہ اس سے شرعی حدود کی پابندی کرنا ممکن نہ رہے۔

دونوں بیٹوں نے اکاؤنٹس میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے کسی بین الاقوامی ادارے میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ بڑا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھا۔ مجھے شروع سے اسی ڈگری کا علم تھا۔ چھوٹے کی کوالیفیکیشن مشکل سی تھی، جو میں سمجھ نہ پایا۔ اتنا پتا چل گیا کہ اُس ادارے میں تقریباً ساری قوموں کے افراد ملازمت کرتے ہیں۔ میرے اور بیگم کے حلقۂ احباب میں شامل ہر فیملی کی لڑکیاں ماڈرن تھیں۔ جدید دور کے عین مطابق۔ سچی بات ہے، ہم میاں بیوی کی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ ایسی ہی بہوویں آئیں۔ چونکہ ماحول کچھ ایسا بن گیا تھا۔ اکثر دیکھنے میں آتا کہ قیمتی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر یورپی عورت کے رُوپ میں بہو بیٹی انگلش کا مقبول گیت سن رہی ہے اور ساتھ آگے

پیچھے بوڑھے بزرگ مرد و خواتین اس خلیے میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ ہاتھوں میں تسبیح، سروں پر نماز والی ٹوپی یا چادریں۔ لبوں سے آیاتِ قرآنی کا ورد جاری۔ ڈرائیونگ کرتی ہوئی بہو بیٹی نے گاگلز لگا رکھے ہیں۔ جینز چڑھائی ہوئی ہے۔ انگلش میوزک کی لے پر جھومتی، گنگناتی، کلکاریاں مارتی، ترنگ میں گاڑی اُڑائے چلی جارہی ہے۔

ہم میاں بیوی بھاگ کر ہف گئے۔ بیٹوں نے جو کڑا معیار بتایا تھا، اس پر سو فیصد پوری اترتی لڑکی کہیں نظر نہ آئی۔ جہاں کہیں ساٹھ ستر فی صد بھی گزارہ ہوتا محسوس کیا، ہم نے خوب پچکارا اور بہلا پُھسلا کر عندیہ بیان کر دیا۔ لیکن موبائل میں ہمارے بیٹوں کی تصویر دیکھ کر بیشتر نے ہونٹ سکوڑے اور سیٹی بجا کر ہمیں جھنڈی دکھا دی۔ ہم پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ بیوی نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا: زمانہ ہمیں پوتی پوتے سے محروم رکھنے پر تُلا بیٹھا ہے۔ میں نے تُرت جواب دیا: ''مائی ڈیئر! زمانہ نہیں، ہمارے بیٹوں نے ہمیں پوتی پوتے سے محروم رکھنے کا عزم کر رکھا ہے۔''

ایک دن بیٹوں نے ہمارے سامنے کارڈ رکھا اور کہا: ''اس پتا پر جائیں۔ گوہرِ مقصود مل گیا ہے۔ دونوں سگی بہنیں ہیں، ہماری کولیگ۔ لیکن ہم پچھلے چھ سات مہینوں سے واچ کر رہے تھے۔ اللہ کے فضل سے سو فی صد پختہ کار باعمل مسلمان ہیں۔''

ہم میاں بیوی خوشی سے اُچھل پڑے۔ میں نے کارڈ پڑھا: ''چوہدری باغ علی''...... ایک بار تو جھٹکا سا لگا اور کارڈ ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ دل کو طفل تسلی دی اور کہا: اسی نام کا کوئی اور بندہ بھی ہو سکتا ہے۔ دل کڑا کر کے اَتا پتا دیکھا۔ بدن ٹھنڈا ہو گیا۔ ہو بہو پتا بھی وہی، جو ہمارے آبائی گاؤں کے چوہدری باغ علی کا ہے...... واہ ری قسمت۔ ہمارے بیٹے اور وہ دونوں بہنیں اس ملک کی پیدائش ہیں۔ اپنے دیس کے ریت رواج نہیں جانتے۔ میں ہنسنے لگ گیا۔ ماں بیٹے حیرانی سے مجھے دیکھنے لگے۔ میرے خیال میں کوئی ایسا ہم وطن نہ ہوگا، جس نے وہ مشہور لطیفہ نہ سنا ہو۔ سوچا کہ بیٹے

چونکہ بڑی اونچی یونیورسٹیوں میں پڑھے ہیں اور اِن کی پیدائش پرورش جس مُلک میں ہوئی، وہ دنیا ہی اور ہے، لہٰذا دونوں یقیناً اس لطیفے سے اب تک محروم رہے ہوں گے، جو ہمارے آبائی وطن کے سماج کی اصل عکاسی کرتا ہے۔

کارڈ میز پر رکھ کر میں بیٹوں سے مخاطب ہوا: ''ہمارے علاقے کے کسی گاؤں کا قصہ ہے۔ ایک ادنیٰ ذات کے غریب شخص کا بیٹا دبئی سے ڈھیروں دولت کما کر واپس وطن گیا۔ گاؤں میں بہت عالیشان گھر بنایا اور کار خرید لی۔ باپ سے کہا کہ اب ہم گاؤں کے چوہدری سے بھی زیادہ مال دار ہو گئے ہیں، لہٰذا تم میرے لیے اُس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے جاؤ۔ سادہ لوح باپ فوراً چوہدری کے پاس حاضر ہو گیا اور مدعا بیان کر دیا۔ چوہدری نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پاؤں سے جُوتا اتار کر سوال کرنے والے کے سر پر اوپر تلے وار کر دیے اور دوبارہ چار پائی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک سوالی خاموش بیٹھا رہا اور پھر بول پڑا: چوہدری جی! کیا میں آپ کی طرف سے انکار ہی سمجھوں؟''

بیوی کھسیانی ہو کر مسکرا دی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ بیٹے سنجیدہ رہے۔ چھوٹے نے سعادت مندی سے کہا: ''ابّا جی! آپ جائیں۔ دونوں بہنیں آپ کو جانتی ہیں۔ اُنھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارا اور اُن کا آبائی گاؤں ایک ہی ہے۔ لیکن وہ اسلام کی صحیح رُوح کو سمجھتی ہیں۔ ہمارے دین میں ذات پات کے حوالے سے کوئی بڑا چھوٹا نہیں۔ فضیلت صرف تقویٰ کو حاصل ہے......''

بڑا بیٹا بول پڑا: ''یہ لطیفہ ہم نے سنا ہوا ہے۔ یونیورسٹی میں خاصا مقبول تھا۔ دونوں بہنوں نے بھی سن رکھا ہے۔ اُنھیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ دبئی والے لڑکے کی ذات، بلکہ 'سوکالڈ ذات' کہنا زیادہ درست ہوگا...... وہی ہے، جو ہماری بتائی جاتی ہے۔ مگر اسلام کی اصل تعلیمات کے مطابق اس جہالت کا کوئی concept ہی نہیں۔ ہم کفو و ہم پلہ رشتے کے تصور کو تقویٰ پر ترجیح دینے کی شریعت میں گنجائش نہیں...... آپ

ہمارے والدین ہیں۔ انسانی رشتوں میں سب سے اہم اور قابلِ احترام رشتہ۔ اس لیے ہماری خواہش ہے کہ آپ دونوں کی وساطت سے یہ فریضہ ادا ہو۔ حوصلہ رکھیں اور جائیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا، جو آپ سوچ رہے ہیں۔"

بیٹوں کے رخصت ہونے پر میں نے بیوی سے کہا: "کرماں والی! تم گھر پر ہی رہو۔ تم نے بائی پاس کروایا ہوا ہے۔ یہ نہ ہو کہ رشتہ لینے کی بجائے تمہاری ڈیڈ باڈی اٹھانی پڑ جائے۔ بہویں دیکھنے کے شوق میں خود رنڈوا ہو جاؤں۔ تمہارے بھائی کو ساتھ لے جاؤں گا۔ جانا بھی ضروری ہے۔ اولاد کی خاطر والدین جان پر کھیل جاتے ہیں۔ اس ایڈونچر میں زیادہ سے زیادہ وہی سلوک ہوگا، جو لطیفے میں ہوا تھا۔ ہمارے جانے کے بعد تم بڑی عاجزی سے اللہ کے حضور مسلسل دعا کرتی رہنا کہ چوہدری نے نرم اور ہلکے پھلکے جوتے پہن رکھے ہوں۔ اللہ مالک ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ والدین کی طرح اولاد بھی مجھ سے لاتعلق ہی رہے۔ ممکن ہے اتنی سی قربانی دینے پر بیٹوں کا دل پسیج جائے اور صرف عزت احترام سے ہی پیش نہ آئیں بلکہ دل میں بھی جگہ دیں۔"

چوہدری باغ علی کا فون ملایا۔ اپنا تعارف کرایا اور ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ توقع سے زیادہ پُرجوش لہجے میں بول پڑا: "بسم اللہ بسم اللہ، آؤ حاجی صاحب! ضرور آؤ۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ جب جی چاہے آؤ۔ بلکہ آج اور اسی وقت آجاؤ۔ میں گھر پر ہی ہوں۔"

بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال ہوا۔ خاطر تواضع بھی روایتی طریقے سے خوب ہوئی۔ میں اور میرا سالا صاحب اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکتے رہے لیکن اصل موضوع کی طرف آنے کا حوصلہ یکجا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ چوہدری باغ علی اور اُس کی بیوی، دونوں بے چین ہو رہے ہیں۔ آخر خاتون نے بڑے سلیقے سے بات شروع کی: "آپ نے بھابھی کو ضرور لانا تھا، چلو خیر ہے۔ اللہ کرے اُن کی طبیعت جلد

ٹھیک ہو۔ انشاءاللہ ملتے ہی رہیں گے۔ اب اصل مقصد کی طرف آتے ہیں......"

میرے بارے میں ہر کوئی کہتا کہ حاجی بڑا تیز اور شاطر بندہ ہے۔ مجھے بھی کسی محفل میں بات کرتے ہوئے جھجک محسوس نہ ہوئی تھی۔ بلکہ بات کرنے کے فن نے ہی مجھے ترقی کی راہ پر ڈالا۔ یہاں مسئلہ اور تھا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ چوہدری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا۔ یوں لگا، جیسے وہ نظروں ہی نظروں میں کہہ رہا ہو، اب بولو بھی۔ اُس کی بیوی نے آدھی مشکل آسان کر دی تھی۔ تب بھی اتنا ہی کہہ پایا: "چوہدری جی! کیا کہوں۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی......"

چوہدری ہنس پڑا اور اٹھ کر میرے بائیں پہلو کے ساتھ لگ کے بیٹھ گیا۔ دایاں بازو میرے کندھے پر رکھ کر بولا: "حاجی جی! میں نے اور آپ نے جیسی تیسی زندگی گزاری، سمجھو گزر گئی۔ ہم دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی پردہ نہیں۔ اللہ جانے ہماری کون سی نیکی اُس ذات کو پسند آ گئی۔ ہم میاں بیوی کی اُس دن سے نیند ہی اُڑ گئی تھی جب چوہدری رفاقت کی بیٹی ایک جیدی کے ساتھ چلی گئی اور باپ کی ذرا سی ڈانٹ ڈپٹ پر بے چارے کو گرفتار کرا دیا۔ توبہ استغفار۔ ہماری بیٹیوں نے الحمدللہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، خوب سوچ سمجھ کر عین شریعت کے مطابق۔ یہ اُن کی مہربانی ہے۔ میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ میرا حشر اُن لوگوں جیسا نہیں ہوا، اپنے ہم وطنوں کی بات کر رہا ہوں، جن کی بیٹیوں نے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی میں تمیز ہی نہیں کی......اور وہ بھی جو ویسے ہی کالوں کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ اللہ کرے یہ رشتہ مبارک ثابت ہو۔ ہم سب کے لیے......" چوہدری نے میز سے مٹھائی والی پلیٹ اُٹھائی اور ہم دونوں کے سامنے کر کے بولا۔ "منہ میٹھا کرو۔ بسم اللہ۔"

ooo

کڑاہی گوشت

بیس پچیس برس کے عرصے میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔ خان مشتاق، کوٹھی کے ٹیرس پر شیڈ کے نیچے بیٹھا بظاہر ہلکی بارش سے بھیگے خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہو رہا ہے لیکن ماضی میں جھانکتے ہوئے اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے بھی گزر رہا ہے۔ بیوی کے آ جانے پر خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ پیچھے آن کھڑی ہوئی۔ دونوں ہتھیلیاں اس کے گالوں پر جما کر بولی: ''میں نے نفیس ہوٹل والوں کو فون کر دیا ہے۔ آج کے موسم نے بڑی پرانی یاد دلا دی۔ اسی طرح رم جھم لگی ہوئی تھی۔''

اُس نے خاوند کی مونچھوں کے سرے انگلیوں کی پوروں میں لے کر مروڑنے شروع کر دیے۔ خان نے بیوی کی کلائیاں پکڑ کر کھینچ لیں۔ وہ جھکی اور شوہر کے گال سے گال ملا دیا۔ بارش میں تیزی آ گئی اور وہ بازو چھڑا کر پلک جھپکنے میں ساتھ زانو دبا کے بیٹھ گئی۔ خان نے کہا: ''تم بھی وہی بارش کا دن یاد کر رہی ہو۔ کتنے سال گزر گئے۔ وہ دن نہیں بھولتا۔ پل پل یاد آ جاتا ہے۔ میں بھی اس وقت وہی سب کچھ یاد کر رہا تھا...... کتنے سال ہوئے ہیں نجو!...... چوبیس یا شاید پورے پچیس؟...... یہی تجربر کے آخری دن تھے۔ جاتے جاتے بارشوں کا موسم پلٹ آیا تھا......''

ساجدہ نے ٹوک دیا: ''موسم نہیں، ہمارا مقدر پلٹ آیا تھا۔ ورنہ سوچو...... خدانخواستہ اگر اُس روز...... اللہ کی قسم میں نے پکاپکا فیصلہ کر لیا تھا۔ چاروں بیٹیوں سمیت شام کے بعد اندھیرا ہوتے ہی ڈیم میں چھلانگ لگا دینی تھی۔ پچھلی رات سے فاقہ تھا۔ لڑکیاں رو رہی تھیں۔ سلیمہ کو تیرے پاس بھیجا اور وہ روتی ہوئی واپس آ گئی۔ بتایا کہ ابا نہیں مانتا۔ وہ ناراض ہے۔ کہتا ہے گھر نہیں آؤں گا۔ میں نے لڑکیوں کو اندر بٹھایا اور بہانہ بنا کر نکل آئی۔ ڈیم کے کنارے کھڑے ہو کے دیکھا۔ جھیل کنارے تک بھری ہوئی تھی۔ پہلے سوچا کہ اکیلی مروں۔ تینوں چھوٹی تیرا خون ہیں۔ ضرور خیال کرو گے، لیکن بڑی سے تیرا کوئی رشتہ نہیں بنتا۔ مگر میں نے اُس کو بھی اُسی طرح جنا ہے، جیسے چھوٹیوں کو۔ میری چاروں سگی ہیں۔ کیا ہوا اگر ان سب کا باپ ایک نہیں۔ پہلے والے حرامی خصم سے ماتھا پیٹ پیٹ کر جان چھڑائی تو دوسرا سگے بھائی نے ڈھونڈ نکالا۔ عجب نمونہ۔ منہ نہ متھا جن پہاڑوں لتھا (اُترا)......''

مشتاق خان نے بیوی کو بازوؤں میں بھر کے دو تین زوردار جھٹکے دیے اور بولا: ''ذرا ذرا!!!'' بھونکنے سے باز نہ آئی۔ بوڑھی ہو گئی۔ جن اور پری آخری عمر میں ایک ہی جیسے ہو جاتے ہیں۔ ماسٹر صاحب اپنے دوستوں کی محفل میں میاں محمد بخش کے شعر اکثر سنایا کرتے تھے: ''سدا نہ باغیں بلبل بولے سدا نہ باغ بہاراں، سدا نہ ماپے حسن جوانی سدا نہ صحبت یاراں''۔ ہم دونوں کے ماں باپ پہلے ہی دنیا سے چلے گئے۔ مجھ پر کبھی حسن جوانی آئی نہ تھی۔ شکر ہے مولا کا، تیرا رولا بھی ختم ہوا۔ اُونچی ذات کی گجری اور سوہنی سنکھی مگر بدتمیز اکھڑ اور مغرور...... میں نے کسی سے دھوکا نہیں کیا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے، میری ذات، میرا پیشہ اور یہ کہ رنڈوا ہوں۔ ایک بیٹے کا باپ۔ تجھے میرے بن ماں کے بیٹے پر کبھی رحم نہ آیا۔ اُس کو گھر میں برداشت ہی نہ کرتی تھی۔ تیری بخشی ہو گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے چیک کر کے صاف کہہ دیا کہ اب تم بچہ پیدا نہیں

کر سکتی۔ کتنا سمجھایا کہ حبیب، بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ ہمارے بعد اِن کا خیال رکھنے والا اس کے سوا اور کوئی نہ ہوگا۔ میں اسی لیے دوسری شادی کرنے پر راضی نہیں ہوتا تھا کہ آنے والی کہیں حبیب سے بُرا سلوک نہ کرے۔''

ساجدہ نے لاگ لاگوٹ کرتے ہوئے ٹوک دیا: ''چل چھوڑ ناں! ماسٹر اعجاز صاحب کی باتیں کرو۔ ہمارے لیے فرشتہ ثابت ہوا...... اللہ کرے، سارے لوگ ہی اُس جیسے ہو جائیں۔ میرے اور تیرے رشتہ داروں نے صرف تماشا دیکھا۔ سسرالی برادری ہماری لڑائی دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ میرا ننھیال ددھیال ایک ہو گیا تھا اور ہمارا نکاح ہونے سے پہلے ہی بائیکاٹ کر دیا کہ چھوٹی ذات والے کو لڑکی دے کر برادری کی ناک کٹوا دی۔ میرے بھائی نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ مجھے سمجھایا: مشتاق میرے ساتھ ساتویں جماعت تک پڑھا ہوا ہے۔ میں اُس کی خوبیاں جانتا ہوں۔ ایسا بندہ کبھی بھوکا نہیں مرتا۔ سانپ کے منہ سے روزی کما کر لا سکتا ہے۔ اُس کے باپ اور دادا نے نائیوں والا پیشہ ضرور کیا تھا۔ یہ پیشہ ہے، ذات نہیں۔ کسی پیشے میں کوئی برائی نہیں ہوتی۔ انگریز قوم اسی لیے کامیاب ہے کہ کسی پیشے کو گھٹیا نہیں سمجھتی۔ مجھے خود انگلینڈ میں نائی کی دکان پر نوکری ملی اور اب اچھا بھلا کاریگر ہوں۔ رشتے داروں کی باتیں مت سنو۔ ہمارے ماں باپ مر چکے ہیں۔ تم اُس کے بیٹے کا خیال رکھنا، وہ تمہاری بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھے گا......''

اچانک جھال سا آیا اور ہوا کے ہلکے جھونکے سے دونوں پُھوار میں بھیگنے لگے۔ خنکی محسوس ہونے پر دونوں باہم مزید چپک گئے۔ مشتاق بول پڑا: ''پھر تم نے بھائی کی نصیحت پر عمل کیوں نہ کیا۔ میرے اپنے سارے رشتہ دار اس لیے ناراض تھے کہ خاندان میں کنوارے رشتے ٹھکرا دیے تھے۔ تیرے بھائی سے میری بچپن کی دوستی تھی۔ میں نے سکول چھوڑ کر کام سیکھنا شروع کر دیا۔ عثمان...... تیرا بھائی میٹرک کر کے انگلینڈ

چلا گیا۔ جب تیری طلاق ہو گئی تو واپس آیا۔ مجھ سے بات کی، میں سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے کہا! ساجدہ، زبان کی سخت ہے، دل کی بُری نہیں۔ تم دوست ہو۔ میں جوان بہن کو اکیلے چھوڑ کر انگلینڈ میں چین سے نہیں رہ سکوں گا......"

ساجدہ نے کہنی سے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا: "چل چھوڑ اس کہانی کو، سو بار، ہزار بار سنا چکے ہو۔ ماسٹر صاحب کی بات کرو۔ وہ کہاں ہوتے ہیں۔ اُن کا پتا لگاؤ۔ اللہ کرے زندہ ہوں اور تندرست خوش باش۔ اُن کو ہم اپنے ہاں مہمان بلائیں۔ ہمیں دیکھ کر اُنھیں خوشی ہو گی کہ مٹی سے اُکھڑا ہوا جو پودا اُنھوں نے اپنے ہاتھوں سے دوبارہ لگایا اور پانی دیا، وہ پھل پھول کے درخت بن چکا ہے......"

مشتاق نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "شہر بھر کے وہ تمام لوگ جو ہر روز اُن کے پاس محفل لگایا کرتے تھے...... شاعر، پروفیسر، استاد اور وکیل۔ سب سے پوچھا ہے...... نوکری چھوڑ کر لاہور چلے گئے تھے، اپنے بال بچوں میں۔ کہتے ہیں کسی سے نہیں ملتے۔ گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ جائیداد کی آمدنی پر گزارہ ہے۔"

ذرا توقف کر کے مشتاق مسکرایا اور دوبارہ بولنے لگا: "اُنھیں گھر میں مہمان رکھنے کا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ اس بڑھاپے میں خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ مجھے تیری ایسی بُری لت لگی ہے کہ اب وچھوڑا (جدائی) برداشت نہ ہو گا۔ جس طرح تجھے وہ بار بار یاد آتے ہیں، میرا دل کہتا ہے، وہ بھی تمھیں دل ہی دل میں پسند کرتے تھے...... جس دن اُنھوں نے اُکھڑا ہوا پودا اپنے ہاتھوں سے لگایا اور پانی دیا، تیرے حُسن کی تعریف کر کے میرے دل میں سوئی تیری محبت جگائی۔ اُن کی میٹھی میٹھی باتوں میں جادو تھا۔ مجھ پر فوراً اثر ہو گیا۔ وہ جہاں بھی ہیں، خوش رہیں۔ اُنھیں مہمان بلا کے میں کہیں اکیلا رہ جاؤں اور ساری زندگی بیٹھا پچھتاؤں......"

"دُر فٹے منہ! کالی شکل!! آخری عمر میں بھی بیوی پر اعتبار نہیں جما۔ اسی لیے

میں کہتی ہوں، خاوند پورے لعنتی ہوتے ہیں...... ماسٹر صاحب کو دیکھ کر مجھے خیال آتا تھا کہ میرا باپ بھی شاید ایسا ہوتا ہوگا۔ میں نے ابا دیکھا نہیں...... یہی سنا ہے، بڑا دانا پردھان اور شکل صورت والا تھا......"

بولتے بولتے ساجدہ پل بھر کو خاموش ہوئی اور شوہر کو دھپ مار کر دوبارہ بولی:

"تیرے جیسی بے کار شے کو ماسٹر صاحب نے دوست کیسے بنالیا؟ یہی سُنا ہے کہ شہر کے بڑے بڑے اونچے لوگ اُن کے پاس بیٹھتے تھے۔ کہاں وکیل اور افسر لوگ، کہاں ماکھا نائی، جو سوائے باپ والا پیشہ کرنے کے باقی سارے کام کرتا تھا۔ پائپ فِٹ کرتا، پانی کی موٹریں لگاتا، بکرے ذبح کرتا، دیگیں پکاتا اور تندور میں روٹیاں لگاتا...... اور پتا نہیں کیا کیا۔ کوئی پیسے دے اور جو مرضی ہے کروالے۔ اتنا لالچی بندہ، اللہ کے شان دیکھو! اب مشتاق خان بن بیٹھا ہے۔ خان!!...... خان صاحب!!! کوٹھی کا مالک۔ میرے بھائی کو دعائیں دو، جس نے حبیب کو انگلینڈ بلایا اور وہ پونڈ بھیجتا ہے۔"

بیوی کی ناک کو نرمی سے پوروں میں لے کر مشتاق نے دبایا اور بولا: "شرم کر شرم۔ حبیب تمہارا داماد بھی ہے۔ اب دل سے کینہ نکال دے......" اُس نے ایک جھٹکے سے ناک چھڑائی اور چمک کر بول اٹھی: "بڑے بے فیض ہو۔ تجھے کب یقین آئے گا کہ حبیب کے خلاف میرے دل میں کبھی بھی حسد نہ تھا۔ تم اُس سے زیادہ محبت دکھاتے تھے، میں چڑ جاتی تھی۔ اللہ گواہ ہے وہ مجھے شروع میں اچھا لگا۔ دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ سانولا ہے مگر بڑا نقشی۔ کیا اچھا ہو، بڑا ہو کر میرا داماد بنے۔ جوان ہو کر ایسی چھب نکالی۔ اللہ بُری نظر سے بچائے۔ لاکھوں میں ایک۔ تیری شکل نہ عقل۔ صرف ہنر ہی ہنر یا لالچ۔ وہ تیری طرح لالچی بھی نہیں۔ تینوں بہنوں کی شان دار طریقے سے شادیاں کیں۔ سگے بھائیوں سے زیادہ اچھا ثابت ہوا۔"

مشتاق نے ہنستے ہوئے کہا: "کبھی کبھی بُری عادت بھی بندے کو فائدہ دے

جاتی ہے۔ مجھے صحیح اندازہ نہیں کہ تیری دبی ہوئی محبت نے جوش مارا یا ماسٹر صاحب کا دیا ہوا لالچ کام کر گیا اور میں فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ اس لیے تم مجھے لالچی ہونے کا طعنہ نہ دیا کرو۔ ورنہ اُس روز اکھاڑا گیا پودا پڑا سوکھ جاتا تھا...... ماسٹر صاحب سمجھایا کرتے تھے کہ بیٹیوں والے مرد کو بیوی کا غصہ برداشت کر لینا چاہیے لیکن علیحدگی کا کبھی نہ سوچے۔ ورنہ بیٹیوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے...... ویسے وہ مجھ سے عمر میں چار پانچ سال چھوٹے ہی ہوں گے۔ تمہارے برابر تقریباً۔ اس لیے مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرو کہ تجھے اُن کی شکل میں باپ نظر آتا تھا۔ وہ اور بات ہے کہ اُنھوں نے چھوٹے ہو کر بھی ہم سے وہی سلوک کیا جو نیک ماں باپ اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔''

شریری مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے مشتاق نے کہا: ''ویسے سچی بات ہے کہ دنیا ماسٹر صاحب کی باتیں سن کر نشے میں آ جاتی تھی لیکن مجھے نصیحت کرتے ہوئے جب تیرا ذکر آتا تو وہ مجھے نشے میں لگتے اور کہتے: مرد کی یہی شان ہے کہ بیوی کے ناز نخرے اٹھائے۔ اس سے مردانگی کم نہیں ہوتی...... مسکرا کر کہتے: خوبصورت عوت میں ناز نخرہ ہوتا ہی ہے۔ تمہاری بیوی میں اِس کے ساتھ ذرا اکڑ بھی آ گئی ہے، کوئی بات نہیں۔ عورت باکردار ہو اور خوبصورت بھی تو اُس کی اکڑ برداشت کر لینی چاہیے۔ اور یہ نسلی تکبّر جہالت کی وجہ سے ہے۔ ورنہ دیکھو تم! اُس کا بھائی کتنا روشن خیال ہو گیا، حالانکہ تعلیم اُس کی میٹرک ہی ہے۔ جبکہ بعض لوگ پڑھ لکھ کر بھی جاہل رہتے ہیں......''

ساجدہ نے پھر وہی سوال دہرایا: ''تم مجھے اس بات کا جواب دو کہ وہ تجھ جیسے گوڈو کو پسند کیوں کرتے تھے؟ خان صاحب تو تم پچھلے دس سال میں بنے ہو، اس سے پہلے بلکہ بہت پہلے، بیس پچیس سال، بالکل گوڈا کرکٹ ہوا کرتے تھے۔ شکل اتنی بُری نہیں تھی، صرف رنگ ہی پکا تھا لیکن حلیہ اور لباس دیکھ کر دل کوئلہ ہو جایا کرتا تھا۔ تجھے آگ لگا کر خود بھی مر جانے کو دل چاہتا۔ کہاں گوبنج گجری اور کہاں کوا ناگی۔''

مشتاق نے بیوی کی چٹکی لی اور کہنے لگا: ''جب وہ نئے نئے ٹرانسفر ہو کر آئے تو اسکول کے لڑکے مجھے اُن کے گھر کی ٹونٹیاں اور ڈونکی پمپ ٹھیک کروانے لے گئے تھے۔ کرائے کا مکان لیا تھا۔ بیوی اور ایک ہی بچی تھی، دونوں اگلے ہفتے آ گئیں۔ انھیں جس کام کی ضرورت پڑی، میں نے کر دیا۔ مہینے بعد بقر عید تھی۔ سب سے پہلے اُن کا بکرا ذبح کیا۔ ایسی دوستی ہوئی کہ جو بھی کام ہوتا، مجھے ہی بلواتے۔ جب اُن کے تینوں بچے سکول جانے لگے تو بوڑھے والدین کو لمبی بیماری لگ گئی۔ بیگم کی ساس اُن کی خالہ لگتی تھی۔ لاہوری تھے۔ بیگم وہاں کسی لڑکیوں کے اسکول میں پڑھاتی رہی تھیں، اس لیے آبائی گھر چلے گئے۔ ماسٹر صاحب ہر مہینے کی پہلی ہفتہ وار چھٹی پر گھر ضرور جاتے۔ چھڑے ہونے پر دوستوں کی محفل ہر روز لگتی۔ میں فارغ ہو کر اُن کے پاس چلا جاتا۔ سارے کام کرتا۔ چائے بنا کر مہمانوں کو پلاتا۔ پکوڑے تلتا، روٹی سالن بھی پکا دیا کرتا۔ عالم فاضل لوگوں کی محفل میں بیٹھ کر اُن کی باتیں غور سے سنتا۔ مزہ آ جاتا۔ یہی سوچتا کہ بیوی کی بکواس سننے سے بہتر ہے، یہاں بیٹھ کر عقل اور دانائی کی اونچی اونچی باتیں سنو۔ لطیفے بھی ہوتے، ہنسی مذاق قہقہے، جن کی مجھے اکثر سمجھ آ جاتی......''

ساجدہ نے اچانک اُس کی سنواری ہوئی مونچھوں کو مَسل ڈالا، جس سے تیکھی نوکوں کے بال بکھر گئے۔ بھڑک کر بول اُٹھی: ''لعنتی نہ ہو تو...... بکواس یہی کرتی تھی کہ حلیہ ٹھیک کرو۔ ایک تو شکل بے سُری، اوپر سے لباس بے ڈھنگا۔ اچھے بھلے پیسے کما کر بینک میں جمع اور ماسٹر صاحب کی اُترن پہن لیتا تھا۔ کپڑے بیشک قیمتی ہوتے تھے لیکن کھلے اور لمبے۔ خدا کی قسم کارٹون لگتے تھے۔ میرا کلیجا جل جاتا۔ پہلا خاوند پیدائشی پوتی اور کام چور نکلا۔ گھر میں فاقہ کر لیتا لیکن کام پر نہ نکلتا۔ اُلٹا مجھ سے لڑائی شروع کر دیتا کہ عثمان بھائی انگلینڈ سے پورا خرچہ کیوں نہیں بھیجتا...... میری قسمت دیکھو، دوسرا مقدر میں ایسا لکھا تھا کہ پہلے والے کی ساری کسریں نکال دیں۔ ہر وقت کام ہی کام۔ بندہ

آرام بھی کر لیتا ہے۔ رات کے ایک بجے بھی دستک سن کے بیوی کے پاس سے اُسی پل اُٹھ جانے والا مرد۔ لکھ لعنت۔ اتنی بے قدری۔ صرف پیسے کی خاطر...... ایسا خاوند دوبارہ قریب آئے، عورت کو چاہیے پیٹھ پر لات مار کے کمرے سے باہر نکال دے۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ بے قدری برداشت کرتی رہی......''

مونچھوں کو بل دیتے ہوئے مشتاق نے ہاتھ روک لیے اور پچکار کر بولا۔

''پیسہ، تمہارے اور اولاد کے لیے ہی کما کے لاتا رہا تھا ناں!! جمع کرنے سے ہی سارے کام ٹھیک ہوئے۔ بیٹے کی شادی کی۔ بیٹیاں پڑھائیں۔ پونڈ بہت بعد میں آنے شروع ہوئے۔ یاد کرو، کتنا خرچہ ہوا تھا، حبیب کو انگلینڈ بھیجنے پر...... اور پھر اُس کی بیوی بچے کو بھی میں نے اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے بھیجا۔ کسی سے ایک روپیہ اُدھار نہ لیا۔ پیسہ بچانے سے ہی کام نکلتے ہیں۔ خود میں نے اپنے اوپر کبھی ایک پیسہ نہ ضائع کیا۔ حرام ہے جو جیب سے ٹافی کے لیے بھی سکہ نکالا ہو......''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مشتاق خان کو دل کا دورہ نہ پڑ جائے، جیب سے پیسہ نکلنے پر...... ایسا کنجوس مکھی چوس کوئی دنیا میں اور پیدا ہی نہیں ہوا۔ شہر میں ایک ماسٹر نہیں، کئی ماسٹر اسی لیے یار بنا رکھے تھے۔ کہیں کھانے کو مل گیا، کہیں چائے پی۔ جہاں سے جو بچی کھچی شے ملی، ہڑپ کر لی۔ مفت میں ملے پرانے سامان سے گھر بھر رکھا تھا۔ کباڑ کا مال، کبھی کولر اٹھائے آ رہا ہے، کبھی پنکھا، کبھی واشنگ مشین...... یااللہ!! میں سوچ سوچ کر حیران ہوتی۔ ایک جیسی تین تین چیزیں پہلے ہی پڑی ہیں۔ شہر میں اور کوئی منگتا نہیں رہا۔ صرف میرا خصم ہی رہ گیا۔ ریڑھے رکشے کا کرایہ بھی خرچ نہیں کرتا...... جس دن تم نے اتنی بھاری واشنگ مشین سر پر اٹھا رکھی تھی، مجھے اتنا غصہ آیا کہ پہلے ہی جنگل اور ڈبل، دو مشینیں گھر میں پڑی ہیں۔ کسی روز اس بندے کا منکا ٹوٹ جائے گا۔ تب اس کا لالچ ختم ہوگا۔ پہلے میں طلاقن ہوئی، اب بیوہ ہو جاؤں گی۔ کیوں نہ ڈنڈا مار

کر اس کا گوڈا ہگا (گھٹنا اور ٹخنہ) توڑ دوں۔ چار دن آرام سے گھر بیٹھے۔ یہی کباڑ بیچ کر روٹی کھالیں گے......" وہ بولتے بولتے ہنس پڑی۔

مشتاق نے قہقہہ لگایا اور بیوی کی پتلی کمر میں بازو ڈال کر ایک ہی جھٹکے سے اٹھا کے گود میں بھر لیا۔ مونچھوں سے اُس کے چہرے پر گدگدی کرتے ہوئے ہاتھوں سے بھی گدگدایا۔ وہ مچلی تڑپی اور بے طرح ہنسنے لگی۔ ہف کر بولی: "چھوڑ لعنتی! میری پسلیاں چڑھ گئی ہیں۔ بڑھاپے میں لاڈ سوجھنے لگے ہیں، اب اتنی جان نہیں رہی......"

گرفت سے آزاد ہو کر ساجدہ ساتھ بیٹھ گئی۔ دونوں کی سانسیں پھول گئیں۔

قدرے ہانپتے ہوئے وہ بول پڑا: "کوئی ایک چیز بیکار نہیں گئی۔ مرمت، رنگ روغن اور صفائی ستھرائی کر کے بیچ دیتے تھے۔ محلے اور نئی آبادی کی عورتیں تمہاری کتنی احسان مند تھیں، جنہیں تم نے قسطوں پر چیزیں دیں...... ویسے ایک بات صحیح ہے۔ ماسٹر صاحب نے میاں محمد بخش کا کلام یاد کر رکھا تھا۔ بلبل والے کے علاوہ ایک اور شعر بھی اکثر سنایا کرتے: نیچاں دی آشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا، ککر تے انگور چڑھایا تے ہر گچھا زخمایا...... ایک بوڑھے پروفیسر صاحب کہا کرتے تھے کہ عورت ذات میں حوصلے اور صبر کی کمی ہوتی ہے۔ اُن لوگوں کی باتیں خاموشی سے سنا کرتا۔ کچھ کہنے کی اوقات ہی نہ تھی لیکن بیٹھا سوچتا رہتا۔ تیری ہر وقت کی بک بک نے مجھے سُولی پر لٹکا رکھا تھا۔ میرے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عورت ذات ہے ہی بے فیض۔ پہلے خاوند کی گردن دبا کر تم نے طلاق لی کہ وہ نکما تھا۔ مجھ سے ہر وقت خفگی کیا کرتی کہ میں دن رات کام کرتا ہوں۔ بھئی! سیدھی بات ہے، رات کو کسی کا مسئلہ حل کرنے سے ڈگنی تگنی مزدوری ملتی ہے۔ میاں بیوی کا معاملہ ادھورا رہ جائے تو بعد میں ہو سکتا ہے۔ جس رات ایک بجے اُٹھ بھاگنے کا طعنہ آج بھی دیتی ہو، وہ ایمرجنسی ہو گئی تھی۔ یاد کرو۔ چوہدری رزاق نے دروازے پر آواز دی تھی کہ ٹینکی کی لائن ٹوٹ گئی ہے اور پانی سیڑھیوں سے کمروں میں

آ رہا ہے۔ اس لیے چھلانگ مار کے اٹھ گیا تھا کہ اپنا کیا؟...... گھر کا معاملہ ہے۔ پھر سہی۔ زندگی رہی تو بار بار...... مشکل گھڑی میں جب بھی کسی کا کام کیا، دُہرا فائدہ اٹھایا۔ اگلے نے دُہری مزدوری دی اور احسان مند بھی رہا۔ رزاق نے پچاس روپے کے کام کا معاوضہ دوسو روپے دیا اور جھپا مار کے شکریہ ادا کیا۔ جب بھی کسی دفتر میں کام پڑا اُس نے فوراً فون ملایا اور سفارش کی...... افسوس، تم نہیں سمجھو گی۔ بات وہی ہے، بیچاں دی اشنائی کولوں فیض......"

ساجدہ نے شوہر کے سینے پر دو ہتھڑ مار کر دھکیل دیا اور بولی: "دفع دُور...... اتنی اونچی ذات کو بیچ کہتے ہوئے ذرا شرم نہیں آئی۔ مجھ میں صبر تھا تو تیرے ساتھ گزارہ کیا۔ ورنہ سب کچھ برباد ہو گیا تھا۔ میں اندھیرا پڑنے کا انتظار کر رہی تھی کہ دن کی روشنی میں ڈیم کی طرف جاتے ہمیں کوئی دیکھ نہ لے۔ فیصلہ کر لیا تھا کہ چاروں بیٹیوں کو بھی ساتھ لے کے مروں گی۔ تا کہ میرے بعد رُل نہ جائیں۔ حبیب رات کو بڑی دیر سے گھر آیا کرتا تھا۔ اُس دن تم ضد پر اڑے رہتے اور پچھلے پہر گھر نہ آ جاتے تو تیرے ہاتھ کچھ نہ آتا۔ سوائے ہماری لاشوں کے...... وہ بھی اگر قسمت اچھی ہوتی تو صحیح سلامت مل جاتیں......"

مشتاق نے بیوی کا ہاتھ تھام لیا اور سرد آہ بھر کے بولا: "واہ! وہ گھڑی پل کی بات ہی تھی۔ ورنہ کیا سے کیا ہو جاتا۔ توبہ استغفار۔ پتھر پر لکیر کی طرح دل پہ لکھ لیا کہ طلاق دے دوں گا۔ ہر روز بیوی سے بے عزت نہیں ہوا جاتا۔ کمینہ، بدشکل، لالچی کہلوانا برداشت سے باہر ہو گیا۔ یہی سوچا کہ پیسے ہیں، مقدمہ لڑ کر بیٹیاں لے لوں گا۔ اصل میں ماسٹر صاحب نے میری اور سلیمہ کی باتیں سن لی تھیں۔ دسویں جماعت کا ایک لڑکا کوئی سبق پوچھنے آیا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اُس سے باتیں کرتے ہوئے سو سو کے کچھ نوٹ دیے اور کہا: ذرا جلدی سے اچھی طرح پیک کروا کے لے آؤ۔"

ذرا سا توقف کرتے ہوئے مشتاق نے سرد آہ بھری اور دوبارہ بولنے لگا:

''بارش برس رہی تھی۔ ماسٹر صاحب نے برآمدے میں مجھے اپنے سامنے کرسی پر بٹھالیا اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے۔ میاں بیوی کے تعلق کا پورا نقشہ کھینچ دیا۔ بتایا کہ اِس سے اچھا رشتہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ والدین نہیں رہتے۔ بہن بھائی، حتیٰ کہ اولاد بھی اپنے گھر کی ہو جاتی ہے۔ آخرکار میاں بیوی ہی ایک دوسرے کے لیے رہ جاتے ہیں۔ کہنے لگے: اِس عاشقانہ موسم میں بیوی سے دور رہنے والا کوئی مرد بدقسمت ہی ہوگا۔ یہ لڑکا واپس آ جائے تو میں بھی لاہور نکل جاؤں گا۔ وہاں بھی یہی موسم بنا ہوا ہے۔ ساری رات بیوی سے پیار بھری باتیں کروں گا۔ دنیا میں محبت کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔ خوبصورت بیوی سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں ہوتی۔ جو عورت اپنے شوہر کی اولاد پیدا کرے اور گھر کا نظام چلائے، اُس سے کیا گلہ شکوہ؟ اُس بے چاری کے پاس اور کیا بچارہ جاتا ہے؟ جب اپنا آپ ہی سونپ دیتی ہے تو اُس کا ناز نخرہ اٹھا لینے میں مرد کی مردانگی کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ اصلی مرد میدان کی نشانی یہی ہے کہ مردوں کے مقابلے میں ڈٹ جائے لیکن عورت کی سخت بات سن کر نہ صرف مسکرا دے بلکہ پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔''

ساجدہ مبہوت ہوئی نم آنکھوں سے سن رہی تھی۔ مشتاق پر بھی وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کہنے لگا: ''اُس وقت مستانی ہوا کے ساتھ پھوار پڑنے سے ہمیں برآمدے میں ہلکی ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ ماسٹر صاحب نے میری آنکھوں کے سامنے عشق محبت بھری ایسی فلم چلائی کہ میرا دل اُچھل اُچھل کے باہر آنے لگا۔ تجھے جینے سے لگا کے پیار کرنے کو تڑپ اٹھا۔ اتنے میں وہ لڑکا واپس آ گیا۔ اُس کے ساتھ نفیس ہوٹل کا ملازم تھا۔ دونوں نے اخباروں میں لپٹے دو بنڈل اٹھا رکھے تھے، جن پر پلاسٹک بھی دیا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب مجھ سے کہنے لگے: یہ کڑاہی گوشت اور نان، گرم گرم گھر لے کے

جلدی پہنچو۔ جاتے ہی سلیمہ بیٹی کا منہ چومو۔ تمہاری بیٹیاں بڑی معصوم اور پیاری ہیں۔ چاروں کو باری باری چومنا۔ وہ ہنس پڑے اور کہا: سب مل کے ایک ساتھ کھانا۔ کوئی گلہ شکوہ زبان پر نہ لانا۔ بلکہ معافی مانگ لینا۔ یہی انسان کی بڑائی ہے۔ جب بچیاں کھا پی کے سو جائیں تو باقی اللہ کارساز ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم دونوں برسات کی جاتی بہار کے مزے نہیں لوٹ پاؤ گے......"

ساجدہ کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں۔ اتنے میں گیٹ کی گھنٹی بج اُٹھی۔ مشتاق نے اُٹھتے ہوئے کہا: "چل اُٹھ، کڑاہی گوشت آ گیا ہے۔ کھائیں اور آج اُسی برسات کی یاد تازہ کریں۔" نم آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ ساجدہ پر رقت طاری ہوگئی اور وفورِ جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں بولی: "اللہ ماسٹر جی کی جھولی دنیا جہان کی خوشیوں سے بھر دے۔"

ooo

انتظار

پٹوار ٹریننگ اسکول کھلنے سے شہر میں جرائم کی شرح بڑھ گئی۔ مار کٹائی، چھینا جھپٹی اور چوری چکاری کے واقعات عام ہوگئے۔ آئے روز کسی خوانچہ فروش یا کھوکھے تھڑے والے سے مال لے کر ادائیگی کرنے کی بجائے لڑ پڑتے۔ قلفی فروش ان مخصوص طلبا کی ٹولی کو دیکھتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے تو کچھ بھیڑ میں گھسنے کو لپکتے۔ اگر کوئی بدقسمت اِن کے نرغے میں آ جاتا تو اُس کا سارا ٹھنڈا سودا چٹ کر کے دم لیتے۔ رات کو گھروں کی چاردیواریاں پھاند کر، اگر کوئی قیمتی مال ہاتھ نہ لگتا تو رسوئیوں سے اشیائے خورونوش ہی لے اُڑتے۔ بعض صحنوں میں لٹکے چھکوں سے پکی پکائی ہانڈیاں اور دودھ دہی کے برتن غائب ہونے کی وارداتیں بھی ہوئیں۔ کچھ اوباش خصلت نوجوان، اخلاقی جرائم کا ارتکاب کرنے سے بھی باز نہ آئے۔

زیادہ تر اردگرد کے اُن چار پانچ اضلاع کے لڑکوں نے ہی پٹوار اسکول میں داخلہ لے رکھا تھا، جہاں جرائم نسبتاً کثرت سے ہوتے تھے۔ اسکول، شہر سے باہر ایک بڑی سرکاری عمارت میں قائم ہوا لیکن ہاسٹل کی سہولت میسر نہ ہونے کی وجہ سے تمام تر غیرمقامی لڑکوں نے مشترکہ طور پر بیٹھکیں اور رہائشی کمرے کرائے پر لے رکھے

تھے۔ ضلعی اور علاقائی زبانوں کے باہمی فرق کی بنیاد پر تعصب سرایت کر جانے سے طلبا کئی گروہوں میں بٹ گئے اور آپس میں بھی اکثر بھڑ جایا کرتے۔ لیکن میلہ لوٹنے، مشاعرہ اُلٹانے، مفت میں سرکس تھیٹر دیکھنے اور کسی بھی تفریحی پروگرام کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کو ان طلبا کے سارے گروہ باہمی اختلافات کو پس پُشت ڈال کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد ہو جاتے۔

خواجہ سراؤں کی شامت آئی رہی اور کوئی نہ کوئی ٹولی موقع پا کر اُن کے ڈیرے پر یلغار کر دیتی۔ بعضوں کی زد میں کم عمر ہم جنس آ گئے تو کئی ایک نے بھکارنوں کو بھی نہ بخشا۔ پیشہ ور خانہ بدوش لڑکیوں سے بدمعاملگی کرنے پر نوبت سر پھٹول تک جا پہنچی۔ ان ہونہار طلبا میں ایک خصلت ہُو بہُو اپنے ہم وطن عام مردوں کی سی تھی کہ کوئی غیر اخلاقی معرکہ مار کر ڈھنڈورا ضرور پیٹتے، جس طرح اس معاشرے کا بظاہر فرشتہ صورت مرد بھی اپنا معاشقہ کسی نہ کسی سے بیان کیے بغیر چین سے نہیں رہ سکتا۔ اور یہ بھی نہیں سوچتا کہ اس کے دامِ اعتبار میں آنے والی رسوا ہو رہی ہے۔

مستقبل قریب میں، خاص وعام کی جائز ناجائز زمین جائیداد کے انتظام وانصرام کا اہم فریضہ سنبھالنے والے قوم کے ان نابغہ سپوتوں نے بعض ایسے ناگفتنی کارنامے سرانجام دیے، جن کی مثال اس شہر میں پہلے کبھی نہ قائم ہوئی تھی۔

شہر کے شرقی حصے کی ایک مضافاتی بستی سے کچھ عورتیں آسودہ گھرانوں میں کام کاج کی غرض سے دن کے مختلف اوقات میں آیا جایا کرتیں، جن میں پچاس پچپن سالہ بیوہ عورت، بختاں مائی بھی تھی۔ درمیانی راستہ خود رو اونچی نیچی جھاڑیوں، گھاس پھونس اور بھنگ کے جنگل سے اٹا رہتا۔

ٹھیکیداروں کے گھر سے سہ پہر کے وقت بختاں حسب معمول کام سے فارغ ہو کر نکلی اور اپنی بستی کی جانب تیز تیز قدموں سے چل دی۔ ابھی نصف راستہ ہی طے کیا

تھا کہ تین طلبا نے اس کو روک لیا۔ وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولی: ''نہ کرو میرا بچہ! غریب بیوہ ہوں، کوئی والی وارث نہیں۔ بوڑھی نمانی سے تم کو کیا ملے گا؟''

صداقت نامی لڑکے نے بڑی ڈھٹائی سے کہا: ''فکر نہ کرو مائی! بہت کچھ ملے گا۔ ہمارے ایک بڑے تجربہ کار تماش بین بزرگ کا کہنا ہے کہ بوڑھی عورت اور کم عمر لڑکی کا معاملہ برابر ہوجایا کرتا ہے۔ آج ہمیں خود اس کا تجربہ کرنا ہے......''

شام کے قریب بستی کی چند عورتوں نے واپسی پر بختاں کو خستہ خوار حالت میں دیکھ لیا۔ تسلی دلاسا دیا، ہمت بندھائی اور سہارہ دے کر گھر لے گئیں۔ سب نے کوشش کر دیکھی لیکن اس نے قطعاً نہ بتایا کہ اصل ماجرا کیا ہوا۔ یہی کہتی رہی کہ آج ٹھیکیداروں کے ہاں کام اتنا زیادہ تھا کہ بُری طرح تھک گئی اور واپسی پر گری لگنے سے نڈھال ہوکر سائے میں ذرا دم لینے کو رُکی تھی۔ اُس کو ہلکا بخار ہوگیا اور ٹوٹے ہوئے بدن میں ہمت نہ رہی کہ کام پر جاسکے۔ کئی روز تک اسی طرح پڑی رہی۔

طبیعت بحال ہوتے ہی بختاں دوبارہ کام پر جانے لگی۔ واپسی پر بے اختیار دم بھر کو اُسی جگہ رُک جاتی جہاں شیطان کے چیلوں سے سامنا ہوا تھا۔ چوتھے روز نہ جانے دل میں کیا سمائی کہ راستے سے چند قدم ہٹ کر اُس درخت کے قریب جا کھڑی ہوئی، جس کے سائے میں بے سدھ ہوکر پڑی رہی تھی۔ اُس کو بدن میں اچانک جُھرجُھری محسوس ہوئی اور فوراً پلٹ آئی۔ سامنے وہی عورتیں طنزیہ ہنسی ہنستے کھڑی دکھائی دیں، جو اِس کو سہارہ دے کر گھر لے گئی تھیں۔ بختاں بلاوجہ ہی جھینپ گئی۔ ستو نے استہزائیہ انداز میں ہاتھ نچا کر ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی: ''کوئی فائدہ نہیں۔ پٹوار سکول میں ہفتہ پہلے گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئی تھیں۔ آؤ گھر چلیں۔''

000

بچھڑے ہوئے لوگ

اٹھارہ برسوں میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔ حسن علی یہ سوچتے ہوئے غم زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوشی بھی محسوس کرنے لگا۔ یہی اسلام آباد ہے جہاں وہ پیدا ہوا اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ باپ کی ریٹائرمنٹ پر والدین کے ہمراہ اس شہر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور واپس اپنے آبائی علاقے کے گھر میں جا آباد ہوا تھا۔ پنڈی اسلام آباد اور گردونواح کی ہر قابلِ ذکر جگہ اس نے دیکھ رکھی تھی، لیکن اب بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔

حسن علی کے والد غلام علی نے جوانی سے بڑھاپے تک تقریباً تیس برس بطور ڈرائیور کے وزارتِ صحت میں ملازمت کی تھی۔ غلام علی نے زندگی بھر ایک ہی خواب دیکھا تھا، کہ ذاتی جیپ ہو جو وہ دریا کے اس پار بازار سے اُس پار اپنے گاؤں اور اردگرد بکھری چھوٹی چھوٹی بستیوں کے مکینوں کو لانے لے جانے کے لیے کرائے پر چلائے۔ دونوں بڑے بیٹے فوج میں بھرتی ہو گئے اور اُن کی شادیاں بھی کر دی تھیں۔ اکلوتی بیٹی بھی اپنے گھر کی ہوئی اور میاں کے پاس متحدہ عرب امارات چلی گئی۔ حسن علی کے بارے میں باپ نے طے کیا کہ واپس گاؤں میں جا کر آباد ہوتے ہی اپنی سگی بھانجی کو

بہو بنا کر لے آئے گا۔

زندگی بھر کی جمع پونجی اور ریٹائرمنٹ پر ملنے والے کل واجبات کو ملا کر غلام علی نے گوالمنڈی کی ایک ورکشاپ میں پڑی جیپ خرید لی اور اس کو اپنی نگرانی میں تیار کروانے لگا۔ اِس اثنا میں حسن علی نے بہت بھاگ دوڑ کی کہ کسی طرح کوئی ملازمت مِل جائے اور وہ اسلام آباد نہ چھوڑے لیکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اُس کو اپنی پھوپھی زاد پسند تھی۔ آبائی علاقہ بھی اچھا لگتا تھا۔ لیکن ڈرائیونگ کے پیشے سے کوئی خاص لگاؤ پیدا نہ ہوا اور پھر باپ کی بھرپور محنت کے باوجود اُس جیسا ماہر ڈرائیور بن بھی نہ سکا۔ اپنے علاقے کی اونچی نیچی کچی پکی اور تنگ سڑکوں پر، خصوصاً برفانی موسم میں گاڑی چلانے کے بارے میں سوچ کر دل میں ہول سمانے لگتا۔

باپ کی سرپرستی میں انھی خطرناک راستوں پر چند مہینوں کی مشق نے حسن علی کو ایسا پُراعتماد ڈرائیور بنا دیا کہ ہر کوئی معترف ہوا۔ وہ خود بھی یہ مہم جُوئی کرتے ہوئے دل میں اک جوش اور ولولہ موجزن ہوتا محسوس کیا کرتا۔ معقول آمدنی ہونے سے گھر میں خوش حالی آئی۔ اس کی شادی ہوئی اور تین بچوں کا باپ ہوا۔

گزشتہ برس سے پُل میں زیادہ لچک آ گئی تھی۔ خصوصاً گاڑی گزرتے ہوئے خطرناک حد تک ہچکولے آنے لگتے، اس لیے سواریاں اتر جایا کرتیں اور جیپ پر صرف سامان لدا رہ جاتا۔ لوگوں نے بتایا کہ معلق پُل کے آہنی رسّوں میں کھچاؤ کم ہو گیا ہے، جن کو کسنے سے ہی پُل اپنی اصل حالت میں قابلِ استعمال ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ سلیپر نما لکڑی کے بھاری پھٹوں کا فرش بھی خاصا بوسیدہ ہو گیا تھا۔ کئی پھٹے ٹوٹ کر دریا میں گر چکے تھے۔ مقامی آبادیوں کے افراد اپنی مدد آپ کے تحت باقی ماندہ سلیپروں کو کھسکا کر درمیانی درزیں برابر کر لیا کرتے اور احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے پُل پار کر لیتے۔ لیکن بوڑھوں اور مریضوں کے لیے گزرنا، موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

اسی لیے کئی خواتین زچگی کے دوران پیچیدگی پیدا ہونے پر ہسپتال نہ پہنچائی جاسکیں اور بعض شدید زخمیوں اور مریضوں کی طرح جان سے گئیں۔

حکومت سے بار بار اپیلیں کی گئیں کہ پُل کی مرمت ہنگامی بنیادوں پر کی جائے مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر چند سو افراد نے حکامِ بالا کے دفاتر تک جلوس کی شکل میں مظاہرہ کیا، تب کہیں ماہرین کی ٹیم معائنہ کرنے آئی اور چند روز بعد پُل کے دونوں سروں پر بورڈ لگوا دیے گئے، جن پر لکھا تھا: ''پُل صرف پیدل آمدورفت کے لیے کُھلا ہے۔''

افسران نے دوبارہ رابطہ کرنے پر بتایا کہ پُل کی مرمت کے لیے درکار فنڈز کی منظوری اوپر سے لینا ہو گی، لہٰذا تحت ضابطہ کارروائی کا آغاز ہو چکا ہے۔ مقامی آبادی کے نمائندہ وفد نے اس میٹنگ میں درپیش سنگین صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ نزدیک ترین متبادل پُل اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، جس سے بچوں، بوڑھوں اور مریضوں کے لیے سفر کرنا مشکل ہو گیا ہے، اس لیے موجودہ پُل کی مرمت ترجیحی بنیادوں پر کی جائے۔ افسران نے پھر وہی فنڈز کی کمی کا عذر دہرایا اور انتباہ کیا کہ عوام الناس اپنی جان اور مال کی حفاظت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے مخدوش پُل پر سے ٹریفک نہ گزاریں، ورنہ وہ اپنے نقصان کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

پُرآسائش دفتروں میں بیٹھے حکام کو عام لوگوں کی مشکلات کا عملی تجربہ نہیں ہوتا۔ پُل پر ہلکی ٹریفک خصوصاً جیپیں اور موٹر سائیکلیں چلتی رہیں۔ غلام علی نے معمول بنا لیا کہ وہ پُل پر سے جیپ گزارتے ہوئے خود سٹیئرنگ سنبھال لیتا۔ حسن علی جیپ کے آگے آگے پیدل چلنے لگتا اور جہاں کہیں چوبی تختوں کے مابین فاصلہ زیادہ ہوتا، چیونٹی کی رفتار سے چلتی جیپ کو رُکنے کا اشارہ کرتا اور تختے باہم جوڑ دیتا۔ پُل کے پار جا کر باپ گاڑی سے اُتر جایا کرتا اور بیٹے کی واپسی تک وہاں ہی بیٹھا انتظار کرنے لگتا۔

دو بلند پہاڑوں کو ملانے والے معلق پُل کے نیچے بہت زیادہ گہرائی میں بہتے پُرشور دریا کو دیکھ کر دلوں پر ہیبت طاری ہو جاتی۔ یوں گمان گزرتا کہ تنگ درّے میں سے گزرتا منہ زور پانی کا ریلا گو کہ سو ڈیڑھ سو فٹ نیچے غضب ناک رفتار سے بہہ رہا ہے لیکن یہ کسی بھی لمحے اچھل کر اوپر سے گزرتے انسانوں کو نگل لے گا۔

بدقسمتی سے وہ منحوس لمحہ آ ہی گیا، جب حکومتی انتباہ سچ ثابت ہوا۔ جیپ سے سواریاں اتر کر پیدل چل دیں لیکن آٹے اور دیگر سامان کی بوریاں لدی رہیں۔ حسن علی پوری احتیاط سے تختوں کو باہم جوڑ کر باپ کو آگے بڑھنے کا اشارہ دیتا رہا لیکن ماہر ڈرائیور سے فاش غلطی ہو گئی۔ کلچ تھراٹل میں ربط وضبط قائم نہ رہا اور اچانک بریک پیڈل بھی دبا دیا۔ ٹائر گھسیٹتے ہی ایک تختہ سرک کر دوسرے پر اُلٹ گیا، جس کے نتیجے میں اگلے بائیں پہیے کے نیچے خلا پیدا ہوتے ہی پلک جھپکنے میں جیپ الٹ گئی اور حسن علی کے نظروں کے سامنے سیدھی نیچے جھاگ اڑاتے پانیوں میں جا گری۔ آگے آگے پیدل چلتے جیپ کے مسافر واپس پلٹے اور دو طرفہ رسّوں کو تھامے بڑی احتیاط سے حسن علی کی طرف بڑھے جو واویلا کرتے ہوئے پاگلوں کی طرح پُل کے دائیں اور کبھی بائیں پہلو کی طرف لپکا کہ دریا میں کود کر باپ کو بچا لے۔ لوگوں نے اُس کو بازوؤں میں جکڑ لیا۔ نیچے بپھرے ہوئے دریا میں جیپ نظر آ رہی تھی نہ اُس کا ڈرائیور۔

آج تک جو بھی گاڑی بلندی سے دریا میں گری، پانی اترنے پر چند میل آگے اُس کا ڈھانچا ہی چٹانوں میں پھنسا نظر آیا، جس کو کوئی بھی مالک نکال نہ پایا تھا۔ حسن علی کی جیپ کا ڈھانچا چار روز بعد تقریباً پانچ چھ کلومیٹر نیچے دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہتا ہوا اُس مقام پر چٹانوں میں اٹکا نظر آ گیا، جہاں پانی بلند پہاڑوں کی تنگنائے سے موڑ کاٹتا ہوا گزرتا ہے۔ حسن علی کی تسلی کے لیے گاؤں والوں نے ہر طرح کا تعاون کیا۔ اُس کی خواہش پر بہت سے لمبے رسّے لائے گئے اور اِسے باندھ کر پانی میں اتارا تا کہ

وہ جیپ کے ڈھانچے میں باپ کا جسدِ خاکی تلاش کر سکے۔ لیکن جان کا خطرہ مول لینے کے باوجود ناکامی ہوئی۔ ماضی میں بھی اس طرح کی حادثاتی موت کا شکار ہونے والوں میں سے اتفاقاً ہی کسی کی لاش ملی ہوگی۔ جب کوئی امید نہ رہی تو لواحقین نے صبر شکر کرلیا اور مرحوم کی رُوح کو سکون پہنچانے کی غرض سے فاتحہ پڑھنے تک محدود ہو کر رہ گئے۔

حکومت اس لیے بری الذمہ قرار پائی کہ متعلقہ حکام نے بروقت انتباہ کر دیا تھا۔ تاہم فنڈز بھی تاحال نہ ملے تھے کہ پُل کی مرمت کا کام شروع ہو جاتا۔ حسن علی کا باپ ہی نہ مرا بلکہ روزگار کا وسیلہ بھی جاتا رہا۔ گھر میں بیوہ ماں بیمار تھی لیکن فوجی بیٹوں کی خواہش پر بھی اُن کے ہمراہ جانے کو تیار نہ ہوئی۔ وہ اِسی گھر میں رہنے پر بضد رہی۔ ماں کے علاوہ بیوی بچوں کی کفالت کا بوجھ اٹھانا مشکل ہو گیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اُسی شہر کا رخ کرے، جہاں پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا۔

اسلام آباد میں حسن علی کے بچپن کے دوست اور ہم جماعت غفران نے کھلے دل سے اس کو مہمان رکھا۔ وہ دربار بری امام کے قریب رہائش پذیر تھا۔ بار بار حسن علی کو سمجھاتا کہ ملازمت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ پوسٹ کا بھی نرخ مقرر ہے۔ ہمارے پاس نہ تو کسی بڑی شخصیت کی سفارش ہے اور نہ ہی نقد رقم، لہٰذا بے کار جوتیاں چٹخاتے پھرنا لاحاصل ہوگا۔

حسن علی کی جیب خالی ہوگئی اور وہ دل پر بوجھ محسوس کرنے لگا کہ گزشتہ تین مہینوں سے دوست کے پلے سے کھا رہا ہے۔ دوست نے نہ صرف روزانہ کا خرچ اُٹھائے رکھا بلکہ ضد کر کے دو مرتبہ پانچ پانچ ہزار روپے کی رقم دی اور اپنی موجودگی میں ایزی پیسہ کے ذریعے اس کے گھر بھجوائی۔ حسن علی یہ سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگا کہ غفران کا آخر ذریعۂ آمدن کیا ہے۔ کئی بار دیکھا کہ اُس کی جیب خالی ہے اور دونوں نے دربار پر لنگر کھا کر پیٹ بھرا۔ وہ کسی کی فون کال سُن کر چند گھنٹوں اور بعض اوقات رات

بھر کے لیے غائب ہو جاتا۔ واپسی پر اُس کی جیب کرنسی نوٹوں سے بھری ہوتی۔ پہلی فرصت میں اپنے باپ اور بیوہ بہن کو رقم بھیجا کرتا اور ذاتی خرچ کے لیے صرف ضرورت کے مطابق بچا رکھتا۔

حسن علی نے کئی بار ٹٹولا لیکن غفران ٹال گیا۔ آخرکار ایک دن بول پڑا:

''بائیک یا گاڑی پار کرتا ہوں۔ نئی بائیک کے دس ہزار اور پرانی کے پانچ ملتے ہیں۔ مہران پرانی کے بیس اور نئی کے تیس ہزار روپے ملتے ہیں۔ اس سے اوپر کے مال پر استاد نے ابھی ہاتھ ڈالنے کی اجازت نہیں دی۔ وقت آنے پر پروموشن ہو جائے گی۔ مجھے اس رقم میں سے تھوڑا سا حصہ ریکی کرنے والے ساتھی کو دینا پڑتا ہے......''

غفران نے چند لمحے خاموش رہ کر حسن علی کی آنکھوں میں دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا: ''تمہارے اور میرے ابا، دونوں ڈرائیور تھے۔ بڑے افسروں کی ڈیوٹی دیتے رہے۔ ہمیں یہ پیشہ وراثت میں ملا ہے...... میرا مطلب ڈرائیونگ سے ہے۔ میں نے بڑی ٹھوکریں کھائیں مگر جاب نہیں ملی۔ ابا کو رعشہ کی بیماری نے معذور کر دیا ہے۔ تم فضول ٹکریں مار رہے ہو۔ نوکری نہیں ملے گی۔ حوصلہ کرو۔ استاد کو تمہاری گارنٹی دوں گا۔ آ جاؤ اسی فیلڈ میں......''

دوست کی باتیں سن کر حسن علی کے حواس گم ہو گئے۔ منہ کھولے چند لمحے دیکھتا گیا اور بول پڑا: ''میں یہ سب نہیں کر سکتا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں، ہمارے علاقے میں کبھی کوئی چھوٹا موٹا جرم بھی شاید ہی ہوا ہو۔ چوری چکاری لڑائی مارکٹائی اور قتل کی واردات کبھی نہیں ہوئی۔ ہم لوگ گھروں کو تالے بھی نہیں لگاتے......''

''میں بھی اپنے خاندان میں پہلا چور ہوں۔'' غفران نے ٹوک دیا اور مزید کہا: ''لمبی بے روزگاری نے اس راستے پر ڈال دیا۔ تم اور کوشش کر کے دیکھ لو۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی، اگر تجھے کوئی جاب مل جائے۔ جب تک نہیں ملتی، میں حاضر ہوں۔''

گھر سے آئے حسن علی کو چھ مہینے گزر گئے اور وہ مایوس ہو گیا۔ اس عرصہ میں غفران نے اسے مزید دس ہزار روپے کی رقم گھر بھیجنے کو دی، جو بادلِ نخواستہ قبول کر لی۔ ماں اور بیوی بچوں کی پریشانیوں کا سوچ کر دماغ چکرانے لگتا۔ گھر واپس چلے جانے کا حوصلہ نہ پڑتا، بلکہ موبائل پر بات کرتے ہوئے بھی دل گھبرا جاتا۔ رفتہ رفتہ اس نہج پر سوچنے لگا کہ دوست کے مشورے پر غور کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ اگر اس کا استاد چند ایک بڑی قیمتی گاڑیاں اٹھانے کا کام سونپ دے تو وہ مناسب رقم جمع ہونے پر یہ کام چھوڑ دے گا۔ اتنی رقم ہاتھ آ جائے کہ جیپ نہ سہی، اچھی کنڈیشن کی مہران ہی لے کر گھر لوٹ جائے......

غفران رات بھر بڑی گہری نیند سویا رہا اور صبح تازہ دم ہو کر اٹھا۔ خوشگوار موڈ میں بولا: ''آج جیب خوب گرم ہے۔ گزشتہ روز بڑا لکی رہا اور اوپر تلے دو شکار مار لیے۔ پہلے پہر نئی بائیک اور پچھلے پہر 2010 ماڈل مہران...... چل اٹھ تیار ہو جا...... آج لمبی عیاشی کرتے ہیں۔ پیسے بھی گھر بھیجتے ہیں۔ پانچ ہزار تم بھجوا دو......''

حسن علی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور غفران کے متوجہ کرنے پر چونک اٹھا۔ لمحہ بھر کو اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر نگاہیں جُھکا لیں اور زخم خوردہ سے لہجے میں بولا: ''مجھے استاد سے ملوا دو......'' غفران پہلے مسکرایا اور پھر دوست کے چہرے پر نگاہ ڈال کر اداس ہو گیا۔ کچھ سوچ کر بولا: ''استاد اس وقت مریڑ والے ڈیرے میں ملے گا...... چل تیار ہو جا۔ تجھے میٹرو کی سیر بھی کرواتے ہیں۔ کیا یاد کرو گے۔ ہمارے حکمرانوں نے اپنے ہی ملک میں یورپ بنا دیا ہے۔ ورنہ ہم یہ نظارے کبھی نہ دیکھ پاتے۔ ویزا پاسپورٹ نہ لمبا خرچہ۔''

میٹرو میں صدرِ مملکت نے شریکِ سفر ہو کر مسافروں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اُن کی تقریرِ دل پذیر سن کر حسن علی کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ فرما رہے تھے کہ

ملک ترقی کی منازل بڑی تیزی سے طے کر رہا ہے۔ کچھ ایسے ہی الفاظ تھے یا مفہوم اس سے ملتا جلتا۔ وہ سمجھ نہ پایا کہ حقیقت ہے یا خواب۔ وہ کیوں اس تیز رفتار ترقی کے سفر میں پچھڑ کر محض ڈھول چاٹنے کو رہ گیا؟؟ گویا قصور اس کا اپنا ہوا کہ ترقی کی جانب گامزن حکمران قافلے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل نہ سکا......

انہی لایعنی سوچوں کے ہجوم میں ایسا کھویا کہ پتا ہی نہ چلا اور مریڑ چوک تک کا سفر تمام ہو گیا۔ غفران نے اس کو نشست سے اٹھنے کو کہا۔ دونوں نیچے اُتر آئے۔ حسن علی، میٹرو ٹریک کا عظیم الشان اسٹرکچر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ غفران اس کی محویت میں مخل نہ ہوا اور پاس کھڑا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ حسن علی بار بار ایک پلر سے دوسرے تک اور اُن پر بچھے مضبوط لنگل پر نگاہیں دوڑا رہا ہے۔

اپنے دوست کی طرف متوجہ ہوئے بغیر ڈوبی ہوئی آواز میں بول پڑا: "یہ ایک پلر سے تیسرے یا زیادہ سے زیادہ چوتھے تک جتنا سٹرکچر کھڑا ہے، اس سے ہمارے دریا پر ایسا پل بن سکتا تھا، جس پر ہیوی ٹریفک دن رات چلتی رہتی اور کوئی حادثہ پیش آتا اور نہ مریض بغیر علاج کے مرتا۔"

ooo

خارزار

جہاز سے اُتر کر طارق محمود، اس کی بیوی، ماضی کی کیتھرین اور حال کی آمنہ، ان کی آٹھ سالہ بیٹی آمنہ اور دس سالہ حسنہ نے اپنے خوابوں کی سرزمین پر بسم اللہ پڑھ کر قدم رکھے اور کلمۂ شکر ادا کیا۔ ماں بیٹیوں نے عین شریعت کے مطابق، عبایہ اور حجاب سے اپنے بدن اور چہرے چھپا رکھے تھے۔ ان کے دل جوش اور جذبے سے لبریز ہو گئے۔ تینوں، یعنی بیوی اپنے شوہر اور بیٹیاں اپنے باپ کے آبائی وطن کی زمین پر چل رہی تھیں، جس کے بارے میں طارق محمود کی زبانی اتنا کچھ سن رکھا تھا کہ نہ صرف جانا پہچانا محسوس ہوا کرتا بلکہ ذہنی طور پر اسے ہی اپنا اصل گھر تسلیم کر لیا تھا۔ طویل عرصے سے یہاں آنے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ ایمان کی روشنی میں یہ باور کر لیا تھا کہ پاک سرزمین پر ہی وہ صحیح معنوں میں دینِ مبین پر عمل پیرا ہو کر زندگی بسر کر سکتی ہیں۔

انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے لاؤنج اور باہر پارکنگ میں مقامی خواتین میں سے بیشتر کو جدید لباس پہنے دیکھ کر ماں بیٹیوں کو حیرت ہوئی۔ آمنہ نے مایوس ہو کر باپ سے پوچھ لیا کہ ہماری ان مسلم بہنوں نے چہرے بھی نہیں چھپا رکھے۔ ان کو کسی نے کیوں نہیں بتایا کہ عورتوں کو پردے میں رہنے کا حکم ہے۔ بیٹی کو دوٹوک تشفی آمیز جواب دینے

کی بجائے، طارق محمود دُور اَز کار تاویلیں پیش کرنے لگا کہ کس طرح بعض لوگ نام کے مسلمان ہوتے ہیں۔ اسلامی ملک کے شہری ہوتے ہوئے بھی شریعت پر پوری طرح عمل نہیں کرتے۔ یہ ان کی بدقسمتی ہے اور سچے مومن کا یہی امتحان ہے کہ وہ ایسے معاشرے میں بھی دامن بچا کر چلے۔ جیسے آپ کی والدہ، مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد پوری کی پوری دینِ حق میں داخل ہوئیں، یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔ اللہ نے ان کو توفیق دی، انھوں نے اپنا دل و دماغ روشنی سے بھرلیا۔ جس کا باطن منور ہو جائے، اُس کو تاریکی میں بھی راستہ بھائی دینے لگتا ہے اور خارزار سے دامن بچا کر نکلنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ آپ دونوں بہنوں نے زندگی بھر اپنی والدہ محترمہ کے کردار وعمل کی پیروی کرنی ہے۔

پندرہ برس پہلے دیارِ غیر میں طارق محمود اور کیتھرین کی ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں ایک ہی ادارے میں ملازمت کرتے تھے۔ طارق کی مہذب گفتگو، شرافت اور کردار کی مضبوطی نے کیتھرین کو بہت متاثر کیا۔ وہ اُن دنوں تیس چوبیس سالہ انتہائی پرکشش اور بھرپور جوان خاتون تھی، طارق سے عمر میں صرف ایک ڈیڑھ سال چھوٹی۔ اس عام سے قبول صورت مرد کی محبت میں ایسی گرفتار ہوئی کہ ہر قیمت پر شریکِ حیات بننے کی خواہش کا برملا اظہار کر دیا۔ اس کے ہم وطن دوستوں اور خصوصاً والدین نے حوصلہ افزائی نہ کی، بلکہ تحفظات سے آگاہ کرتے ہوئے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کا مشورہ دیا۔ ماں نے سوال کیا کہ اُسے ایک غیر مذہب کے ایشین میں ایسی کون سی خوبی نظر آ گئی، جو ایسے انتہائی اِقدام سے رجوع کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہی۔ ایک عام سے تارکِ وطن کے ساتھ ازدواجی رشتہ جوڑنا درست نہیں۔ کیتھرین نے ماں سے کہا تھا کہ اس نے طارق کی آنکھوں میں جو حیا دیکھی ہے، وہ آج تک کسی مرد میں نظر نہیں آئی۔ اور انسان کی آنکھیں ایسا آئینہ ہوتی ہیں، جس میں اُس کے باطن کا صحیح عکس دکھائی دے جاتا ہے۔ طارق کا باطن بالکل صاف شفاف ہے۔

طارق نے کیتھرین سے مزید چند مہینوں کی مہلت مانگ لی اور اُس کو مشورہ دیا کہ وہ اِس عرصہ میں اچھی طرح سوچ لے۔ مذہب تبدیل کرنے کے ساتھ ہی خود کو یکسر بدلنا پڑے گا، جو اتنا آسان نہیں ہوتا۔ عقیدے کے ساتھ مخصوص ثقافت جڑی ہوتی ہے، جس کو اپنانا، کڑے مجاہدے کے مترادف ہے۔ شریعت، حدیث، سیرت اور اللہ کی کتاب کے مستند انگریزی تراجم پر مشتمل کُل چار کتب بھی مطالعہ کے لیے دیں، جو اُس نے بصد شوق شکریہ کے ساتھ قبول کرلیں اور بغور مطالعہ کرنے کا وعدہ کیا۔

پہلی ملاقات کے ٹھیک دس مہینے اور تیرہ دن کے بعد کیتھرین نے نئے مذہب اور نئے نام کی شناخت سے شریعتِ محمدیؐ کے مطابق نکاح کرلیا۔ اس نے طارق کے تجویز کردہ مختلف اسلامی ناموں میں سے اپنے لیے ''آمنہ'' ہی پسند کیا تھا۔ آمنہ نے پوری نیک نیتی سے دین اسلام کو قبول کیا اور پوری کی پوری اس میں رنگی گئی۔ عربی صرف اتنی ہی سیکھ سکی کہ کلمے، نماز اور چند آیات، خوب یاد کرلیں۔ البتہ مذہب کا مطالعہ انگریزی کتب کے ذریعے بدستور ذوق وشوق سے کرتی رہی۔ نکاح سے پہلے ہی ملازمت چھوڑ دی اور صحیح معنوں میں خاتونِ خانہ بن کر رہ گئی۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے عرصے میں اس قابل ہوگئی کہ روزمرہ کی گفتگو اردو اور شوہر کی مادری زبان میں کرنے لگی۔ پہلی اور پھر دوسری بیٹی پیدا ہوئی۔ دونوں کی تربیت عین اسلامی تقاضوں کے مطابق کی۔ انھیں، مادری اور پدری، دو تین زبانوں میں مہارت حاصل ہوئی۔

میاں بیوی نے خوب غوروخوض کے بعد باہمی مشاورت سے فیصلہ کرلیا کہ بیٹیوں کو عنفوانِ شباب میں قدم رکھنے سے پہلے ہی اِس مادر پدر آزاد معاشرے سے نکال لے جایا جائے، وہاں، جہاں شرم وحیا کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھنے کا چلن ہے۔ تاکہ ان کو آئندہ کی زندگی، شریعت کے تابع رہ کر گزارنے کے لیے سازگار ماحول میسر آسکے۔

گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں طارق محمود چند ایک بار ہی مختصر عرصے کے لیے وطن آسکا تھا۔ تاہم بیرونِ ملک سے بھیجی ہوئی رقوم کے عوض، دونوں بڑے بھائیوں نے آبائی شہر کے جدید ایریا میں ایک کنال کے پلاٹ پر کوٹھی تعمیر کروا رکھی تھی اور ٹیکس فری زون میں قائم انڈسٹریل اسٹیٹ میں فیکٹری لگا رہے تھے۔ کوٹھی اس کے نام تھی لیکن اس کی اجازت سے دونوں بھائی مع اہل و عیال اُس میں رہائش پذیر تھے۔ تاہم فیکٹری میں طے شدہ معاہدے کے مطابق نصف کا مالک طارق اور باقی کے نصف میں دونوں بڑے بھائی برابر کے شراکت دار قرار پائے تھے۔

طارق اور آمنہ اس اطمینانِ قلب کے ساتھ وطن لوٹ رہے تھے کہ رہنے کو کشادہ پُرآسائش گھر ہے اور پانچ چھ مہینوں تک فیکٹری سے بھی معقول آمدنی ہونے لگے گی۔ بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ یہاں اُن کے لیے مناسب رشتے ملنے کا مسئلہ نہیں بنے گا۔ باقی کی زندگی دونوں میاں بیوی سکون آرام سے بسر کریں گے۔ جاری تعلیمی سال اختتام پذیر ہونے کو ہے۔ دونوں بھتیجیوں کو یونیورسٹی بہت نزدیک پڑتی ہے۔ ایم اے کے امتحانات دیتے ہی اُن کی رخصتی ہے۔ دونوں کنبے فوراً بعد کوٹھی خالی کردیں گے۔ بھائیوں نے آبائی گھر کی مرمت اور رنگ روغن کروا کر ٹیلیفون کنکشن بھی لگوا دیا ہے۔ تمام سہولتیں مہیا کر دی ہیں۔ وہاں اس چار افراد پر مشتمل کنبے کو صرف تین ماہ کا عرصہ گزارنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

ایئرپورٹ پر ظہیر اور زبیر بھائی انھیں لینے کے لیے بڑی آرام دہ، نئی جیپ ''لائٹ ایس'' لائے ہوئے تھے، جس میں سارا سامان آسانی سے سما گیا۔ قیمتی والا گاڑی کے پچھلے حصے میں تو باقی کا اوپر رکھا گیا۔ چاروں آسودہ ہو کر بیٹھ گئے۔ بڑے بھائی نے فرنٹ سیٹ سنبھالی اور منجھلا، زبیر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ قانون کا احترام کرنا، شروع سے ہی طارق محمود کے مزاج کا فطری خاصہ رہا تھا۔ قواعد وضوابط کی کبھی خلاف

ورزی نہ کی اور حق بات پر مضبوطی سے ڈٹ جایا کرتا۔ اپنے ہم وطنوں کے بارے میں یہ نہ بھولا کہ بندۂ خدا کوئی کوئی اور بندۂ زر اوپر سے نیچے تک ہر کوئی۔ اس مرتبہ بھی کسٹم کلیئرنس کے مرحلے پر بیچ بچ ضرور ہوئی مگر وہ کسی کے بھتّے میں نہ آیا۔ متعلقہ اہل کار ہاتھ ملتے ہی رہ گئے کہ اتنی موٹی مرغی صرف بلند آہنگ کڑکڑاہٹ پر صاف بچ نکلی۔ طارق کا دل جلنے لگتا کہ اپنے ملک کے لوگ اخلاق طور پر دیوالیہ ہو گئے ہیں۔ ہر جائز ناجائز طریقے سے مال کمانے یا دوسرے کا اُڑانے، کھینچنے اور مارنے کو ہر ہتھکنڈا آزمانے پر ہر دم تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔

ان دنوں ملک کے زیادہ تر حصے سرِ شام ہی دھند کی لپیٹ میں آ جاتے اور جوں جوں رات ڈھلتی، اس میں اتنی شدت آتی کہ چند گز آگے تک کا منظر صحیح طور پر دکھائی نہ دیتا۔ جی ٹی روڈ پر احتیاط سے سفر جاری رہا۔ مہمان مسافر جلد ہی سو گئے۔ ہڑبونگ مچنے اور طارق کی کنپٹی سے ریوالور کی یخ بستہ نالی چھونے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ گاڑی، جی ٹی روڈ کے ایک پرانے متروک ویران ٹکڑے پر لا کر روک دی گئی تھی۔ آمنہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھی اور شوہر کو اسلحہ کی زد پر دیکھ کر اس سے لپٹ گئی۔ پیچھے بیٹھی دونوں بچیاں رونے لگیں۔ ایک پسٹل بردار اگلی سیٹ کا دروازہ کھولے پائیدان پر کھڑا نظر آیا اور تیسرے نے ہو بہو اسی طرح ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھول کر زبیر کی گردن پر پسٹل کی نالی رکھی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تین بندوں نے سارا سامان اتار کر پیچھے کھڑی پک اپ میں رکھ لیا۔ طارق کی جیبیں خالی کیں اور تینوں ماں بیٹیوں کے ہینڈ بیگ بھی چھین کر لے گئے۔ ڈاکوؤں نے اُونی مفلروں سے چہرے چھپا رکھے تھے اور اُن کے سروں پر پولیس کی ٹوپیاں تھیں۔ جاتے ہوئے لائٹ ایس کے اگلے دائیں ٹائر کو گولی مار کر پھاڑ گئے۔

بڑے ارمانوں سے نئے وطن کو اپنانے کی غرض سے آنے والی ماں بیٹیوں کو

اس صدمے نے دہلا کر رکھ دیا۔ طارق نے گاڑی کی سپنی لگتے ہی بھائیوں سے تھانے چلنے کو کہا۔ وہ سمجھانے لگے کہ رپورٹ درج کرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ مزید مالی بوجھ پڑنے کا امکان ہے۔ ضروری نہیں کہ ڈاکوؤں نے پولیس کی جعلی وردیاں پہن رکھی ہوں۔ گویا اُن کے اصل ڈاکو اور اصل پولیس اہل کار ہونے کے امکانات برابر برابر ہیں۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ اِس مالی نقصان کو برداشت کر لیا جائے۔ لیکن طارق محمود نہ مانا اور وہ لٹا پٹا قافلہ تھانے پہنچ گیا۔

ڈیوٹی پر موجود ہیڈ کانسٹیبل نے طارق سے شروع میں چند سوالات کیے لیکن فوراً ہی ساری تحقیق اور تفتیش کا رُخ دونوں بھائیوں کی طرف موڑ دیا۔ طارق کو حیرت ہونے لگی۔ ظہیر، ہیڈ کانسٹیبل سے اُلجھ پڑا اور کہا کہ وہ ایسے سوال کر رہا ہے، جیسے ہم نے ہی اپنے بھائی کو لُوٹا ہے۔ زبیر نے ہیڈ کانسٹیبل کے اِس سوال کے جواب میں کہ رات کے وقت، مخصوص پولیس ناکوں کے علاوہ ویران جگہ پر گاڑی کھڑی ہی کیوں کی تو جواب دیا: "ڈاکوؤں کی پک اَپ بالکل پولیس موبائل جیسی تھی اور وہ تقریباً آدھی سڑک روکے کھڑی تھی۔ تین وردی پوشوں نے گاڑی کے آگے آ کر ٹارچوں سے روشنی ڈالی اور رُکنے کا اشارہ دیا تو میں نے بریک لگا دی......"

ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا کہ اُن دونوں بھائیوں سے ڈاکوؤں نے کیا چھینا؟ زبیر اور ظہیر دونوں نے کہا کہ جو بھی نقدی تھی، وہ انھوں نے لے لی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے خود اٹھ کر دونوں کی پوری طرح جامہ تلاشی لی اور دو اہل کاروں کو ہمراہ لیے باہر آ گیا۔ گاڑی کو اندر سے دیکھا اور اگلی دونوں نشستوں کے نیچے جھانکا۔ میٹ اٹھا کر چھوٹا سا دستی بٹوا برآمد کر لیا، جس میں نقد رقم کے علاوہ دونوں بھائیوں کے شناختی کارڈ، زبیر کا ڈرائیونگ لائسنس اور گاڑی کی رجسٹریشن بُک بھی تھی۔ وہ بوکھلا کر متضاد بیان دینے لگے کہ زیادہ رقم دونوں کی جیبوں میں تھی، جو ڈاکوؤں نے نکال لی۔ پرس میں ضروری کاغذات اور دو

تین ہزار روپے ڈال کر گھر سے نکلتے ہی احتیاطاً میٹ کے نیچے چھپا دیے تھے، جن کے بارے میں بتانا یاد نہ رہا۔

ایسی گنجلک صورتِ حال پیدا ہوئی کہ طارق محمود کا سر چکرا گیا۔ اُس کو اعتبار نہ آیا کہ بڑے بھائی ہی اس کے خلاف کسی سازش کے مرکزی کردار ہو سکتے ہیں۔ وہ دونوں اس سے شکوہ کرنے لگے کہ اسی لیے پولیس اسٹیشن آنے سے منع کیا تھا۔ یہاں اُلٹا مظلوم کو ہی ظالم بنا دیا جاتا ہے۔ ظہیر نے یک طرفہ فیصلہ کرتے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا: ''حوالدار صاحب! ہم نے رپورٹ درج ہی نہیں کروائی۔ آج خود تجربہ کر کے دیکھ لیا۔ پہلے صرف سنا کرتے تھے کہ ہماری پولیس مقتول کے گھر والوں کو ہی شاملِ تفتیش کر لیتی ہے، تاکہ مال بنایا جا سکے......''

حوالدار کچھ زیادہ ہی دبنگ شخصیت ثابت ہوا۔ بول پڑا: ''بالکل صحیح سنتے رہے ہو۔ گھر سے ہی قاتل ثابت بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسی رُوحیں ویسے فرشتے۔ جیسے عوام ویسی پولیس۔ یہاں اس ملک میں سگے باپ اپنے پردیس گئے بیٹوں کو لوٹنے سے باز نہ آئے، تم دونوں تو بھائی ہو اور وہ بھی برادرانِ یوسف۔ پرچہ درج نہ کروانے کی پچیس ہزار روپے فیس دینا ہو گی۔ پولیس وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں بیٹھی ہوئی۔ اس کو بہت کام کرنے ہوتے ہیں۔ میں بھی رپورٹ لکھ رہا ہوں......''

وہ براہِ راست طارق سے مخاطب ہوا اور کہا: ''ہم معصوم بچیوں اور ان کی والدہ کو زیادہ دیر نہیں روکنا چاہتے۔ تینوں باپردہ ہیں۔ اتنا لمبا سفر اور پھر شاک۔ انھیں فوراً گھر لے کر جائیں......'' ظہیر کی طرف اشارہ کر کے بولا: ''یہ بطور ضمانت ہمارے پاس رہے گا۔ اس کا بھائی ہماری فیس لے آئے اور اس کو لے جائے۔ آپ کا ذاتی معاملہ ہے، نقصان برداشت کرنا چاہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ ویسے یہ دونوں بھائی ڈرائنگ رُوم میں پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر ساری کہانی بتا دیں گے۔ لہٰذا آپ

کے حق میں یہی ہے کہ رپورٹ درج کروائیں۔" حوالدار نے امتحانی گتے میں سفید کاغذ لگا کر اوپر قلم رکھا اور طارق کی طرف بڑھا کر بولا: "درخواست لکھیں! بخدمت جناب ایس ایچ او صاحب...... میں مختصراً لکھواتا ہوں......"

طویل سفر کی تھکن اور صدمے سے نڈھال، ماں بیٹیاں، نیند پوری نہ ہونے سے اَدھ موئی ہوئی پڑی تھیں۔ گھر پہنچ کر ناشتا کرتے ہی سو گئیں۔ طارق کے بزرگوں میں صرف سگی پھوپھو ہی رہ گئی تھی۔ بیوہ اور نادار خاتون، جس کو طارق ہی باقاعدگی سے خرچہ بھیجتا رہا تھا۔ اُس نے ایسا انکشاف کیا کہ بھتیجے کو ہلا کر رکھ دیا۔ کہنے لگی: "میرے بچے! تیرے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ بات ایسے ہی نہیں اُڑی کہ کوٹھی اور فیکٹری دونوں بھائیوں نے اپنے نام لگوا رکھی ہے۔ دفتروں کا ریکارڈ چیک کرواؤ۔ خود جاؤ، کسی کا اعتبار نہ کرنا۔ تم نے دونوں خالسوں کو مختار نامہ بھی لکھ دیا تھا۔ اللہ جانے کیا کیا ہیرا پھیری کی ہے۔ ان کی اولاد بھی علی الاعلان کہتی پھرتی ہے؟ کون چاچا؟ کوٹھی اور فیکٹری ہماری ہے۔ گوری سے شادی کر لی، اب گوروں کے دیس میں رہے، یہاں کیا لینے آئے گا؟"

بات کھلنے پر آئی تو سال مہینے یا دن نہیں لگے، گھنٹوں میں کھلتی چلی گئی۔ دونوں بھابیاں جوان بیٹیوں کے ہمراہ آ کر ایک لحاظ سے حملہ آور ہو گئیں۔ عذر تراش لیا کہ اس نے آتے ہی دونوں بھائیوں کو پھنسانے کی پوری کوشش کی۔ وہ تو قسمت اچھی رہی کہ پولیس کو رشوت دے کر عزت بچالی۔

شہر کے ترقیاتی ادارے اور انڈسٹریل اسٹیٹ کے ریکارڈ میں سرے سے طارق کا نام ہی نہیں تھا۔ وہ تھانے گیا تاکہ باقاعدہ رپورٹ درج کروائے۔ چھوٹے بڑے عملے نے پروں پر پانی نہ پڑنے دیا۔ شور شرابا کر کے ایس ایچ او سے ملا لیکن اُس نے یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ گھریلو جھگڑوں میں پولیس کو اُلجھانے کی بجائے، آپس میں مل بیٹھ کے معاملات سیٹل کیے جائیں۔

طارق محمود کی قوتِ ایمانی بروئے کار آ گئی کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونا چاہیے۔ مسئلہ یہ بن گیا کہ تمام تر دستاویزات، خواہ وہ جعلی تھیں یا اصلی، لوٹے گئے سامان میں چلی گئیں۔ پاسپورٹ، زیورات، پونڈ اور سب کچھ۔ لباس بھی صرف وہی رہ گئے، جو تن پر تھے۔ پرکھنے کو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ بھائی کھل کر سامنے آ گئے اور صاف کہہ دیا کہ اُس نے دونوں کو تھانے میں ذلیل کروایا، لہٰذا اب وہ ایک روپیہ بھی دینے کے روادار نہ ہوں گے۔ اس مشکل گھڑی میں بہنوئی، محمد سلیمان ساتھ چل پڑا۔ اکلوتی بہن کا شریکِ حیات، شہر کی سیاسی بساط کا اہم مہرہ اور موجودہ چیئرمین زکوٰۃ کمیٹی۔ گو کہ بہن کی اپنے شوہر سے کبھی نہ بنی۔ بھائی کو دبے لفظوں میں بیچ کے رہنے کی تلقین کر گئی۔ لیکن اس کی مجبوری تھی کہ کوئی مشورہ دینے والا بھی نہ تھا۔ سلیمان سے ادھار رقم پکڑ لی تاکہ روزمرّہ کا خرچ جیب میں ہو۔ اسی کی مدد سے ایس ایس پی کو جا ملا اور متعلقہ پولیس اسٹیشن کے حوالے سے ساری رُوداد گوش گزار کر ڈالی۔

ایف آئی آر درج کر لی گئی اور ایس ایس پی نے اس کیس کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے تفتیش ایک اچھی شہرت کے حامل سب انسپکٹر کے سپرد کرتے ہوئے کہا: "اوورسیز پاکستانی کی جائیداد ہڑپ کرنے کا سنگین جرم ہوا ہے۔ اس کی نومسلم بیوی نے ہم لوگوں کے بارے میں بہت بُرا تاثر لیا ہوگا۔ ڈاکے کی اصلیت کُھلنے سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ کیس ہمارے لیے چیلنج سے کم نہیں......"

دونوں بڑے بھائیوں نے ضمانتیں کروائی تھیں، تاہم اُنھیں شاملِ تفتیش کر لیا گیا۔ طارق نے ایک وکیل کے ذریعے سول عدالت میں کوٹھی اور فیکٹری کی بازیابی کا دعویٰ بھی دائر کر دیا۔ اُس نے تمام رقوم قانونی طریقے سے بذریعہ بینک بھیجی ہوئی تھیں۔ صرف یہی ایک ثبوت تھا جو متعلقہ برانچ سے بآسانی حاصل ہو گیا۔ جج نے ظہیر اور زبیر سے دوٹوک کہا: "انکم ٹیکس کا ریکارڈ لے آؤ۔ تم دونوں کی آمدن ثابت ہو گئی تو

ٹھیک ورنہ عدالت ایک دو پیشیوں میں فیصلہ دے ڈالے گی۔" مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی اور تفتیشی افسر نے ڈاکے کے اصل کردار گرفتار کر لیے۔ جن میں فیکٹری کے تین مزدور، ایک کلرک اور دو سیکیورٹی گارڈ تھے۔ کچھ سامان، اٹیچی کیس، ہینڈ بیگ اور پاسپورٹ بھی برآمد ہو گئے۔ تاہم زیور، کپڑوں اور فارن کرنسی میں سے کچھ نہ ملا۔ دونوں بھائیوں کی ضمانتیں منسوخ ہوئیں اور ہتھکڑیاں لگ گئیں۔ طارق محمود بظاہر جتنا مضبوط عقیدے کا حامل دکھائی دیتا رہا، حقیقت میں ایسا ثابت نہ ہوا۔ اُسی روز گھر آیا اور دل کا دورہ پڑنے سے چل بسا۔

ظہیر اور زبیر کے سسرال والے میدان میں آ گئے۔ ساتھ ہی ان دونوں کی بیٹیوں کے منگیتر کود پڑے۔ قرضہ حسنہ دینے کے حوالے سے بیان حلفی لکھے گئے اور جائیداد ہڑپ کرنے کی نیت سے وسیع پیمانے پر منصوبہ بندی ہونے لگی۔ آمنہ کو پیغام پہنچایا گیا کہ سپریم کورٹ تک مقدمہ بازی چلے گی۔ دورانِ تفتیش، ظہیر زیادہ سختی برداشت نہ کر سکا اور اُس نے بک دیا تھا کہ ڈاکہ اس لیے ڈلوایا تاکہ جعلی دستاویزات ضائع ہو جائیں اور جعل سازی کا کیس نہ بنے۔ علاوہ ازیں اپنے تئیں یہ باور کرلیا تھا کہ ایسی سنگین واردات سے دوچار ہونے پر بیٹیاں اور بیوی خوفزدہ ہو کر طارق کو فوری واپسی کے لیے رختِ سفر باندھنے پر آمادہ کرلیں گی۔ اُن کے پاسپورٹ اسی لیے محفوظ رکھے تھے کہ موقع پاکر کسی رات گھر کے صحن میں پھینک دیں گے۔

آمنہ اپنے تمام تر معاملات کا حل، دینی احکامات کی روشنی میں تلاش کرتی۔ جو بھی مسئلہ درپیش ہوتا، مرحوم شوہر کی دی ہوئی کتابوں اور قرآن پاک سے رجوع کرنا اس عورت کی پختہ عادت بن چکی تھی۔ بیٹیوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے پر فکرمند ضرور رہی۔ ذریعۂ آمدن ندارد ہونے سے نوبت فاقہ کشی تک آ گئی۔ بڑی خواری کے بعد ایک اکیڈمی میں انتہائی کم معاوضے پر کام مل گیا، جہاں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو روزمرہ

کی انگریزی بول چال میں ماہر کرنے کا فریضہ ذمے لگا لیکن اس عورت کا پردے کے شرعی احکامات پر سختی سے کاربند رہنا نہ صرف رُکاوٹ بن گیا بلکہ اس کا مذاق بھی اُڑایا جاتا۔ مقدمے کی پیروی بھی اسی لیے نہ کرسکی کہ بے پردگی ہوتی ہے اور مالی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔

گلی محلے کے لوگوں کو اس بے سروسامان اور منفرد مزاج کی بیوہ اور یتیم بچیوں سے دلی ہمدردی ہوگئی۔ اڑوس پڑوس کو خبر رہی کہ ماں بیٹیاں صبح کے وقت انتہائی معمولی ناشتا کر کے شام کے کھانے تک بھوکی رہتی ہیں۔ ایک تو اس آبادی کے زیادہ تر لوگ بھی تہی دست تھے، دوسرا اس عورت کی اَنا آڑے آجاتی۔ قرض لیتی نہ خیرات قبول کرتی۔ اکیڈمی سے ملنے والے حقیر معاوضے پر گزارہ چلتا رہا۔ رمضان المبارک کی آمد سے پہلے محمد سلیمان ملنے آ گیا۔ اس نے پردے میں رہتے ہوئے دروازے کے پیچھے سے آنے کا سبب پوچھ لیا تو وہ بولا: ''بھابھی صاحبہ! ہمارے دین میں اتنی سختی نہیں جتنی آپ نے اپنے اوپر روا رکھی ہوئی ہے۔'' وہ بولی: ''جی! ہم کو پتا ہے، دین میں سختی بالکل نہیں۔ ہم کو خود اس سے بہت خوشی ملا ہے......'' وہ کہنے لگا: ''آپ قرآن حدیث کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اس میں بے شک دیکھ لیں کہ زکوٰۃ پر آپ کا جائز حق بنتا ہے۔ میں زکوٰۃ کمیٹی کا چیئرمین ہوں۔ قانون یہ ہے کہ مستحق فرد کو بذریعہ چیک ادائیگی کی جائے۔ مگر میرے صوابدیدی اختیارات بھی ہیں۔ کمیٹی کے ممبران کی متفقہ منظوری سے زیادہ ضرورت مند کو نقد ادائیگی کرسکتا ہوں۔''

''بہت مہربانی بھائی صاحب!'' آمنہ نے محمد سلیمان کو ٹوک دیا اور بولی: ''ابھی ہم اکیڈمی جائے گا۔ واپسی پر زکوٰۃ کو اچھی طرح پڑھ لیں گا۔ آپ آنے کا تکلیف مت کرو، فون پر پوچھ لو۔ اللہ کے حکم کو ہم ضرور مانے گا۔''

محمد سلیمان نے کہا: ''ایک اور بات کہنا چاہوں گا کہ زکوٰۃ فنڈ کی رقم آپ کو

نقد مل جائے گی۔ اس کے علاوہ بہت سے اہلِ ثروت ہماری کمیٹی کے ذریعے امداد تقسیم کرتے ہیں۔ اس میں رمضان پیکج بنا ہوتا ہے۔ گھی آٹا چینی دالیں وغیرہ، بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ بھی لے آؤں گا۔ اس میں لینے اور دینے والے، کسی کا اجر کم نہیں ہوتا......" وہ جواب میں بولی: "جی بھائی صاحب! اللہ بہت رحیم ہے، اس کا ہم کو پتا ہے......"

اکیڈمی سے واپسی پر آمنہ نے بڑی توجہ سے زکوٰۃ کے احکامات کا مطالعہ کیا اور پوری طرح مطمئن ہوگئی کہ وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کو قبول کرنے میں کسی قسم کی قباحت نہیں۔ سلیمان کی فون کال آنے پر اس امر کی تصدیق کر دی اور کہا کہ وہ جس شکل میں چاہے، امداد لے آئے۔ فون بند کرنے سے پہلے جو آخری جملہ بولی، اُس کا مفہوم کچھ اس طرح کا تھا: "بھائی صاحب! یہ کارِ خیر جو آپ کرنے جا رہے ہیں، اس کا اجر صرف اللہ پاک سے مانگیے گا۔"

سلیمان اپنی ذاتی کار میں اچھا خاصا سامان رکھ کر لے آیا اور ڈیوڑھی کا دروازہ کھلوا دیا۔ ڈگی سے آٹے کا ایک تھیلا نکال کر خود اندر رکھا۔ اس کے بعد تین کارٹن باری باری اٹھا کر اندر لایا۔ آخر میں ایک بڑا سا پلاسٹک کا تھیلا اٹھائے ہوئے آ گیا۔ آمنہ پوری طرح پردے میں تھی اور کونے میں لگی کھڑی دیکھتی رہی۔ اُس نے چند ایک بار شکریہ کے الفاظ ادا کر دیے۔ سلیمان نے آخری تھیلا، کارٹن پر رکھتے ہوئے بتایا کہ اِس میں بسکٹ، مٹھائی، کھجوریں اور کچھ خشک میوہ جات ہیں۔ باقی کے تینوں کارٹنوں میں چاول، دالیں، چینی، پتی، گھی اور دودھ ہے۔ انشاءاللہ کوئی کمی نہیں آئے گی۔ میں ایک فون کال پر ہر وقت حاضر ہوں۔

جیب سے تہ کیے ہوئے ہزار روپیہ مالیت کے چند نوٹ نکالتے ہوئے سلیمان نے تین چار چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے اور آمنہ کے قریب آ گیا۔ دایاں ہاتھ، جس میں رقم تھام رکھی تھی، اُس کی طرف بڑھایا اور بولا: "یہ لیجیے...... اور جب بھی ضرورت

پڑے، صرف اشارہ کر دیجیے گا......" سلیمان کی آواز میں لرزش آ گئی تاہم اتنے میں آمنہ داہنا ہاتھ آگے بڑھا چکی تھی۔ نہ جانے کیا سوجھی کہ خاتون کو نوٹ پکڑانے کی بجائے بائیں ہاتھ سے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور رقم ہتھیلی پر رکھتے ہی اپنی ہتھیلی اُس پر جما دی۔ وفورِ جذبات سے لرزتی آواز میں بول پڑا: "اسلام میں اتنی سختی نہیں، جتنی آپ نے اپنے دماغ پر سوار کر رکھی ہے۔" ساتھ ہی اُس کے سراپا پر اوپر سے نیچے تک بڑی بھرپور فریفتہ نگاہ ڈالی۔ لبوں سے کچھ اِس طرح کی بےسکاری برآمد ہوئی، جس کے بارے میں شاید خود بھی نہ سمجھ پایا ہو کہ بےساختہ تھی یا شعوری کوشش کا شاخسانہ۔

بُت بنی کھڑی خاتون ذرا بھی مشتعل نہ ہوئی۔ اُس نے اپنا ہاتھ اِس صفائی سے کھینچ لیا کہ کرنسی نوٹ سلیمان کی بائیں ہتھیلی پر دھرے رہ گئے۔ ایک لفظ بولے بغیر آگے بڑھی۔ اُلٹے ہاتھ میں ڈرائی فروٹ والا تھیلا اٹھایا اور سیدھے ہاتھ کی انگلیاں ایک کارٹن کے گرد لپٹے سٹریپ میں پھنسا کر اٹھا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں چیزیں دروازے سے باہر رکھ دیں۔ اُسی لمحے سامنے والے گھر سے پڑوسن اور اُس کا جوان بیٹا نکل آیا۔ وہ دونوں اپنے گھر کی کھڑکی کا پردہ سرکا کر ڈیوڑھی کا منظر دیکھتے رہے تھے۔ سلیمان گنگ ہوا کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں آمنہ نے آٹے والا گٹو بھی فرش پر گھسیٹتے ہوئے گلی میں لا ڈالا۔ پڑوسن نے بیٹے سے دونوں کارٹن اٹھا کر باہر رکھنے کو کہا۔ اُس نے فوراً تعمیل کر دی۔ سلیمان کھکھیا کر بول پڑا: "آمنہ بہن! ایسا مت کرو۔ یہ اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے، آپ پر کوئی احسان نہیں......" اس اثنا میں وہ خود بھی باہر گلی میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اڑوس پڑوس کے چند اور مرد و خواتین بھی نزدیک آ گئے۔ آمنہ کچھ نہ بولی اور دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈیاں چڑھا لیں۔

اگلے روز صبح نو بجے ہی اہلکاروں سے بھری پولیس موبائل کے ساتھ ایک لینڈ کروزر آن کھڑی ہوئی، جس سے آمنہ کے آبائی وطن کے سفارتی مشن کی خاتون

کوارڈینیٹر نکلی۔ اُس کے ساتھ آئے محلے کے دو ارکان گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ ہر عمر کے مردوں اور عورتوں سے گلی بھر گئی۔ محلے کے معزز بزرگ حاجی ذکااللہ کی معیت میں دو ادھیڑ عمر خواتین اور دو ہی بوڑھے مرد، آمنہ سے ملنے آ گئے۔ معلوم ہو گیا کہ وہ اپنی بیٹیوں کے ہمراہ وطن واپس جا رہی ہے۔

حاجی ذکااللہ دل گرفتہ سے ہوئے بول پڑے: ''بیٹی! ہم تمہارے مجرم ہیں۔ بڑی کوتاہی ہوگئی۔ مرحوم طارق محمود کے ساتھ سراسر ظلم ہوا۔ ہمیں ہر حالت میں اُس کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ گلی محلے کے لوگ شرمندہ ہیں اور فضا سوگوار ہو گئی ہے۔ تم واپس مت جاؤ۔ ہم تمہاری فیکٹری اور مکان کا مقدمہ جیت کے دکھائیں گے۔ طارق مرحوم اپنی بیٹیوں کو جس خراب ماحول سے نکال لایا، اُس میں اِن معصوموں کو واپس مت لے جاؤ......''

آمنہ نے بڑے تحمل سے بات سنی اور کہا: ''جن بھائیوں نے مکان اور فیکٹری کے واسطے ایمان خراب کر لیا، اُن سے یہ چیز مت چھینو۔ انھوں نے بہت زیادہ قیمت دے دیا...... اور...... اور اُدھر ہمارے وطن میں بیٹی کو خطرہ نہیں۔ اِدھر بیٹی اور ہم کو بھی خطرہ ہے۔ وہاں جب عورت خود خرابی مانگتا، اُس کو برابر مل جاتا۔ یہاں جو عورت خرابی نہیں مانگتا، اُس کو بھی بہت لوگ زبردستی خرابی دیتا۔ ہم نے شادی سے پہلے طارق محمود کا آنکھ دیکھا۔ خوب جان گیا، نیکی والا اچھا آنکھ کیسا ہوتا۔ اِدھر اکیڈمی کا اونر...... اور...... اور بہت زیادہ لوگ...... وہ ہمارا ینگ میل اسٹوڈنٹس کا آنکھ دیکھا...... سب نہیں، تھوڑا زیادہ عورت کو خرابی دینے کے واسطے دیکھتا...... اچھا نہیں...... آئم سوری۔ سب اچھا ہو گیا۔ ہم کو ''خدا حافظ'' کا گفٹ دے دو...... اور فی...... ''فی امان اللہ'' کا گفٹ ہم بھی دیتا، آپ بھی دے دو۔''

ooo

اَلسّلامُ علیکُم

ان دنوں ایک بوڑھے سیکیورٹی گارڈ نے افتخار احمد کو بڑا پریشان کر رکھا تھا۔
اس کو دیکھتے ہی کھٹاک سے سلوٹ کرتا۔ اسی پر اکتفا کر لینے کی بجائے لپک کر قریب آتا اور نہ صرف زبان سے ''السلام علیکم'' کہتا بلکہ مصافحہ کرنا بھی ضروری سمجھتا۔ مسئلہ یہ بن گیا کہ گلی سے نکلتے ہی عین سامنے کی عمارت میں قائم عام سے انگلش میڈیم اسکول کے باہر اس سیکیورٹی گارڈ کی ڈیوٹی ہوا کرتی تھی، جس سے آنکھ بچا کر نکل جانا آسان نہ تھا۔ یقیناً اُس بے نوا شخص کو ایسی مجبوریوں کا سامنا ہوگا کہ صبح سے شام تک وہاں موجود پایا جاتا۔ دن بھر ٹریفک کے گزرنے سے اُس کی یونیفارم پر گرد پڑتی رہتی۔ یونیفارم بہت زیادہ پرانی اور ڈھیلی ہو جانے سے، گہرے نیلے رنگ کے کپڑے پر جا بجا ہلکے نیالے سے دھبے نمودار ہو گئے تھے۔ خصوصاً سلائی کے دھاگے نے اصل رنگ چھوڑ دیا اور کہیں کہیں سے ملگجے ٹانکے یوں جھانکتے دکھائی پڑتے، گویا میلے کچیلے دانت کسی کی بے بسی پر ہنس رہے ہوں۔
ممکن ہے، اس بوڑھے شخص کی جلد پیدائشی طور پر اتنی کالی نہ رہی ہو لیکن اب اُس کی رنگت، داڑھی اور سر کے سفید بالوں کے حصار میں جھلسی ہوئی دکھائی دیتی۔

اسکول گیٹ کے باہر کینوس کی بڑی سی چھتری کے نیچے کرسی ڈالے بے رحم موسموں کی زد پہ بیٹھا رہتا۔ ساتھ ہی اسٹول پر پانی کا کولر اور گلاس پڑا ہوتا۔ بارہ مرلے کے پلاٹ پر تعمیر شدہ مکان میں کھولے گئے اسکول کی حالت بھی سیکیورٹی گارڈ کی طرح زیادہ مستحکم نہ رہی ہوگی۔ چونکہ اس کی بیرونی دیوار پر لگائے گئے رنگ برنگے جھنڈوں کا کپڑا بھی یونیفارم کی مانند نہ صرف بوسیدہ ہوگیا تھا بلکہ کئی ایک پھٹ بھی گئے تھے۔ جب کہ نیلے رنگ کے جھنڈے کی ایک دھجی ذرا سی ہوا چلنے پر زور و شور سے اکیلی ہی پھڑ پھڑانے لگ جاتی۔

افتخار احمد کی مجبوری بن گئی کہ مارکیٹ اسی طرف تھی، لہٰذا سیکیورٹی گارڈ سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہا۔ وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگتا کہ اس سے بھی کہیں زیادہ عمر رسیدہ شخص بدترین حالات میں اتنی طویل اور جاں گزا مشقت کرنے پر مجبور ہے۔ وہ سوچا کرتا کہ کبھی اس ملک میں انسداد بے رحمی حیوانات کا محکمہ ہوا کرتا تھا، جس کی کارکردگی کے مظاہرے بھی دیکھنے میں آجایا کرتے تھے۔ اب عوامی حقوق کے تحفظ اور فلاح و بہبود کے تمام قومی ادارے نہ صرف غیر فعال ہوئے، بلکہ بدترین استحصال کی علامت بن چکے ہیں۔ ایک ایک حکمران اپنے مختصر دورِ اقتدار میں لاکھوں انسانوں کی زندگی بھر کا رزق لُوٹ کر لے جاتا ہے۔ حصہ بقدر جثہ کے مصداق، عوامی نمائندے اور سرکاری اہلکار بھی عوام الناس کے خون پر پل کر عفریت بن گئے ہیں۔ گویا اس ملکِ خداداد میں سیکیورٹی گارڈ جیسے لاکھوں کروڑوں انسان صرف عذاب بھگتنے کے لیے پیدا ہوئے۔

افتخار احمد کو یہ کھٹکا لگا رہا کہ سیکیورٹی گارڈ مناسب موقع پاتے ہی اپنی کوئی دل خراش غرض بیان کر کے اس کے محدود ترین مالی وسائل میں سے کچھ نہ کچھ لازماً بٹور لے جائے گا۔ چونکہ وہ اٹھاون سالہ زندگی میں اپنی فطرت کو اچھی طرح جان گیا ہے۔ جب بھی کسی نے درد بھری کہانی سنائی، وہ خود کو اُس کی مدد کرنے سے روک نہ پایا۔ اور

آج کل اپنی مالی حالت ایسی نہیں رہی کہ کسی کی مشکل گھڑی میں کام آ سکے۔ کوئی دل میں آس امید لے کر آ جائے تو انکار کرنے کے لیے موزوں الفاظ ہی نہیں ملتے۔ خود کو باور کرانے کی کوشش کر دیکھی کہ ممکن ہے، سیکیورٹی گارڈ فطرتاً خوش اخلاق ہو، چونکہ وہ اوروں کو بھی اسی طرح سیلوٹ سلام کرتے دیکھا گیا ہے۔ لیکن عمر بھر کے تجربے نے اس کی چھٹی حس کو خاصا چوکنا کر رکھا تھا اور جب بھی کوئی غیر معمولی عاجزی یا اپنائیت کا اظہار کرنے لگتا، بالآخر اس کا نتیجہ یہی نکلتا کہ اس کی جیب ہلکی ہو جاتی۔

دراصل ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد افتخار احمد کے ساتھ ایک طرح کا سانحہ پیش آ چکا تھا۔ جس پبلک سیکٹر کے معروف ادارے میں تیس سال ملازمت کی، اس سے پنشن کی بجائے یک مشت خاصی معقول رقم مل گئی۔ میاں بیوی نے سب سے پہلے گھر پر اتنا دل کھول کے خرچہ کیا کہ نیا سا بنا دیا۔ نیا فرنیچر اور الیکٹرانکس کا سامان لا کر تزئین و آرائش بھی خوب کر ڈالی۔ باقی کی رقم کے بارے میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ کسی کاروبار میں لگائی جائے تاکہ بقایا زندگی کے دن سہولت سے کٹ جائیں۔ میاں بیوی دونوں ہی حضرت صاحب کی عظمت کے قائل رہے اور مہینے میں دو بار اُن کی مجلس میں ضرور شریک ہوتے۔ مسند کے سامنے ہال میں مرد حضرات اور پردے کے پیچھے خواتین بیٹھ کر رُوح کو جلا بخشنے والی گفتگو سنا کرتیں۔ عمر کی تفریق سے قطع نظر، وہ سب مردوں کو دینی بھائی اور خواتین کو دینی بہنیں کہتے ہیں۔

عبدالصمد نامی دینی بھائی سے ان نشستوں میں کئی بار سامنا ہوا۔ پینتیس چھتیس سالہ اس دراز قد متناسب الاعضا خوش وضع گورے چٹے انتہائی چاک و چوبند اور با اخلاق سیاہ ریش جوان کے بے داغ لباس اور خاص طور پر مخصوص رنگ اور انداز کی پگڑی نے شخصیت کو غیر معمولی پُرکشش بنا دیا ہے۔ اس پر مستزاد، چہرے سے جھلکتی روشنی اور لبوں پر کھلی ہمہ وقت دوستانہ مسکراہٹ فوراً دل میں اُتر جاتی ہے۔ وہ ایک روز گھر

آ گیا۔ دل کش مسکراہٹ کے ساتھ ریشمی ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور نرم و ملائم لب و لہجے میں "السلام علیکم" کا کلمہ ادا کرتے ہوئے خیر و برکت کے اضافی جملے بولے۔ بلا جھجک کہا کہ اندر بیٹھ کر اطمینان سے بات کرنے کی غرض سے آیا ہے۔

بغیر کسی تمہید کے بولا: "حضرت صاحب نے فرمایا ہے کہ آپ روزگار کے سلسلے میں پریشان ہیں۔ مجھے حکم ہوا ہے کہ آپ کی مدد کروں۔ اُن کا خادمِ خاص اور آپ کا دینی بھائی ہونے کے ناتے میرا یہ فرض بنتا ہے۔ کاروبار کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ وہ بھی صرف ایک آئٹم کا تجربہ ہے۔ تلہ گنگ چکوال گوجر خان اور اردگرد کے علاقوں سے سیزن میں مونگ پھلی خرید کر کراچی لے جاتا ہوں۔ وہاں کے مقامی تاجروں کے علاوہ بڑی ایکسپورٹ کمپنیوں سے بھی مراسم ہیں۔ ایک ہزار ٹرک بھی لے جاؤں تو رتی بھر پریشانی نہیں ہوتی۔ ڈیمانڈ ہی اتنی زیادہ ہے۔ خوش قسمتی سے خریداری کا سیزن ابھی شروع ہی ہوا ہے۔ حضرت دنیاوی معاملات میں دلچسپی نہیں لیتے، صرف اشارتاً بات کیا کرتے ہیں۔ مجھ پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ فوراً سمجھ جاتا ہوں۔"

اُس نے اپنا اصلی شناختی کارڈ افتخار احمد کے سامنے میز پر رکھ دیا اور ویسٹ کوٹ کی دوسری جیب سے تعارفی کارڈ بھی نکال کر رکھا۔ کہنے لگا: "سوچنے کا زیادہ وقت نہیں۔ اس لیے کہ بیوپاریوں نے جُوں ہی رُخ کیا، ریٹ بڑھنا شروع ہو جائے گا۔ میری ذاتی غرض نہیں، صرف حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ اگر دل مانے، سو بسم اللہ، ابھی ساتھ کچہری چلیں۔ اشٹام پیپر پر معاہدہ لکھنا ہوگا۔ آپ کے سرمائے سے خریدے ہوئے مال پر منافع ہم دونوں میں برابر تقسیم ہوگا۔ رقم آپ مجھے چیک کی صورت میں دیں گے، تاکہ ثبوت رہے۔ آئندہ بھی ہر لین دین بذریعہ بینک ہوگا۔ دل نہ مانے، تو فی امان اللہ۔ میں بری الذمہ ہوا....." اُس کے لبوں پر کھلی دل فریب مسکراہٹ مزید گہری ہوئی اور شیریں لہجے میں بولا: "ایک ہی سیزن میں رقم تقریباً ڈیڑھ گنا ہو جاتی

ہے..... اور سو فی صد حلال منافع......"

معاہدہ ہو گیا۔ میاں بیوی نے باہمی مشاورت سے چھ ماہ کا گھریلو خرچ رکھ کر باقی رقم کاروبار میں لگا دی۔ وعدہ ہوا کہ نومبر دسمبر میں اصل سرمایہ اور منافع واپس آنا شروع ہو جائے گا۔ دینی بھائی کراچی جا کر بیٹھ گیا۔ جنوری فروری بھی گزر گیا۔ اب اُس نے موبائل فون کی سم ہی بدل ڈالی تھی، اس لیے کہ ہر بار یہی جواب ملتا: "آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں۔" حضرت صاحب نے معاہدہ لکھا جانے سے پہلے بھی صرف کامیابی اور خیر و برکت کی مختصر سی دُعا دی تھی، جسے افتخار احمد نے صدقِ دل سے آشیرباد سمجھ لیا اور اب جو اِس شریف النفس دینی بھائی کے لُٹ جان کی رُوداد سُنی، تو بھی صرف دعا ہی پڑھی: "إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔"

صرف ایک مہینے کا خرچہ بچا رہ گیا۔ میاں بیوی زیادہ وقت عبادت میں گزار دیتے۔ دونوں ایک دوسرے کو نہ بتاتے کہ وہ کیا دعائیں مانگتے ہیں۔ افتخار احمد باقاعدگی سے باجماعت نماز پڑھنے مسجد جانے لگ گیا۔ مارکیٹ کی طرف جانے کے خیال سے خدشہ سر ابھارتا کہ سیکیورٹی گارڈ کہیں مصافحہ کر کے ہاتھ تادیر تھامے نہ رکھے۔ حتی الوسع احتیاط برتنے کے باوجود اندیشہ درست ثابت ہوا۔ سیکیورٹی گارڈ گھر آ گیا۔ یاس اُمید کے بیچ ڈولتے خستہ حال طول بوڑھے کے ہاتھ سلوٹ اور مصافحہ کرتے ہوئے لرزتے رہے۔ "السلام علیکم" کہتے ہوئے زبان لڑکھڑا گئی اور بے ربط جملے بولتا گیا، جن کا لُب لباب کچھ یوں رہا: "کئی دنوں سے آپ نظر ہی نہیں آئے۔ آنکھیں گلی کی طرف لگی رہیں۔ مالک نے تھوڑی سی مدد کر دی۔ دراصل اُس کا کام گزارے لائق ہی رہ گیا ہے۔ اللہ بھلا کرے، سٹاف کی ساری ٹیچر لڑکیاں بڑی رحم دل ہیں۔ سب نے ایک چوتھائی تنخواہ دے دی۔ بچوں کے والدین نے بھی مہربانی کر دی، جو بھی جس کی توفیق تھی۔ دونوں بیٹیوں کی کل رخصتی ہے۔ روٹی کا خرچہ پورا نہیں ہو رہا۔ بڑی آس لے کر آیا

ہوں......"

بیوی نے میاں کو اندر بلا کر کہا: "اس کو خالی واپس لوٹا کر آپ زیادہ پریشان رہیں گے۔ گیس اور بجلی پانی کے بل ادا ہو چکے ہیں۔ تین چار ہزار روپے رکھ کر باقی کے دے دیں تاکہ آپ کو بعد میں پچھتاوا نہ ہو۔ مکان کا پورشن کرائے پر لگ جائے گا۔ جب تک کوئی مناسب کرائے دار نہیں ملتا، کسی نہ کسی طرح گزارہ کرلیں گے......"

میاں کو پرس میں سے رقم نکال کر دیتے ہوئے بولی: "پڑوسن کو ہماری ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں بہت پسند آئی ہیں۔ پوچھ رہی تھی، کہاں سے فرنیچر لیا ہے...... میرا مشورہ ہے کہ بیچ دیں۔ ہم دونوں نے کیا کرنا ہے؟"

ڈائننگ سیٹ کے بعد اگلے مہینے مائیکرو ویو اُون بک گیا۔ افتخار احمد زیادہ وقت مسجد میں گزارنے لگ گیا۔ مولوی صاحب نے خصوصی طور پر توجہ دی اور دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اُس نے اللہ کی طرف لو لگا کے بڑا اچھا کیا۔ انسان کا دنیا میں آنے کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ بندہ جب بھی گھر کو لوٹ آئے، غنیمت ہے۔ دیر آید درست آید......"

افتخار احمد کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ پریشان رہنے لگا کہ مولوی صاحب نمازیوں پر طائرانہ نظر دوڑاتے ہوئے، جوں ہی اس کو دیکھ لیتے ہیں، مسکراہٹ کا تحفہ دینا نہیں بھولتے۔ اور سامنا ہونے پر بڑی گرم جوشی سے سلام دعا کے ساتھ ساتھ بھرپور مصافحہ بھی کرتے ہیں۔ گویا یہ عنایات محض جذبۂ خیرسگالی تک محدود رہنے کی بجائے ایک اور کڑی آزمائش کا شاخسانہ بھی بن سکتی ہیں۔

مائیکرو کی فروخت سے آنے والی رقم میں سے صرف تین ہزار روپے بچ رہ گئے تھے۔ اگلی صبح، ہونی ہو کر رہی۔ تقریباً نو بجے مولوی صاحب گھر آئے، خوب اونچی آواز میں "السلام علیکم" کہا اور بولے: "دس دنیا ستر آخر۔" یعنی حاجت مند کو اللہ کی

رضا کے لیے دینے والے کو اِس دنیا میں دس گنا اور یومِ حساب کو ستر گنا ملے گا۔ یہ اللہ ربّ العزت کا وعدہ ہے۔ میرے والد صاحب قبلہ، سخت بیمار ہیں۔ اُنھیں فوری ہسپتال لے جانا ہوگا اور جیب خالی ہے۔"

افتخار احمد نے بیوی سے دو ہزار روپے لاکر مولوی صاحب کو دے دیے۔ وہ بولے: "میری تنخواہ میں گھر کا خرچہ بڑی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ آپ کے ہمسائے حاجی نصر اللہ صاحب، مسجد کمیٹی کے ممبر ہیں۔ اُن سے پوچھ لیں، میری تنخواہ کتنی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے خود کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہو، اُس کی جائز ضروریات کو پورا کرنا اسلامی معاشرے کے ہر فرد کا فرض بنتا ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

مولوی صاحب کو رخصت کر کے افتخار احمد نے یوں ہی دائیں طرف گردن موڑ کر دیکھ لیا تو حاجی نصر اللہ ہاتھ میں شاپنگ بیگ لٹکائے گلی میں آتے دکھائی دیے۔ پاس آتے ہی بغیر سلام دعا کیے بولے: "کتنے کا ٹیکہ لگا گیا ہے مولوی؟"...... افتخار احمد کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ وہ خود ہی دوبارہ بول پڑے: "میں آپ کو وارننگ دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا...... یہی کہنا تھا کہ محلے میں آپ ابھی تک بچے ہوئے تھے، کیونکہ باقاعدگی سے مسجد نہیں جاتے رہے...... خیر، ہزار دو ہزار سے زیادہ تو نہیں دیے؟" افتخار احمد نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

فرض عبادت کے ساتھ میاں بیوی نے وظائف و اوراد کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ آس لگی رہی کہ اللہ ربّ العزت کا وعدہ کسی لمحے یوں پورا ہو جائے کہ دینی بھائی، عبدالصمد اچانک لوٹ آئے۔ یک مُشت نہ سہی، بھلے قسطوں میں ہی ادائیگی شروع کر دے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ دنیا میں دس گنا ملنے کی صورت نہ بن پائی۔ زندگی مشکل ہوتی چلی گئی۔ اتفاق سے کرائے دار ایسے ملتے رہے، جو زیادہ عرصہ نہ ٹکتے۔ دو کی ترقی

ہونے پر دوسرے شہروں میں تبدیلی ہو گئی اور تین ان سے بھی زیادہ خوش قسمت رہے کہ یہاں سے براہِ راست ذاتی گھروں میں منتقل ہوئے۔

مکان کی بڑی مشہوری ہوئی کہ کرائے دار کے لیے بہت مبارک ثابت ہوتا ہے۔ لیکن مالک کو مکان کی نیک نامی راس نہ آئی۔ خالی وقفے آنے سے واحد ذریعۂ آمدنی میں نہ صرف تعطل آ جاتا، بلکہ نئے سرے سے صفائی ستھرائی، چھوٹی موٹی مرمت اور رنگ روغن پر اچھی خاصی لاگت آ جانے سے مالی مشکلات بہت بڑھ جاتیں۔ آخرِ کار مکان کی پیشانی پر لگے بورڈ کی عبارت بدل گئی اور ''پورشن کرائے کے لیے خالی ہے'' کی بجائے لکھا گیا: ''مکان برائے فروخت۔''

ooo

سایہ

ہاؤس جاب شروع کرنے سے پہلے میں چند روز کے لیے گھر آ گیا۔ رُوئے زمین پر خوبصورت وادیوں میں ایک ایسی وادی، جس کی آغوش میں ہمارا خاندان اور برادری نسلوں سے آباد ہے۔ اس حسین وادی پر دستاویزی فلمیں بنیں، فیچر لکھے گئے اور خصوصی ضمیمے شائع ہوئے۔ اس کے حسن کا جادو آج بھی سر چڑھ کے بولتا ہے۔ سرسبز وشاداب پہاڑوں میں گھری اونچی نیچی زمین کو دستِ قدرت نے بڑی فیاضی سے ہار سنگھار پہنائے ہیں۔ جھیل، شفاف پانیوں کے چشمے، ندی، انواع واقسام کے پھل پھول، سر بفلک درخت پودے اور مخملیں گھاس۔ انہی دلفریب مناظر میں بکھری ہوئی انسانی بستیاں، جہاں ہر دم ہر سُو چلتے صاف تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکے فطرت سے ہم کلام ہونے کی تحریک بیدار کرتے ہیں۔

کم سنی اور لڑکپن کے دور کی بات اور ہے۔ سن شعور میں یہ گتھی سلجھ جانی چاہیے تھی۔ آخر یہ ذہنی الجھاوا ہے کیا؟ اپنے سے کم وبیش آٹھ دس برس عمر میں بڑی شادی شدہ بال بچوں والی عورت کی مربیانہ شفقت کو آج تک صحیح تناظر میں سمجھ کیوں نہیں پایا۔ وادی میں صنفِ نازک کی غالب اکثریت کے چہرے اسی طرح دلکش ہوتے

ہیں۔ مُنزّہ کا رنگ رُوپ غیر معمولی پُرکشش ہی سہی لیکن یکتائے عصر بھی نہیں۔ پھر اُس کا خیال آنے پر انجانی سی خلش کیوں محسوس ہوتی ہے۔ بہت چھوٹے ہوتے کے بے چہرہ احساسات ہجوم کرنے لگتے ہیں۔ وہ میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے اٹھا لیا کرتی تھی۔ اپنے سر سے اوپر تک اُچھالتی اور ہنستے ہوئے دوبارہ تھام کر سینے سے لگا لیتی۔ میرے گالوں پر بوسہ دیتی۔ مجھے پھُول سے تشبیہہ دیا کرتی۔ اُس نے میرا نام ہی "پھول" رکھ دیا تھا۔ جب میں اسکول جانے لگا، اور میٹرک پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا، تب بھی اسی نام سے پکارتی تھی۔

اماں بڑے شوق سے مجھے اسکول کے لیے تیار کیا کرتیں۔ گھر سے باہر تک مجھے چھوڑنے آتیں۔ ڈیڑھ دو فرلانگ کی ڈھلان اُترنے تک اماں مجھے دیکھتی رہتیں۔ ندی کے پار دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ پچاس ساٹھ گز اوپر کی طرف چلنا پڑتا جہاں چشمہ پھوٹتا ہے اور قریب ہی منزہ کا مَیکا گھر ہے۔ وہ مجھے آتے ہوئے بلندی پر کھڑی یوں دیکھا کرتی، جیسے میرا انتظار کر رہی ہو۔ میری اماں کو ہاتھ ہلا کر جانے کا اشارہ کر دیتی۔ وہاں سے تقریباً ایک فرلانگ کی اُترائی میں سطح ہموار پر اسکول ہے، جہاں میں جایا کرتا تھا۔

واپسی پر وہ میری منتظر ہوا کرتی۔ تواضع کے لیے کچھ نہ کچھ رکھ چھوڑتی۔ کبھی بُھٹا تو کبھی مکئی کی میٹھی روٹی یا موسم کے مطابق دستیاب مقامی پھل۔ اماں نے مجھے تاکید کر رکھی تھی کہ گھر جلد پہنچوں اور ڈھنگ سے کھانا کھاؤں۔ لیکن مُنزّہ کی دل جُوئی کی خاطر منہ جھٹال لیا کرتا۔ البتہ پانی ضرور پیتا۔ براہِ راست چشمے کا پھوٹتا پانی اوک سے پینے کا مزہ آ جاتا۔

ایک مرتبہ اونچائی سے پھسل جانے پر میری ہتھیلیاں چھل گئی تھیں۔ اُن دنوں میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ مُنزّہ یوں دردمندی سے میرے ہاتھوں کا

ملاحظہ کرتی رہی، گویا اُس کے دل پر چوٹ لگی ہو۔نم آنکھوں سے مجھے دیکھے گئی۔ وہ گھر سے برتن لانے کو اُٹھی لیکن میں نے اُس کو روک لیا اور کہا کہ اپنے ہاتھوں کی اوک سے پانی پلا دے۔ میں آج تک اپنی اُس خواہش کی توجیہہ نہیں کر پایا۔ اُس نے بسم اللہ کا ورد ہی شروع کر دیا اور خوشی بخوشی اوک سے پانی پلانے لگی۔ وہ منظر آج بھی پوری جزئیات سے آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ شفاف پانی میں گلابی ریشمی ہاتھوں اور مخروطی انگلیوں کے ڈوبنے اُبھرنے اور میرے لبوں سے مس ہونے کا دلفریب منظر۔ وہ لمس لحۂ موجود میں محسوس ہونے لگتا ہے۔ اُس کے بار بار جُھکنے سے ایک اور اسرار کُھل گیا کہ وہ بھرپور جوان ہو چکی ہے۔ بے خیالی میں گریبان کو ڈوپٹے سے ڈھانپنے میں غافل ہو گئی تھی۔ وہ بسم اللہ پڑھتی گئی اور میں پانی پی پی کر اُپھر گیا۔ جی پھر بھی نہ بھرا۔

دور پار کا رشتہ دار اور برادری کا خوش اخلاق فرد ہونے کے ناتے صابر حسین مجھے کبھی بُرا نہ لگا۔ ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں سب سے خوش حال گھرانہ ہمارا ہی تھا۔ یتیم یسیر صابر اپنی بیوہ بہن اور اُس کی اولاد کے ہمراہ ہمارے گھر کے پچھواڑے ذاتی زمین میں بنے کچے پکے دیہاتی طرز کے مکان میں مقیم تھا۔ زمین اتنی بھی نہ تھی کہ چھ افراد پر مشتمل کنبے کی کفالت آسانی سے کر پاتا۔ اور پھر اُس پر دُھن سوار تھی کہ بیرونِ ملک سے ڈھیروں دولت کما کر لائے اور بہت عالی شان کوٹھی بنائے۔ مجھے کیا اعتراض ہوتا، خواہ وہ کتنا ہی امیر کبیر ہو جاتا، اگر اُس کی منگنی مُنزہ سے نہ ہوئی ہوتی۔ مجھے اُس بھلے مانس سے بلاوجہ ہی پرخاش ہو گئی۔ وہ مسقط چلا گیا اور میں بدستور بڑی محنت سے پڑھائی کرتا رہا۔

نویں جماعت میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے دس لڑکوں کا انتخاب کیا اور اساتذہ کو ٹاسک دیا کہ انھیں ابھی سے بورڈ کے امتحانات کی تیاری اِس عزم سے کروائی جائے کہ سبھی نہیں تو چند ایک ہی اعلیٰ پوزیشن حاصل کرلیں۔ ان لڑکوں کو اسپیشل گروپ کا نام دیا

گیا۔ میں یوں بھی اس گروپ میں نمایاں طالب علم تھا اور شروع سے ہی ہر سالانہ امتحان میں پہلی یا دوسری پوزیشن حاصل کرتا آ رہا تھا۔ ہمارے زیادہ تر اساتذہ بڑے مخلص تھے، خصوصاً سائنس ریاضی اور انگریزی پڑھانے والے۔ سائنس ٹیچر ماسٹر شریف صاحب نے گروپ کے لڑکوں کو اچھی غذا کی افادیت پر بڑا موثر لیکچر دیتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ہم اپنے اپنے گھر سے، جس حد تک ممکن ہو سکے، اچھے سے اچھا کھانا لایا کریں اور تفریح کے پریڈ میں خوب سیر ہو کے کھالیں تاکہ چھٹی کے بعد مزید دو گھنٹے تسلی سے پڑھائی کی جا سکے۔ اُنھوں نے مشورہ دیا کہ اگر ہو سکے تو آملیٹ اور دیسی گھی کا پراٹھا لایا کریں۔ انڈے کے خواص گنوائے اور بتایا کہ بصارت کے علاوہ دماغی تقویت کے لیے بہت مفید ہوتا ہے۔

ہمارے اُردو کے استاد ملک فضلِ حق خاصے نالائق تھے اور ماسوائے میرے، باقی قریباً تمام لڑکوں کی اس مضمون میں استعداد غیر تسلی بخش تھی۔ ماسٹر صاحب اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے طلبا پر بے جا سختی کیا کرتے۔ اگر کوئی طالب علم اُن سے کسی لفظ کا مطلب پوچھ لیتا اور وہ نہ جانتے ہوتے تو تیخ پا ہو جاتے۔ پٹائی کرنے کے ساتھ ساتھ بولتے جاتے: ''اُلو کے پٹھے، گدھے! کلاس روم میں دھیان سے سبق سنا کرو۔ کتنی بار پہلے بھی اس لفظ کا مطلب سمجھایا ہے۔'' تاہم جاننے کی صورت میں فوراً ہی بڑے شفیق اور مہربان استاد کا رُوپ دھار لیتے۔ شفقت آمیز لب و لہجے میں سمجھاتے اور آخر میں کہتے: ''شاباش! جو نہ آتا ہو، وہ ضرور پوچھا کرو۔''

ہمارے پچھواڑے صابر حسین نے عجیب نمونے کا گھر تعمیر کرایا۔ بتانے لگا کہ ابھی اصلی کوٹھی بنوانے کے وسائل جمع نہیں ہوئے۔ ایک بڑے سے کمرے کے اوپر کمرہ اور اُس پر کشادہ برساتی کا ڈھانچا دیکھ کر یوں گمان گزرتا جیسے کسی ریلوے جنکشن کا تین منزلہ سگنل روم ہو، جس کی کھڑکی سے ریلوے اہل کار سر نکالے ریل گاڑی کو سرخ یا سبز

جھنڈی دکھایا کرتا ہے۔ اُس کی مُنھنی کم تھی۔ دِنوں میں اسٹرکچر کھڑا کیا گیا تھا اور راتوں رات اندر باہر سے پلستر کروا کر عجوبہ تیار کر دیا۔ ہمارے گھر کی عقبی دیوار سے فاصلہ بھی کم تھا اور برساتی پر مشتمل تیسری منزل خاصی اونچی نکل گئی تھی۔ سفیدی ہوتے ہی اگلے روز مُنزّہ کو دُلھن بنا کر لے آیا۔ زبان زدِ عام تھا کہ اُس کو مُنزّہ سے مثالی محبت ہے۔ اعلان کر رکھا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے لیے ہر آسائش مہیا کرے گا۔ سُننے میں آیا کہ بڑے خوبصورت گہنے، قیمتی لباس اور ایسے ایسے تحفے لایا ہے، جو آس پاس کی بستیوں کی کسی نو بیاہتا کو شاید ہی نصیب ہوئے ہوں۔

میں دل برشتہ سا ہوا، شادی کی تقریب میں شرکت نہ کرنے کے بہانے تراشتا رہا لیکن والدین کو برادری کے رسم ورواج کی پاسداری عزیز تھی، لہٰذا اُن کی سرزنش سے بچنے کی خاطر دعوتِ ولیمہ میں چلا گیا۔ سوچ رکھا تھا کہ جلد ہی اُٹھ آؤں گا۔ لیکن صابر نے اتنی محبت دی کہ میں حیران رہ گیا۔ آگے بڑھ کر خندہ پیشانی سے گلے لگایا اور بولا: ''تم واقعی پُھول ہو۔ میں بھی آئندہ تمھیں اسی نام سے پکارا کروں گا۔ اور ہاں! میں رشتے میں تمہارا ماموں ہوں...... دل قریب ہوں تو دُور کا رشتہ بھی نزدیک ہو جاتا ہے۔''

اُس لمحے مجھے خیال آیا کہ اس شخص سے پرخاش رکھنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ شاید یہی میرا نصیب ہو، جو آج تک برابر ملتا آیا ہے۔ پیار بھرے بوسے اور گداز بدن کا لمس۔ اور بہت ممکن ہے کہ آئندہ بھی اِس پر قدغن نہ لگے۔ ہمارے علاقے کی یہ روایت قابلِ تحسین ہے کہ بزرگ خواتین وحضرات اپنے عزیزوں کو اپنی خصوصی شفقت اور محبت سے کبھی محروم نہیں کرتے۔ مقدر سے شکوہ سنج ہونے کی بجائے بندے کو شاکر اور قانع ہونا چاہیے۔ مثل مشہور ہے: شاکر کو شکّر اور موذی کو ٹکّر۔ میری شکّر وہی ہے، شکر ریزی میں والہانہ بوس وکنار۔

عجوبہ عمارت کی سیڑھیاں کچھ زیادہ ہی عجیب طرز کی بنائی گئیں۔ بغلی دیوار

سے لپٹی ہوئی پینتالیس درجے کا زاویہ بناتی اوپر کی منزل تک پہنچیں اور برساتی تک جانے کے لیے عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ اُسی زاویے سے اوپر چلی گئیں۔ ہوا اور روشنی کے لیے ہر دیوار میں جابجا کھڑکیاں رکھ دیں۔ میں اپنے کمرے میں پڑھائی کرتے ہوئے کھڑکی سے گاہے بگاہے اس عجوبہ پر نگاہ ڈال لیا کرتا۔ رات کو دیر تک پڑھتے ہوئے سنانے میں دبی دبی ہنسی کی آواز اور چوڑیوں کی کھنک سنائی دے جانے پر ذہن منتشر ہو جاتا۔ گیارہ بجے میری اماں نیم گرم دودھ کا پیالہ لیے آجاتیں اور اپنی نگرانی میں بلا کر بتی بجھا دیا کرتیں۔ حکم ہوتا کہ سو جاؤں۔

باطنی خوشی کی صوتی علامت کھنکھناتی ہنسی نقرئی گھنٹیوں کی سی اور کانچ کی جھنکار سن کر نیند کافور ہو جایا کرتی۔ ایسے موقع پر ماسٹر شریف صاحب کی بتائی ہوئی نیند لانے کی ترکیب پر عمل کیا کرتا۔ تصور میں دو تین میل نیچے ندی کے کھلے پاٹ کی ترائی میں ہری بھری گھاس چرتی سینکڑوں بھیڑوں کے ریوڑ کو یکسوئی سے دیکھنے لگتا۔ یوں لمحۂ موجود کے حقائق سے غافل ہوتے ہی نیند کا غلبہ ہو جاتا۔

چھٹی ختم ہونے پر جس روز صابر حسین صبح صبح گھر سے روانہ ہوا، اُس کے سسرالی اور دیگر رشتہ دار بھی رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ وہ گزشتہ روز فرداً فرداً ہر گھر میں الوداعی ملاقات کرنے آیا تو ہمارے ہاں خصوصی طور پر مجھے بلوایا اور بڑی گرم جوشی سے ملا تھا۔ ابھی میں نے اسکول جانے کی تیاری کرتے ہوئے دو تین بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تھا۔ اُس کو آہوں اور سسکیوں میں الوداع کیا گیا۔ دونوں بھانجے سامان اٹھائے لاری پر سوار کرانے سڑک تک ہمراہ گئے، جب کہ بیوی اپنے والدین کے ساتھ میکے چلی گئی۔

میں آج تک سمجھ نہیں پایا کہ اُس روز فضل حق صاحب کو زچ کرنے پر کیوں تُل گیا۔ وہ غلطیاں پہلے بھی کیا کرتے تھے۔ کئی بار میں نے موقع مناسب جانتے ہوئے

بڑے سلیقے سے اُن کی اصلاح بھی کر دی۔ لیکن وہ شاید ایک مُرادن تھا۔ اُس کی ابتدا ہی آنسوؤں اور آہوں سے ہوئی تھی۔ ماسٹر صاحب "جاں بر ہونے" کا معنی یکسر اُلٹ رہے تھے۔ "زندہ بچ رہنے" کی بجائے "مر جانے" کے معنوں میں تین بار بڑے وثوق سے جملہ دہرایا تو مجھ سے مزید صبر نہ ہو سکا۔ صحیح معنی بتانے پر قدرے جُزبُز ہوئے لیکن سنبھل گئے اور خِفت مٹانے کی غرض سے اور ایکٹنگ کرتے ہوئے بولے: "ہاں ہاں!! میں بھی کس خیال میں کھو گیا تھا۔" مجھے شاباش دی۔ ابھی نصف پیریڈ ہی گزرا تھا کہ ایک عام سا محاورہ "سُنی اَن سُنی کرنا" کو دو مرتبہ "سُنی اَن سَنی ایک کرنا" بول دیا۔ میں نے پھر توجہ دلائی۔ وہ نتھنے پھُلا کر کہنے لگے: "ایک ہی بات ہے، دونوں ٹھیک ہیں...... زیادہ سر پر سوار ہونے کی کوشش نہ کرو، پی ایچ ڈی صاحب!"

پیریڈ ختم ہونے سے چند منٹ پہلے ایک لڑکے نے "گُرسنہ چشم" کا معنے پوچھ لیا۔ ٹپٹا سے گئے۔ فوری خیال بھی آیا کہ وہی آزمودہ نسخہ آزمائیں گے۔ یعنی ڈانٹ ڈپٹ اور پٹائی کے ساتھ لعنت ملامت: "اُلو کے پٹھے، گدھے! کلاس رُوم میں دماغ حاضر رکھا کرو۔ کئی بار بتا چکا ہوں......" لیکن شاید دو مرتبہ خفیف ہونے پر کمزور پڑ چکے تھے اس لیے نیا فارمولا بروئے کار لائے اور بڑے اعتماد سے بولے: "بھیڑیے کی آنکھوں والے کو گُرسنہ چشم بھی کہتے ہیں۔" وہ "گُرگ" کو "گُرسنہ" سے خلط ملط کر رہے تھے۔ میری ہنسی چھُوٹ گئی۔ وہ غضب ناک ہو گئے۔ فوراً باہر نکلے اور دو تین منٹ بعد ہی ہاتھ میں تقریباً تین فٹ لمبی، ڈیڑھ دو انچ چوڑی موٹی سی کھردری چوبی پھٹی اٹھائے آ گئے اور بڑے سرد لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "اب مرد کا بچہ بننا اور چیخنا چلّانا نہیں۔ ہاتھ سامنے کرو۔ میں آج تمہاری پی ایچ ڈی نکالوں......"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے دونوں ہتھیلیاں سامنے کر دیں۔ ماسٹر صاحب پوری طاقت سے اور دیوانہ وار مشینی انداز میں دونوں جانب باری باری وار

کرنے لگے۔ ابھی چند ضربات ہی لگی تھیں کہ اچانک ہیڈ ماسٹر صاحب اندر داخل ہوئے۔ لڑکے کھڑے ہو گئے اور ماسٹر صاحب نے ہاتھ روک لیا۔ دونوں اساتذہ میں باہم نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ سینئر نے نظروں ہی نظروں میں جونیئر کو کیا پیغام دیا کہ وہ خاموشی سے چل دیئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے میرے زخمی ہاتھوں کو غور سے دیکھا اور دو لڑکوں سے کہا کہ مجھے سائنس لیبارٹری لے جائیں اور دوائی لگوائیں۔ ساتھ ہی مجھے چھٹی کرنے کا حکم دیا۔

لیب اسسٹنٹ، اسلم نے زخم اچھی طرح صاف کر کے دوائی لگائی اور دونوں ہاتھوں پر سفید پٹی لپیٹ دی۔ ماسٹر شریف صاحب نے ایک جار میں دو تین دوائیوں کا مکسچر بنا کر مجھے پلایا اور بولے: ''یہ دل کو طاقت دینے والی دوائی ہے اور درد بھی کم ہو گا...... جاؤ، شاباش! آرام کرو۔''

واپسی پر میرے دل میں عجیب لایعنی سی خواہش بیدار ہوئی کہ مترو مجھے اس حالت میں دیکھ لے۔ میں چشمے پر آ کر کھڑا ہو گیا اور اُس کے گھر کی طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اسکول میں ابھی چھٹی کا وقت نہیں ہوا لہٰذا وہ شاید اس طرف نگاہ نہ ڈالے۔ لیکن ابھی چند منٹ ہی انتظار کیا ہو گا کہ وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ پٹیوں میں لپٹے میرے ہاتھ دیکھ کر ٹھٹکی اور لپک کر کلائیوں سے تھام لیا۔ مضطرب ہو کر پوچھنے لگی اور آبدیدہ ہو گئی۔ میری بپتا سن کر ظالم استاد کو بددعائیں دیتے ہوئے رونے لگی۔ میں مبہوت ہوا اُس کو دیکھے گیا۔ زرق برق لباس اور طلائی زیورات پہنے وہ کسی اور دنیا کی مخلوق دکھائی پڑ رہی تھی۔ گوری کلائیوں میں سجی رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں ذرا سی حرکت ہونے پر بجنے لگتیں۔ اُس کے ہاتھوں پر رچا جا کا رنگ اتنا گہرا تھا، گویا تھوڑی دیر پہلے ہی مہندی ٹھرائی ہو۔ دو تین مہینوں میں ہی اُس کے حُسن کو چار چاند لگ گئے تھے اور وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ میں دیکھتا گیا اور

حیران ہو کر سوچتا رہا کہ پرستان کی پریاں آخر اس عورت سے زیادہ اور کیا خوبصورت ہوتی ہوں گی۔

میرے دل میں بڑی منہ زور اُمنگ بیدار ہوئی کہ اِن حنائی ہاتھوں سے پانی پیوں۔ وہ مجھے اپنے میکے گھر لے جانے کی ضد کرنے لگی تاکہ گرم دودھ میں دیسی گھی اور انڈہ پھینٹ کر پلائے لیکن میں نہیں مانا۔ مجھے رتی بھر پیاس نہیں تھی۔ اس کے باوجود پیاسا ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پانی پلانے کی التجا کی۔ غالباً اُس کو بھی اڑھائی برس قبل کا وہ اوک سے پانی پلانے والا دل آرا منظر یاد آ گیا تھا۔ بسم اللہ کا کلمہ پڑھتے ہوئے بیٹھ گئی اور مجھے بھی اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

تاریخ کے استاد چوہدری رحمت الٰہی صاحب، نصاب سے ہٹ کر بھی بڑی مزے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ سمندر کا سارا پانی پی جانے والے یونانی دیوتا کا قصہ انھوں نے ہی سنایا تھا۔ سورج کی کرنوں نے شفاف پانی کو چاندی چاندی کر رکھا تھا اور اس میں ڈوبتے ابھرتے حنائی ہاتھوں سے رنگ بکھرتے رہے۔ چوڑیوں کی جھنکار میں بسم اللہ کا ورد جاری رہا۔ سحر طاری ہو گیا مگر دیومالائی تشنگی عود کر نہ آئی۔ اوک خالی ہو جانے پر بھی میں اپنے منہ سے چھُونے والے اُس کے ہاتھ کے کنارے کو ہر بار ہونٹوں سے تادیر مس کیے رکھنے کی خفی خفی سی سعی میں یوں محو ہو گیا کہ وہ میری تشنگی کی اصل نوعیت کو بھانپ گئی۔ زیرِلب مسکرائی اور اوک میں لیے پانی سے میرا چہرہ تر کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں ہی جھینپ گئے اور ہنس پڑے، گو کہ دل کا چور دبکا رہا۔

فسٹ کلاس فسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ منزہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ میں ہاسٹل میں مقیم تھا۔ جب بھی چھٹی پر گھر آتا، حسبِ روایت بڑی بوڑھیاں ملنے آ جاتیں۔ بانہوں میں لے کر منہ سر چومتیں اور ڈھیروں دعائیں دیتیں۔ مرد حضرات بھی اسی خلوص سے ملتے۔ تاہم منزہ کا

رویہ منفرد ہوا کرتا۔ اس عورت کی رُوح میں واقعی کوئی دادی اماں براجمان تھی یا بلا کی اداکارہ۔ گھر میں داخل ہوتے ہی آواز بلند بولتی: "ہمارا پھول آیا ہے، کہاں گیا؟" میں جھینپتے ہوئے سامنے آجاتا چونکہ مجھے سب سے زیادہ اُسی کا ہی انتظار ہوتا۔ مسکرا کر سلام کرتا۔ وہ بلا تکلف دادی اماں کا رُوپ دھار لیتی۔ خود کو پوری رضا سے اُس کے حوالے کر دیتا۔ بڑی توانا خواہش بیدار ہوتی کہ میں بھی جواباً اسی گرم جوشی کا مظاہرہ کروں لیکن نہاں خانے میں کہیں اچانک کھٹکا ہو جانے سے دبکا بیٹھا چور لرز کر رہ جاتا۔

میڈیکل کالج میں مجھے میرٹ پر داخلہ ملا۔ اس عرصہ میں صابر حسین تین بار ہی چھٹی پر گھر آسکا۔ اُس کی رہائشی عمارت میں توسیع ہوتی رہی۔ سامانِ آرائش اور آسائش جمع ہوتا رہا۔ اولاد میں مزید اضافہ ہوا اور بچوں کی تعداد تین ہو گئی۔ صابر نے پھر وہی عزم دہرایا کہ وہ معززہ کی زندگی میں شاندار انقلاب لانا چاہتا ہے۔ کار کوٹھی، اور وہ سب کچھ، جس کی تمنا کی جاسکتی ہے۔ مَیں سیکنڈ ایئر میں تھا جب اُس نے بتایا کہ وہ تین سال کے لیے لیبیا جا رہا ہے اور بہت سی دولت کما کر لائے گا۔

ہاؤس جاب شروع کرنے سے پہلے چند روزہ فرصت ملنے پر گھر پہنچتے ہی اماں نے بڑی افسوس ناک خبر سنائی۔ کہنے لگیں: "معززہ کے لیے دعا کرو۔ بڑی سخت پکڑ ہو گئی ہے۔ اُس پر سایہ ہے۔ تمہارے پرچے ہونے والے تھے اس لیے کچھ نہ بتایا۔ کئی مہینوں سے علاج ہو رہا ہے۔ ہفتے دس دن میں ایک بار دورہ ضرور پڑتا ہے۔ بڑا ظالم جن چمٹا ہے جو کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑ رہا......"

ہوش رُبا تفصیلات سن کر میرا دل نادیدہ گرفت میں آ گیا۔ کوئی عامل بابا، پیر حکیم محمد کفیل نقشبندی جھاڑ پھونک کر رہا ہے۔ ہر پندرواڑے چلّہ کھینچنے کا بڑا بھاری نذرانہ وصول کرتا ہے۔ پانچ اقسام کے اناج، پانچ خشک میوہ جات اور پانچ ہی کلو روغن...... یعنی گھی یا تیل۔ بار بار خبردار کرتا ہے کہ کوئی بھی چیز مصنوعی نہ ہو۔ یعنی اصلی

ہونی چاہیے۔ ورنہ عمل اُلٹا پڑ سکتا ہے۔ اناج مثلاً: گندم، چاول، مکئی، باجرہ، جوار، تِل وغیرہ۔ اور میوہ جات میں بادام، کشمش، اخروٹ، مونگ پھلی، چلغوزے، پستہ اور کاجو۔ جو بھی توفیق ہو۔ تمام کا ہم وزن ہونا شرط ہے، مقدار کی قید نہیں، کوئی جس قدر دے سکے۔ بقول پیر حکیم نقشبندی: مترہ پر ایک بڑا ہی ضدی جن عاشق ہو گیا ہے۔ وہ گزشتہ سردیوں میں گھر کی سب سے اوپر والی چھت پر تن تنہا لیٹی، دھوپ تاپ رہی تھی کہ بدن کو پوری طرح ڈھانپنے کا خیال نہ رہا۔ غلام موسیٰ نام کا یہودی جن، کوہ قاف کی طرف جا رہا تھا کہ اِس عورت کے حُسن کا لشکارا پڑنے سے چندھیا گیا اور عین اوپر آ گرا۔ وہ اور آج کا دن، پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ مترہ کی آنکھیں سرخ اور چہرہ انگارہ ہونے سے شکل ڈراؤنی ہو جاتی ہے۔ جسم میں بے پناہ طاقت آ جانے سے کئی کئی عورتیں مل کر بھی قابو نہیں کر سکتیں۔ اپنے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے مردانہ آواز میں بے تکان بولتی ہے، لیکن مہمل جملے کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔

اماں سے معلوم ہوا کہ پیر حکیم نقشبندی نے گزشتہ روز جو چلّہ کھینچا ہے، معمول کے نذرانہ کے ساتھ کالا بکرا بھی لیا ہے۔ اپنے حالیہ چلّے کے بارے میں بتایا کہ اِس خطرناک عمل میں جان بھی جا سکتی تھی۔ آج مترہ سکون میں ہے۔ عامل بابا نے چیلنج کر دیا ہے کہ اب بھی اگر غلام موسیٰ جن حرکت سے باز نہ آیا تو اُس کی خیر نہیں۔ سختی کرنا پڑے گی لیکن گھر والے پریشان نہ ہوں۔ مترہ کی چیخ و پکار سن کر گھبرائیں نہیں۔ سمجھ لیں کہ جن کو سزا مل رہی ہے۔

اپنے لوگوں کی سادہ لوحی اور جہالت پر دلی دکھ ہوا۔ شعبۂ طب میں اِن خرافات پر ماہرین کے تفصیلی اور مدلل لیکچر سن رکھے تھے۔ اِس کے علاوہ آئے روز اخبارات میں خبریں شائع ہوتیں، جن کے مطابق نام نہاد عامل، متاثرہ خواتین کے جن نکالنے کی آڑ میں ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالتے اور بعض شرمناک حرکت بھی کر گزرتے۔ کئی

مریض، جنات کی پکڑ سے نجات پانے کی بجائے جان سے ہی گئے۔ افسوس کہ لوگ نصیحت نہیں پکڑتے۔ ہر بار فریب میں آجاتے ہیں۔

دوپہر کو کھانے کے بعد چند منٹ کا وقفہ گزرا تھا کہ عقب میں ہڑبونگ مچنے سے میں چونک اٹھا۔ اماں کفِ افسوس ملتے ہوئے بولیں: "پھر دورہ پڑ گیا۔ بے چاری کو نظر کھا گئی۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے رُل گئے ہیں......" میں اپنے ذہن میں فیصلہ کر چکا تھا لیکن اماں کو کچھ بتانے کی بجائے مصمم ارادے سے نکلا اور پچھواڑے چلا آیا۔ اہلِ خانہ سخت غم زدہ اور سہمے ہوئے نظر آئے۔

مُنزہ کے والدین اور بڑا بھائی بھی موجود تھا۔ وہ خود مجوبہ عمارت کے نچلے کمرے میں تھی۔ اُس کے حلق سے ایسی آوازیں برآمد ہوئیں کہ کچھ پلے نہ پڑا۔ گویا پشتو بلوچی براہوی اور دیگر علاقائی زبانوں کا ملغوبہ بول رہی ہو۔ دروازے کے باہر فرش پر دہکتے کوئلوں کی انگیٹھی کے پاس پیڑھی پر بیٹھا عامل بابا کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی چنگیری میں سرخ گول مرچیں اور کچھ درودری جڑی بوٹیوں کا آمیزہ رکھا تھا۔ بابا کے الٹے ہاتھ پر موٹا لمبا کاؤ کا ڈنڈا پڑا تھا۔ اُس پیر حکیم کے چہرے مُہرے سے کُھنگی اور عجیب طرح کی وحشت ٹپک رہی تھی۔ ذہن میں فوری خیال آیا کہ اتنا بوڑھا شخص ایک لحاظ سے نیوٹرل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ناگفتنی کے ارتکاب کا خدشہ عموماً ٹل جایا کرتا ہے لیکن بعید نہیں کہ جسمانی تشدد کرنے پر آئے تو حد سے ہی گزر جائے۔

میرے لوگ وقت سے پہلے ہی مجھے "ڈاکٹر صاحب" کہنے لگ گئے تھے۔ میری آمد پر سب نے والہانہ استقبال کیا تھا اور خواتین پر رقت طاری ہوگئی تھی۔ تاہم مردوں نے حوصلہ پکڑا۔ منزہ کا بھائی یعقوب، فوج سے نائیک یا حوالدار کے رینک سے ریٹائر ہوا تھا۔ میں نے اُس کو الگ کر کے سمجھایا کہ مُنزہ بیمار ہے اور اس کو فوری طور پر شہر لے جانا ہوگا، ایک ماہر ڈاکٹر کے پاس، جو میرے مہربان استاد بھی ہیں۔ وہ شاید

پہلے ہی گوگو کی کیفیت کے زیرِ اثر تھا۔ اُس کے چہرے پر اطمینان کی لہر سی آئی۔ فوراً باپ کے قریب جا کر گھسر پھسر کرنے لگا۔

عامل بابا نے یک دم گرج دار آواز میں منتر کے مہمل الفاظ دہرائے اور دھاڑ کر بولا: "اوئے یہودی! آج تیرا مقابلہ مسلمان عامل سے ہے۔ تیری خیر نہیں۔ سیدھی طرح چلا جا، نہیں تو پچھتائے گا۔ تیری نسلیں یاد کریں گی۔" اُس نے ڈنڈے سے فرش بجایا اور چنگیری میں پڑا نسخہ کوئلوں پر اُلٹ دیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور جھپاک سے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ بھیڑ لیا۔ وہ بستر پر لیٹی، آنکھیں پھاڑے بڑبڑاتے ہوئے چھت کو گھور رہی تھی۔ تشنج طاری ہونے سے جسم اکڑا ہوا تھا۔ میں نے چادر پھیلا کر اُس کا بدن ڈھانپ دیا اور پسینے میں تر چہرے پر بڑی نرمی سے ہاتھ پھیرا۔ پسینا پونچھا اور پیشانی کو سہلاتے ہوئے اگلے مرحلے پر پھٹی پھٹی سی آنکھوں پر ہتھیلی رکھ دی۔ اُس کے بدن میں ہلکی لرزش ہونے لگی اور ہونٹ باہم پیوست ہو گئے۔

مجھے صحیح اندازہ نہ ہو سکا کہ کتنے منٹ کے دورانیے میں مُتّو کے جسم کی اینٹھن کم ہونا شروع ہوئی اور اُس نے اپنا چہرہ سہلاتے میرے ہاتھ کی پشت پر اپنی دونوں ہتھیلیاں رکھ دیں۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے غنودگی آنے سے وہ پُرسکون ہو گئی ہے۔ تادیر جُھکے رہنے سے مجھے اپنی کمر میں کھچاؤ محسوس ہوا تو اُلٹے ہاتھ سے باری باری سہارہ دے کر اُس کے دونوں ہاتھوں کو پہلو میں رکھا اور اپنا سیدھا ہاتھ آزاد کرا لیا۔

باہر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر عامل بابا جلال میں آ گیا اور بولا: "میرا شکریہ ادا کرو۔ ورنہ جن نے تمہاری گردن مروڑ دینی تھی۔" میں نے تحمل سے کہا: "ٹھیک ہے باواجی! بہت شکریہ۔ ویسے میں نے جن کو کوہ قاف ائرلائن کی فلائٹ سے روانہ کر دیا ہے۔ وہ جلد ہی قرطبہ پہنچ جائے گا۔ اِس عورت کو معاف کر دیں۔ یہ میڈیکلی فٹ نہیں......"

مریضوں کی دھونی سے وہاں کھڑا ہونا محال ہو گیا۔ بابا نے ڈنڈے سے فرش بجایا اور دبنگ لب و لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''تمہاری مینڈ کی یہاں نہیں چلے گی اور چھچیاں میں حضرت پیرے شاہ غازی، دمڑیاں والی سرکار کا راج ہے۔ وہاں کوئی جن نزدیک بھی نہیں پھٹک سکتا۔'' میں نے حکمت سے کام لیا۔ چونکہ اپنے لوگوں کی ضعیف الاعتقادی سے خوف آ رہا تھا۔ عامل بابا سے الجھنے کی بجائے یعقوب سے کہا: ''اس وقت مریضہ کو آرام کرنے دیں اور یہاں شور شرابا نہیں ہونا چاہیے۔'' ذرا توقف سے بابا کی طرف اشارہ کر کے مزید کہا: ''اگر جن واپس آ گیا تو آپ بزرگ ہی علاج کریں گے۔ ہمارے بس کی بات نہیں۔''

o

میرے محترم استاد، معروف سائیکاٹرسٹ، پروفیسر ڈاکٹر حسنین بخاری بڑی شفقت سے پیش آئے اور پوری توجہ دی۔ بیس پچیس منٹ کے لیے مجھے باہر بھیج دیا اور مریضہ سے تنہائی میں بات کرتے رہے۔ معائنہ ختم ہونے پر میں اُس کو گاڑی میں بھائی کے پاس چھوڑ کر واپس آیا تو بخاری صاحب نے کہا: ''اس عورت کے خاوند سے کہو، اگر بیوی عزیز ہے تو فوراً آ جائے۔ جب وہ دو تین ماہ بال بچوں میں گزار لے تو میاں بیوی کو ایک ساتھ میرے پاس لے آنا۔''

ڈاکٹر صاحب نے ٹانک اور سکون آور دوائی کا نسخہ لکھ دیا۔ صابر حسین سے گھر والوں کا بذریعہ خط رابطہ ہوا کرتا تھا یا پھر کمپنی کے پاکستانی اکاؤنٹنٹ کا فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ میں نے پی سی او سے کال ملا کر خود بات کی اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی ہدایات کا حوالہ دے کر فوراً گھر آ جانے کی تاکید کر دی۔ وہ فکر مند ہو گیا اور بولا: ''میرے کنٹریکٹ کے تین سال پورے ہو گئے ہیں۔ آئندہ کے کنٹریکٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بیوی اور بچوں کے لیے ہی پردیس کاٹ رہا

ہوں۔ چند روز میں معاملات سمیٹ کر نکل آؤں گا۔"

چھٹے روز صابر حسین گھر پہنچ گیا۔ اس عرصے میں منزہ کے ہاں دن بھر کے دوران میرے تین چکر لگتے رہے۔ اپنی نگرانی میں اُس کو ادویات کی خوراک دیا کرتا۔ خاوند کے آنے تک کسی حد تک سنبھل گئی تھی۔ اُس کے گھر لوٹ آنے پر بڑی تیزی سے رُوبصحت ہوئی۔ میری چھٹی ختم ہونے سے ایک دن پہلے ہمارے گھر آ گئی۔ قریب قریب اُسی انداز سے ملی جیسے کبھی ملا کرتی تھی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہی والی منزہ ہے، جسے میں جانتا ہوں اور وہ میرے لیے بہت اہم ہے۔ اُس کی بھلائی کے علاوہ میری اور کوئی ترجیح نہیں۔ شاید اسی حوالے سے مجھے اس کا خاوند بھی اچھا لگنے لگا ہے۔ اتنے میں وہ خود بھی آ پہنچا اور صحن پار کرتے ہوئے ہانک پکار کے بولا: "سُنا ہے ہمارا پُھول صبح جا رہا ہے۔ جانے پھر کب ملاقات ہو۔ ہم اُداس ہو جائیں گے......"

میں نے خوش دلی سے خیر مقدم کیا اور اُس نے گرم جوشی سے گلے لگا لیا۔ کہنے لگا: "ڈاکٹر صاحب! مجھے کاروبار کا کوئی مشورہ دیتے جاؤ۔ اب میں گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتا۔" میں نے کہا: "بہت اچھا خیال ہے۔ ہماری ویلی کی سڑک چوڑی کی جا رہی ہے۔ تین چار میل اوپر جھیل کے قریب گیسٹ ہاؤس بنا لیں۔ سیزن میں سرکاری ریسٹ ہاؤس کی بکنگ کے لیے لوگ وزیروں کی سفارشیں کرواتے ہیں۔ اب تو سارا سال ہی ٹورسٹ آنے لگے ہیں۔ یہی موقع ہے، جس نے پہل کی، فائدے میں رہے گا......" وہ خوشی سے اچھل پڑا اور بولا: "واہ واہ! کیا بات ہے ڈاکٹر پھول صاحب! کمال کر دیا۔ اتنی رقم ہے میرے پاس۔ بڑا اچھا گیسٹ ہاؤس بن جائے گا۔ کیا زبردست مشورہ دیا ہے۔ دونوں بھانجے جوان ہو گئے ہیں۔ ہم سارے ہی کام سے لگ جائیں گے۔"

منزہ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں

تینوں بچے آگئے تو گفتگو میں خلل پڑنے لگا۔ میں نے اٹھ کر دیوار پہ لگا کیلنڈر دیکھا اور صابر حسین سے کہا کہ ستمبر کی چھے سات کو میری دو چھٹیاں ہیں۔ آپ میاں بیوی سات تاریخ کو میرے پاس آجانا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے اپوائنٹ منٹ لے رکھوں گا۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا: "بالکل ٹھیک۔ ہم حاضر ہو جائیں گے۔ اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے اور ہر خوشی دے......" میاں بیوی رخصت ہوتے ہوئے تقریباً ایک ساتھ ہی مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ میری حیرت کی انتہا ہو گئی جب دیکھا کہ تینوں بچے بھی میری ٹانگوں سے لپٹ رہے ہیں۔ سوچتا ہی رہ گیا کہ ان بچوں کے دلوں میں کون سا جذبہ موج زن ہوا ہے۔

ڈاکٹر سرحسنین بخاری سے سات ستمبر کو شام پانچ بجے کی اپوائنٹ منٹ لے رکھی تھی۔ اُنھوں نے اُسی طرح توجہ دی اور عزہ سے دس پندرہ منٹ علیحدگی میں بھی بات کی۔ اُس کو باہر بھیج کر ہمیں دوبارہ بلا لیا اور ہر طرح سے تسلی دی کہ مریضہ بالکل نارمل ہے۔ صابر حسین لجاجت آمیز لہجے میں بول پڑا: "سر! میری بیوی کی اصل بیماری کیا تھی؟" ڈاکٹر صاحب بڑی بے ساختگی سے بول گئے: "شرافت!!!" میں تو حیران ہوا ہی تھا، صابر حسین بھونچکا ہوا دیکھے گیا۔ ہمیں پریشان دیکھ کر سر بخاری ہنس دیے اور بولے: "بھئی! سیدھی سی بات ہے، شوہر کی لمبی جدائی میں باکردار عورت ہی پوری شدت سے ضبط کرتی ہے......"

ooo

پچھتاوا

گاؤں والوں کو سلیمہ سے دلی ہمدردی تھی۔ نوعمری میں ہی عثمان کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی تھی۔ اُس کی خوشی بے پایاں تھی کہ برادری کا بی اے پاس وجیہہ لڑکا اس کا شریکِ حیات بنا ہے۔ مگر عثمان پر بیرونِ ملک جانے کی دُھن سوار رہی اور اُس نے ڈھنگ سے ہنی مون کا رنگ رنگیلا دور پوری طرح گزارا بھی نہ تھا کہ جرمنی چلا گیا۔ سلیمہ نے بڑی ہمت دکھائی۔ ساس سسر اور نند دیور کا خیال رکھا اور پورا گھر سنبھالا۔ شوہر کی بھیجی ہوئی رقوم کو اس سلیقے سے خرچ کیا کہ مثال قائم ہو گئی۔ سب سے پہلے آبائی زمین واگزار کرائی، جسے گروی رکھ کر عثمان نے قرض لیا اور دیارِ غیر سدھارنے کے جملہ اخراجات پورے کیے تھے۔ نند کی شادی کی اور دیور کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ بیمار ساس سسر کے علاج معالجے میں بھی کبھی غفلت نہ برتی۔ ساتھ ساتھ پوری جانفشانی سے کھیتی باڑی کی نگرانی کرتی رہی۔

عثمان کہیں ڈیڑھ دو سال بعد ایک دو مہینے کی چھٹی آ جاتا۔ یہی وہ دن ہوتے، جو اس انتھک عورت کی محنتوں اور محبتوں کا کُل حاصل ہوا کرتا۔ بیس برس یوں ہی گزر گئے۔ گھر اور ڈیرے کی عمارت نئی بن گئی۔ عثمان نے جی ٹی روڈ پر عالی شان کوٹھی بنانے

کی خواہش ظاہر کی اور اس مقصد کے حصول کی خاطر معقول رقم بھیج دی۔اُس کی غیرموجودگی میں سلیمہ کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔گھر چلانے زمینداری کرنے اور کوٹھی کی تعمیر کروانے کے مشقت طلب مراحل سے گزرتے ہوئے اس عورت نے اپنے آپ کو ایک طرح سے پورے کا پورا خرچ کر ڈالا۔عثمان مسلسل تین سال تک گھر نہ آیا۔گاؤں کے نمبردار چوہدری عطا محمد نے اس عورت کے فطری سگھڑ پن کے علاوہ محنتی اور باکردار ہونے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''اِس لڑکی نے جس طرح مجاہدہ کاٹا ہے، آج گوتم بدھ کی رُوح بھی حیران ہوئی مسکرا رہی ہوگی۔''

تیس برس کی طویل جدائی کا اذیت ناک دورانیہ بالآخر اختتام پذیر ہوا اور عثمان مستقلاً وطن لوٹ آیا۔چھوٹا بھائی بیرسٹری کرنے برطانیہ جاچکا تھا۔والدین نہ صرف رُوبصحت نظر آئے بلکہ تندرست دکھائی پڑے۔بیوی بھی جسمانی طور پر مضبوط ہی تھی، لیکن عثمان نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ حُسن جوانی نزاکت اور نسوانیت جو اِس عورت کا خاصہ تھی، قصۂ پارینہ ہوچکی ہے۔اُس کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی، جب دیکھا کہ کوٹھی کا ایک ایک گوشہ کرسٹل کی مانند چمک رہا ہے اور تمام کمرے، حتیٰ کہ واش رومز کو بھی تالے لگے ہوئے ہیں۔البتہ سرونٹ کوارٹر میں واجبی سا سامان پڑا ہے۔معلوم ہوا کہ سلیمہ بی بی، کوٹھی کی چوکیداری کے لیے ساس سُسر کے ہمراہ رات کو سرونٹ کوارٹر میں آ کر بسیرا کرتی ہے۔دونوں جوان بیٹے گھر پر رہتے ہیں۔اُن پر بھروسا نہیں کرتی، مبادا کوٹھی کو نقصان پہنچائیں۔

تین سالہ جان گُسل ہجر کا دورانیہ، وصل کی جس رات میں ڈھل گیا، وہ عثمان کے لیے خوں چکاں ثابت ہوئی۔اُس کی پنڈلیوں اور پیروں پر جابجا خراشیں پڑ گئیں۔جذبات کی باڑھ تھمنے تک کھنگرایڑیاں لہو سے سرخ ہوگئیں۔تب کہیں گھائل ہونے والے کو جلن کا احساس ہوا۔عقدہ کھلنے پر پاؤں کو ٹخنے سے تھام لیا اور الٹا کر تلوہ ملاحظہ

کرتے ہوئے بول پڑا: ''یہ ایڑی ہے یا جھانواں......؟''

اگلے مہینے کوٹھی میں گائناکولوجسٹ نے کلینک کھول لیا اور چند ہفتوں بعد ہی اردگرد کے تمام دیہاتوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ چوہدری محمد عثمان نے ماڈرن لیڈی ڈاکٹر سے عقدِ ثانی کر لیا ہے۔

گاؤں والوں کو فوری طور پر سمجھ نہ آئی کہ عثمان کو مبارک باد دیں یا سلیمہ سے اظہارِ افسوس کریں۔ تاہم بیشتر اہلِ دیہہ کے دل رنجیدہ ہوگئے۔ سلیمہ کی چوکیدارہ ڈیوٹی چونکہ ختم ہو چکی تھی، لہٰذا ساس سسر کے ہمراہ گاؤں والے گھر میں رہنے لگی۔ بزرگ مرد وخواتین سے صبر نہ ہوسکا اور ان کے ہمراہ ہر عمر کے درجنوں لوگ اکٹھے ہو کر آ گئے۔ یوں گفتگو ہونے لگی گویا پُرسا دے رہے ہوں۔ ساس سُسر بھی بہو کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ سب کو ہمنوا پا کر دُکھی عورت کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ گزشتہ تیئس چوبیس برسوں میں اُس نے جس طرح وفا نبھائی اور گھر بنانے کی خاطر اپنے آپ کو مار ڈالا، ایک ایک دُکھ درد اور جو جو مصیبت جھیلی تھی، رو رو کر بیان کرتی رہی۔ اسی رو میں بین کرتے ہوئے بول گئی: ''مَیں منہ میں آئی ہوئی تھوک پھینکنے بھی کوٹھی سے باہر چلی جایا کرتی تھی...... اور وہ شہرن کنجری اب چٹکارے مارتے ولائتی کموڈوں میں جی بھر کے گند مار رہی ہوگی......''

کم وبیش سبھی لوگ غمزدہ ہوئے کھڑے تھے لیکن اپنی نوعیت کے اس انوکھے بین پر کئی ایک اچھے خاصے معتبر بزرگ بھی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ نمبردار نے سلیمہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''کملی دِھی نہ ہو تو!!! تجھے سوکن پڑنے کا زیادہ غم ہے یا کوٹھی کے غسل خانے استعمال ہونے کا؟ لعنت بھیج دونوں پر......'' سسر آبدیدہ ہوا بیٹھا تھا۔ سیدھا ہاتھ اُٹھا کر تین انگلیاں بلند کیں اور لرزتی آواز میں بولا: ''تینوں پر......''

000

احساس

سگے باپ، چھوٹے بہن بھائیوں، بیوی، حتیٰ کہ نو عمر بیٹے کو بھی عبدالوحید سے گویا اتنی ہی غرض رہ گئی تھی کہ حیلے بہانے اس کی جیب خالی کرے۔ یوں گمان گزرتا کہ وحید سے مالی استفادہ کرنے کے حوالے سے گھر والوں کے مابین مسابقت کی سی فضا بن گئی ہے۔ کاروبار میں مندی ہونے سے وسائل سکڑتے گئے مگر اس پر کسی کو رحم نہ آرہا تھا۔ دبے دبے لفظوں میں کئی بار سب کو ہاتھ ہلکا رکھنے کو کہا لیکن کوئی بھی کھلے دل سے تعاون کرنے پر آمادہ نظر نہ آیا۔

صبح گھر سے نکلتے ہوئے باپ نے اُسی روایتی روکھے انداز میں کہا: ''کبھی خود بھی احساس کر لیا کرو۔ ہر بار تجھے کہنا پڑتا ہے۔ تمہاری بہنیں اتنے دن میکے میں گزار کر سسرال جا رہی ہیں۔ اُنھیں کچھ دے دلا کر بھیجنا ہوگا.....'' وحید اندر سے زخمی ہو گیا اور اتنا ہی کہہ پایا: ''ابا جی! دراصل آج کل کاروبار کا ستیاناس ہو رہا ہے.....بہرحال، آپ بتائیں کتنے.....'' باپ کو یک دم غصہ آ گیا۔ کہنے لگا: ''ہر وقت روتے ہی رہو گے۔ یہ قوم ہی ناشکری ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی روتی جائے گی۔''

وحید نے جیب سے رقم نکال کر باپ کے سامنے رکھی اور شکست خوردہ آواز

میں بولا: "یہی ہیں۔ جتنے ضروری سمجھتے ہیں، لے لیں......" باپ نے ایک نظر کرنسی نوٹوں پر ڈالی اور بے زاری سے بول دیا: "یہ ہیں ہی کتنے، جو اِن میں سے لے لوں۔"

بوڑھے نے ساری رقم اٹھا کر جیب میں ڈالی اور بڑبڑاتا ہوا لاتعلق سا ہو کر بیٹھ رہا۔

وحید ٹوٹے ہوئے دل سے بینک چلا آیا۔ بیلنس نیچے لگا ہوا پا کر اور بھی کڑھا۔ دس ہزار روپے کی رقم نکلوائی اور جوں ہی گاڑی اسٹارٹ کی، ذہن کے کسی گوشے سے انجانی تحریک بیدار ہوئی۔ رُخ از خود ہی دیرینہ دوست رجبِ نصر کے فارم ہاؤس کی جانب ہو گیا۔ چھ گھنٹے کی مسافت ساڑھے چار گھنٹوں میں طے کر لی۔ رجب نے بآوازِ بلند نعرہ لگایا: "آخر یاد آ ہی گئی میرے یار کو اپنے چاہنے والوں کی۔" اُس نے بازو کھول دیے اور وحید کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

شام کو دونوں دوست بیٹھے پیتے رہے۔ رجب کہنے لگا: "چھوڑو سب جھمیلے، لعنت بھیجو۔ کم از کم ایک مہینا میرے پاس رہو۔ نئے ہو جاؤ گے۔ پھر سوچتا، کیا کرتا ہے۔ گاڑی بھیجی ہوئی ہے۔ دو تین گھنٹوں تک واپس آ جائے گی۔ تجھے لکھنؤ کی تہذیب کا لطف آئے گا۔ صرف یہ کہ وہ دن کو گھر سے باہر نہیں رہ سکتی۔ جب چاہو گے، رات کے لیے منگوا لیا کریں گے......"

o

اُس کے آدابِ دل رُبائی ایسے تھے کہ وحید کی زخمی رُوح کو سکون آ گیا۔ سفلہ جذبہ کہیں دب کر رہ گیا، پھر بھی نشہ دوبالا ہوا رہا۔ صبح منہ اندھیرے پرس اُس کی طرف بڑھا کر مدہوشی کے عالم میں بولا: "یہ سارے تم رکھ لو......انشااللہ پھر ملیں گے۔"

وحید نے آنکھیں موند لیں۔ چند لمحوں بعد وہ جھکی اور پرس تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے وحید کے چہرے پر الوداعی بوسہ یوں ثبت کیا گویا گلاب کا پھول چھو گیا ہو۔

ناشتا کرنے کے بعد ہوش وحواس پوری طرح بحال ہونے پر وحید کو خیال آیا کہ پرس میں اے ٹی ایم بھی تھا۔ کہیں غلطی سے لے نہ گئی ہو۔ بالکل ہی خالی...... مارا گیا۔ عجلت میں اُٹھا اور پرس تلاش کر کے کھولا۔ اس میں ڈرائیونگ لائسنس، اے ٹی ایم اور شناختی کارڈ اُسی طرح پڑے تھے اور دوسرے خانے میں پانچ ہزار روپے کے کرنسی نوٹ بڑی نفاست سے رکھے نظر آ گئے۔

ooo

جمہوریت

تمام دوستوں نے کئی روز تک باہمی مشاورت کی لیکن پوری نیک نیتی سے غور وفکر اور بحث مباحثہ کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ اُن کا مخلص دوست، محمد امین صادق موجودہ دور کی سیاست میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مظفر کہنے لگا: ''یہ وہ دور نہیں، جب سیاست کو عبادت سمجھا جاتا رہا۔ مفاد پرستی کی سیاست تب بھی ہوتی رہی اور استحصالی طبقے ہی غالب رہے۔ اِسی لیے جب کوئی مخلص سیاستدان میدان میں آیا، سارے مفاد پرست گروہ متحد ہو کر اُس کو راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب تو اس ملک کو ایسی بُری نظر لگی ہے کہ تبدیلی آنے کی اُمید بھی نہیں رہی......''

سجاد نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ''اب کوئی خونی انقلاب ہی اِن طاغوتی طاقتوں کے چنگل سے اقتدار چھین کر حقیقی عوامی نمائندوں کے سپرد کر پائے گا۔ ظالموں نے ملکی معیشت کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ چند خاندان ہیں، جو گھوم پھر کے ہر بار اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے ہی تمام تر قومی وسائل لوٹ کر غیر ملکی بینکوں میں جمع کیے۔ اسی لوٹی ہوئی دولت کے بل بوتے پر بار بار برسرِ اقتدار آتے ہیں۔ عوام کو بھکاری بنا دیا۔ قومی وقار اور عزتِ نفس کا جنازہ نکل گیا۔ جہاں عام آدمی، گھی کا ڈبا

اور آٹے کا تھیلا لے کر ووٹ دے ڈالے، وہاں تبدیلی کے خواب دیکھنا، احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔"

امین بول پڑا: "میں آپ دوستوں کی محبت اور خلوص کی دل سے قدر کرتا ہوں لیکن ایک بار کوشش ضرور کروں گا۔ گر اس رُوٹ لیول سے سیاست شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ مجھے جلدی نہیں۔ بلدیاتی الیکشن لڑ کر مرحلہ وار آگے بڑھنا ہے۔ موجودہ سیٹ اَپ میں راستہ بنانا ایک لحاظ سے ناممکن ہی سہی لیکن کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ لوٹی ہوئی قومی دولت کو بے دریغ خرچ کر کے الیکشن خرید لیے جاتے ہیں اور جہاں خریدنے مشکل ہوں، وہاں ڈاکا ڈالنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ قومی ادارے کرپٹ کر دیے گئے ہیں۔ یوں دوبارہ برسرِ اقتدار آ کر خرچ کی گئی دولت مع دس گنا منافع کے دوبارہ لوٹ لی جاتی ہے۔ لالچ، تحریص، مراعات اور رشوت دے کر کام نکالنے کے فن میں جو ملکہ ہم پر مسلط حکمران طبقے کو حاصل ہے، اس میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔ منجھے ہوئے عمر رسیدہ جہاندیدہ کشمیری سیاسی لیڈر نے دو اڑھائی دہائیاں پہلے اپنی علاقائی زبان میں ہمارے وزیرِاعظم پر کیا خوب تبصرہ کیا تھا: "اے کلنٹنے کی وی رشوت دئی کے نال رلائی گھنسی۔" (یہ امریکی صدر کلنٹن کو بھی رشوت دے کر ساتھ ملا لے گا)

محمد امین صادق نے اپنی رہائشی عمارت کے اگواڑے ذاتی مارکیٹ کی درمیان والی دو دکانیں خالی کروا لیں اور ان میں آرام دہ دفتر قائم کر لیا تاکہ حلقے کے عوام کو رابطہ کرنے کے سلسلے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ لوگ آ کر بیٹھنے لگ گئے۔ مسائل پر گفتگو ہونے لگی۔ گلی محلوں میں گھوم پھر کے جائزہ لیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ملک کی طرح ہر حلقہ مسائلستان بنا ہوا ہے۔ متعلقہ سرکاری اہلکاروں کی بے لگام بدعنوانیوں کے نتیجے میں بغیر کسی منصوبہ بندی کے آباد ہونے والی بستیوں میں نسلِ انسانی، کیڑوں مکوڑوں سے بھی بُری حالت میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ بنیادی شہری سہولتوں کا فقدان ہونا درکنار، لوگ

غلاظت کے ڈھیروں میں کلبلا رہے ہیں اور انہیں اس عفونت زدہ ماحول سے نجات دلانے کا بادی النظر میں کوئی راستہ بجھائی نہیں دیتا۔

مظفر کہنے لگا: ''میرے یار امین! تمہاری مثال اُس معصوم چڑیا جیسی ہے جو جنگل میں لگی آگ کو بجھانے کے لیے چونچ میں پانی بھر کر لا رہی ہو۔ خاص طور پر ان بستیوں کا جو نکاس کے قدرتی راستوں پر آباد ہو چکی ہیں، ایک ہی حل ہے کہ انھیں بلڈوز کر کے نئے شہر آباد کیے جائیں۔ جعلی قائدین صرف اسی لیے زبانی جمع خرچ کرتے ہیں۔ ہر مرتبہ اقتدار میں آتے ہی مزید بیرونی قرضے لیتے ہیں۔ ملک و قوم کو گروی رکھ دیا ہے اور خود اربوں میں غبن کر کے باہر لے جا رہے ہیں۔ جس طرح مرض کو بگاڑ کے رکھ دینے والا اتائی معالج محض مزید پیسے کمانے کی غرض سے سٹیرائیڈ کا سہارہ لے کر شعبدہ بازی دکھاتا ہے۔ ان لوگوں نے بیرونِ ملک اپنی بزنس ایمپائرز کھڑی کر لی ہیں۔ ذرا سے حالات ناموافق ہوتے دیکھ کر یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ یہ صرف ملک کے دیوالیہ ہونے تک رُکے ہوئے ہیں...... تم کچھ نہیں کر سکتے۔''

جہاں حلقے کے لوگ سنجیدہ معاملات پر گفتگو کرتے وہاں وہ بھی آ جاتے، جن کے پیشِ نظر صرف ذاتی اغراض ہوا کرتیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا، ان کی مدد کی جاتی۔ لالچی اور شاطر لوگوں نے بھی راستہ دیکھ لیا۔ رابطہ دفتر میں چائے پانی اور کھانے وغیرہ کا اہتمام تو ہوا ہی کرتا، لیکن ابن الغرض افراد، موقع بہ موقع آ کر گھر میں بیماری ناداری اور فاقہ کشی کا عذر گھڑ کر کچھ نہ کچھ نقدی کی صورت میں ہتھیا لے جاتے۔

بھوری آنکھوں والی گوری چٹی زرد رُو کمزور عورت، بچہ گود میں لیے آ گئی۔ باتوں باتوں میں بتا دیا کہ قریبی رشتہ داروں اور اپنے گھر کے کُل ملا کے پچاسی ووٹ ہیں۔ حکومتی پارٹی کے مقامی لیڈر بڑے بے ایمان ثابت ہوئے۔ ہر مرتبہ ووٹ لے جاتے رہے لیکن وعدے کر کے بھی کوئی خاص مدد نہ کی۔ خاوند اندھا ہے۔ ساس سسر اور

ماں باپ بوڑھے اور کمزور ہیں۔ جوان بیٹیوں کو عزت کے مارے گھر سے نہیں نکالتے۔ غریبی کی وجہ سے اُن کی شادیاں نہیں ہو سکیں۔ لڑکے چھوٹی چھوٹی مزدوریاں کرتے ہیں۔ ابھی اُن کی عمر ہی کم ہے۔ آپ کی مشہوری سنی کہ بڑے رحم دل ہیں۔ گھر کے راشن کا سوال کرنے آئی ہوں۔

نوجوان ساتھیوں کے علاوہ محمد امین خود بھی عورت کی حالتِ زار دیکھ کر متاثر ہوا لیکن مرحوم باپ کے وقتوں کا معمر تجربہ کار ملازم محمد حسین ساری صورتِ حال کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ عورت سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ اُس کے کتنے بچے ہیں۔ وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولی: "اللہ کی دولت ہے جی! نو ہیں۔ چار بیٹیاں اور پانچ بیٹے......" گود میں لیے ہوئے بچے کے رخسار کو پیار سے چھو کر مزید بولی: "اِس سمیت سارے بیٹے چھوٹے ہیں۔" محمد حسین نے اُس کے پیٹ پر نگاہ ڈالی اور کہا: "تو نہیں دس کہو۔ دسواں بچہ، لڑکی ہوئی یا لڑکا، اللہ کی اور دولت سنبھالنے کی تیاری پکڑو۔"

عورت پہاڑی زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ بزرگ ملازم کی بات سن کر ذرا خفیف نہ ہوئی۔ بائیں بازو پر بٹھائے بچے کو اتنا اوپر اٹھالیا کہ اُس کا چہرہ اپنے منہ کے برابر لے آئی۔ دونوں گالوں پر منہ بھر کے باری باری اتنا بھرپور بوسہ دیا کہ بچے کے رخساروں پر اپنے ہونٹوں سے چُسکی بھر کے ہلکے ہلکے پٹاخے چلائے اور انہیں گیلا کر دیا۔ کہنے لگی: "اَنکل (uncle) جی! یہ دولت قسمت والوں کو ملتی ہے، جسے اللہ دے۔ غریبی بھی وہی دیتا ہے۔ آج نہیں تو کل کٹ جائے گی۔"

محمد حسین بول پڑا: "میں بھی ساری زندگی یہی سمجھتا رہا کہ اللہ میاں، بچوں کی دولت زبردستی دیتا ہے۔ لیکن جب میری بہو دو بچے پیدا کر کے اپنے خاوند کے سامنے ڈٹ گئی کہ اور بچے اس آمدنی میں نہیں پالے جائیں گے، اس لیے پہلے ان کو روکنے کا بندوبست کرو، پھر اگلی بات ہوگی...... سچی بات ہے، میں اللہ کی ناراضگی سے ڈر گیا مگر

چپ رہا۔ ساس بہو میں صلاح مشورے ہوتے رہے اور دونوں نے سرکاری ڈسپنسری کے چکر لگانے شروع کر دیے...... جہاں بہبودِ آبادی والی ڈاکٹر بیٹھتی ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے دعا کی، وظیفہ پڑھایا یا علاج کیا، مجھے اصلی بات کا نہیں پتا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ دس سال ہو گئے، بچے کی شکل میں دولت دوبارہ ہمارے گھر میں نہیں آئی۔ بلکہ اب تو میرا بیٹا بھی اپنی بیوی کی عقل مندی پر خوش ہے۔"

"توبہ استغفار! اللہ کے کام کو روکتی ہے آپ کی بہو اُنکل جی!!!" عورت نے محمد حسین کو ٹوک دیا۔ بزرگ محلے دار حاجی محمد انور نے شاید شروع میں ہونے والی باتیں غور سے سننے کی بجائے، اخبار دیکھنے میں دلچسپی لیے رکھی تھی، اب عورت کی طرف متوجہ ہو کر سوال کر دیا: "تمہارا خاوند کیا کرتا ہے؟" محمد حسین نے جھٹ بول دیا: "بتا رہی ہے ناں کہ دس بچے ہیں......" عورت تڑت بولی: "شکر ہے اللہ پاک کا......" وہ براہِ راست محمد حسین کو مخاطب کر کے بول پڑی: "آپ کیوں جل جل کے کوئلہ ہو رہے ہو اُنکل جی!"

حاضرینِ محفل اس دلچسپ مکالے پر ہنسنے لگ گئے، جب کہ امین ایک کاغذ پر کچھ لکھنے میں مصروف نظر آیا۔ ایک نگاہ محمد حسین پر ڈال کر بولا: "چاچا جی! یہ چٹ ساتھ والے سٹور پر لے جائیں اور اس کے مطابق ان کو راشن دلوا دیں۔" وہ عورت فوراً امین کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی: "چٹ مجھے دیں۔ سودا میں خود لے لوں گی۔ اُنکل بڑے سڑیل ہیں...... ایک مہربانی اور کریں۔ یہ میرے پاس ڈاکٹر کی پرچی ہے، اس بچے کے دودھ اور کچھ دوائیوں کی۔ ساتھ والی دُکان سے مل جائیں گی۔ اللہ آپ کو وزیراعظم بنائے......"

سب لوگ ہنس پڑے۔ محمد حسین کہنے لگا: "ہور چوپو......" وہ اپنے مالک سے مخاطب ہو کر بولا اور پھر حاجی انور کو متوجہ کر کے کہا: "یہ امین صاحب بڑے بھولے

بادشاہ ہیں۔ اِن لوگوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ بخشے، اِن کے والد صاحب اور آپ کے دوست، حاجی محمد صادق بھی بڑے سخی تھے لیکن ایک نظر میں بندہ پہچان جاتے کہ کون پیشہ ور منگتا ہے اور کون سفید پوش عزت دار ضرورت مند......"

عورت کی بھوری آنکھیں چند لمحوں کے لیے مادہ چیتا کی آنکھوں کا سا رُوپ دھار گئیں۔ اُس کے زرد چہرے پر خون کی سرخی دوڑنے کی بجائے، سیاہی مائل لہری جھلکتی دکھائی پڑی۔ امین کے ہاتھ سے پرچی اُچک کر براہِ راست اُس سے مخاطب ہوئی: "یہ بوڑھا آپ کی نیکیوں پر پانی پھیر رہا ہے۔ دوائیوں والے سٹور کو بھی رُقعہ لکھ دیں۔ میں سودا خود لے لوں گی۔ اللہ آپ کو وزیرِ اعظم بنائے۔ سو روپیہ نقد دے دیں۔ سامان خود اٹھا نہیں سکتی۔ گھر میں جوان بچیاں یا بوڑھے اور بچے ہیں۔ ٹیکسی والے بڑے بے ایمان ہیں۔ تھوڑا سا فاصلہ ہے مگر منہ پھاڑ کر سو روپیہ مانگ لیں گے......"

دفتر میں بیٹھے سارے لوگ ہنسے جا رہے تھے۔ امین حیران ہوا اس عورت کو دیکھے گیا۔ سو روپے کا نوٹ اُس کی طرف بڑھا کر کہنے لگا: "میں میڈیکل اسٹور پر فون کر دیتا ہوں۔ وہ پرچی کے مطابق دودھ کا ڈبا اور دوائیاں دے دے گا۔ آپ جائیں......" وہ نوٹ پکڑ کر دعائیں دیتے ہوئے بولی: "دودھ کے دو ڈبے لوں گی اور ڈاکٹر کی پرچیاں بھی دو ہیں۔ دوسری میری اپنی پرچی ہے۔"

"ہور چُو پُو!!!" محمد حسین نے اتنا ہی کہا۔ عورت نے جاتے جاتے اُس کو کینہ تُوز نظروں سے دیکھا اور بول گئی: "آپ اب گھر میں ریسٹ (rest) کیا کرو انکل! مُفت کی تنخواہ لو اور رَب کے پُو پا کرو...... اور کوئی نیکی بدی اب کر بھی نہیں سکتے۔" وہ دفتر سے نکلتی چلی گئی اور وہاں بیٹھے سارے لوگ ہنسنے لگے۔

محمد حسین بول پڑا: "میں کیا کروں، کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ اِس گھر کا نمک کھایا ہے۔ مجھ پر بڑے احسانات ہیں مرحوم صادق صاحب کے۔ اُنہوں نے ہمیشہ مجھے

بڑے بھائی کا پیار دیا اور اعتبار کیا، کبھی نوکر نہ سمجھا......"

محمد حسین کو دل گرفتہ ہوا دیکھ کر امین صادق بول پڑا: "چاچا جی! ہم نے آپ کو ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا ہے۔ کوئی شکایت ہے تو بتائیں...... اب یہ کہ غربت کو اسی لیے بڑی لعنت قرار دیا گیا ہے۔ اس میں انسان کا کریکٹر ہی نہیں رہتا۔ چالاکی چاپلوسی، مکروفریب، جھوٹ فراڈ، ظلم، چوری چکاری، ڈاکا زنی، ہیرا پھیری، نوسربازی اور بے حیائی بدکاری وغیرہ، ساری کی ساری برائیاں اسی نامراد مفلسی کی اولادیں ہیں۔ اور مفلسی اس غیر منصفانہ ظالمانہ سیاسی معاشی نظام کی پیداوار ہے۔ ایسے غیر انسانی نظامِ حکومت میں آخرکار دو ہی طبقے باقی رہ جاتے ہیں...... ایک جو لوٹ مار کے ذریعے اپنے خزانے بھرتا ہے، قومی خزانہ غبن کر کے اور دوسرا جو بالکل ہی محروم رہ جاتا ہے۔"

حاجی انور نے ایک نظر محمد حسین پر ڈالی اور امین سے کہا: "محمد حسین نے ساری زندگی تیرے مرحوم باپ کے ساتھ وفاداری نباہی۔ وہ اس لیے فکرمند ہو رہا ہے کہ جس طرح تم کر رہے ہو، یوں بہت جلد خود بھی دوسرے طبقے میں شمار ہونے لگو گے۔ محمد حسین نوجوانی میں تیرے باپ کے پاس ملازم ہوا اور میری اُس کے ساتھ بچپن کی دوستی تھی جو اللہ کے کرم سے عمر بھر قائم رہی۔ ہم نے اپنی بیویوں کے ہمراہ حج بھی اکٹھے کیا۔ تمہارا دادا اُس زمانے میں بھی امیر تھا جب ہندوستان سارے کے ہزار میں سے نو سو ننانوے مسلمان غریب ہوتے تھے۔ تمہارے باپ نے بڑی دانائی سے دولت جائیداد کو سنبھالا۔ ایک روپیہ ناجائز طریقے سے نہ کمایا لیکن تمہاری طرح بغیر سوچے سمجھے خرچ بھی نہ کیا۔ جس طرح کی سیاست ملک میں ہو رہی ہے، تم اس میں فٹ نہیں بیٹھ رہے۔ ان لوگوں کا مقابلہ شیطان بھی نہیں کر سکتا۔ جو قومی خزانے کے امانت دار اور محافظ بن کے بیٹھے ہوئے ہیں، ان کی دولت اور بیرونِ ملک اثاثوں کی مالیت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں رہا...... یہ ابھی اس اخبار میں اعداد و شمار دیکھ رہا تھا کہ اقتدار میں آنے کے

بعد قومی خزانے پر ڈاکے ڈال کر جو امیر کبیر بن گئے، ان میں وہ صاحب بھی ہیں جو کبھی پرانی موٹر سائیکل پر دن بھر دھکے کھایا کرتے تھے۔ یہ لوگ اسی ملک سے لوٹی ہوئی دولت کا معمولی سا حصہ خرچ کر کے الیکشن جُرا لیں گے۔ تم مہربانی کر کے اپنے کام کی طرف دھیان دو...... یا کوئی فلاحی کام کر لو، اس دفتر میں فری ڈسپنسری وغیرہ کھول کر خود کو مصروف رکھو۔ اس طرح غریبوں میں راشن بانٹ کر غریبی ختم نہیں ہو گی۔ ہاں!! غریبوں کی عادتیں مزید خراب کر لو گے...... تبدیلی ضرور آئے گی اس مُلک میں انشااللہ، مگر بڑے خون خرابے کے بعد، ووٹ سے نہیں آ سکتی۔ کیوں کہ الیکشن جیتنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے......"

قریبی دوستوں اور بزرگوں کی نصیحتیں رائیگاں گئیں۔ امین اپنی دھن میں لگا رہا۔ اُس کا کہنا تھا کہ انسان کو اپنے حصے کا کام ضرور کرنا چاہیے۔ نتائج جو بھی ہوں، یوں وہ اپنی ذات کی حد تک سرخرو ہو جاتا ہے۔ امین کی نیت جو بھی رہی ہو، موقع شناس لوگ فائدہ اٹھاتے رہے۔ اپنی مجبوریوں کا رونا رو کر کچھ نہ کچھ اینٹھ بٹور اور جھپا لے جاتے۔ اور وہ بیوقوف بنتا رہا۔

ایک دس بارہ سال کی خوش شکل لڑکی کڑھائی اور دستکاری کے نمونے اٹھائے آنے لگ گئی۔ امین کو یوں گمان گزرا گویا اس لڑکی کو کہیں دیکھا ہے۔ اُس نے اپنے گھر کا صحیح اتا پتا بتانے سے گریز کیا۔ باپ کی بے روزگاری بیماری اور گھر کی زبوں حالی کا واسطہ دے کر التجا کرتی کہ وہ بھکارن نہیں، صرف اپنی دستکاری کی اشیا بیچنے میں تعاون کی طلب گار ہے۔ امین نے ہر مرتبہ اُس کی مالی مدد کر دی۔ سمجھایا بجھایا کہ وہ خود یوں بازار میں نہ آیا کرے۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ تسلی دلاسا دینے پر اپنا سامان اور امداد میں ملی رقم لے کر چل دیتی لیکن دو تین ہفتوں کا وقفہ دے کر پھر آ جاتی اور اپنے گھر پر نازل ہونے والی کسی نئی مصیبت کا ذکر کر کے مال کھینچ لیتی۔

اسی طرح نو دس سالہ ایک لڑکا آنے لگا۔ وہ بھی کچھ جانا پہچانا سا لگتا۔ حلقے کی کچی آبادی کے آخری حصے میں اپنی رہائشی جھگی کا پتا بتایا۔ بقول اُس کے، ماں باپ دونوں بیمار اور چار چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ امین اُس کی بھی مالی مدد کرتا رہا لیکن شک گزرتا کہ لڑکا ہر مرتبہ جھوٹ بولتا ہے، جس سے بیان بدل جاتا ہے۔ امین نے اُس کو ٹالنے کی کوشش کر دیکھی لیکن وہ لڑکا اڑ جاتا اور کہتا کہ گزشتہ رات سے گھر میں فاقہ ہے۔ چند ایک بار امین نے اُس کو نقد رقم دینے کی بجائے ہوٹل سے ڈھیروں روٹیاں اور سالن منگوا دیا۔ لڑکے میں جارحانہ پن عود کر آتا۔ روٹیاں سالن لے کر بھی اڑ جاتا اور کہتا کہ سونہیں تو پچاس روپے ہی نقد دے دو۔ تا کہ کل ہم لوگ ناشتا تو کر سکیں۔

ایک روز محمد حسین نے دفتر میں آ کر ایسی کہانی سنائی کہ سب کو حیران کر دیا۔ کہنے لگا: ''روٹیاں سالن لینے والا لڑکا، دستکاری کا سامان بیچنے والی لڑکی آپس میں سگے بہن بھائی ہیں اور دونوں اُسی عورت کی اولاد، جو ہر مہینے راشن کے ساتھ دودھ کے دو ڈبے اور دوائیاں لے کر جاتی ہے۔ عورت کا نام صغیرہ ہے۔ لڑکے کا سفیر اور لڑکی کا سفینہ۔ گھر میں تین جوان لڑکیاں، سلائی کڑھائی کا اچھا خاصا کام کرتی ہیں......''

مقامی حکومتوں کے چناؤ کا اعلان ہو گیا اور امین صادق نے بطور امیدوار کاغذات جمع کرا دیے۔ سردیوں کی پہلی بارش کو سرِ شام ہی دفتر کی رونق کم ہو گئی۔ محمد حسین عشا کی نماز ادا کر کے مسجد سے واپس آیا ہی تھا کہ سفیر نے اندر جانے کی کوشش کی لیکن محمد حسین نے اُس کو روک دیا۔ لڑکا اُلجھ پڑا اور اُس پر گویا دیوانگی طاری ہو گئی۔ زبردستی اندر گھسنے کی خاطر ہڑبڑی مچا دی اور بوڑھے شخص کو گالیاں بکنے لگا۔ دفتر میں صرف امین اور مظفر بیٹھے تھے۔ محمد حسین نے لڑکے کو دھکیل دیا اور شیشے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ باہر سے شیشے کی شیٹ کے ساتھ چھپکلی کی طرح چپک گیا۔ دونوں ہتھیلیوں سے شیشہ تھپتھپا کر اونچی آواز میں بولنے لگا: ''اوئے! اللہ کے واسطے مجھے

ہوٹل سے روٹیاں سالن لے دو۔ میرے گھر والے بھوکے بیٹھے ہیں......"

مظفر نے اپنے دوست سے محمد حسین والی بات کہہ دی: "ہور پچو پو۔" لڑکا زیادہ زور زور سے شیشہ تھپتھپانے لگ گیا۔ تینوں کو فکر لگ گئی کہ شیشہ کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے۔ محمد حسین نے غصے میں آ کر کونے میں ایستادہ ہوئی پڑی چھتری اُٹھائی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ امین کی آواز سنائی: "چاچا جی! مارنا نہیں صرف ڈرانا ہے۔" محمد حسین نے کوئی جواب نہ دیا اور سیدھے ہاتھ میں لی چھتری کو تولتے ہوئے اُلٹا ہاتھ لاک کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ زوردار چھناکے سے شیشہ ٹوٹ گیا اور اینٹ کا روڑہ بائیں آنکھ سے ذرا اوپر پیشانی پر آن لگا۔

امین کے منع کرنے کے باوجود محمد حسین نے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی اور پولیس لڑکے کو گرفتار کر کے لے گئی۔ تیسرے روز ہی حکومتی پارٹی کے امیدوار نے لڑکے کو رہا کرا دیا۔ سیاسی سرگرمیاں زور پکڑ چکی تھیں۔ لالچ تحریص اور جوڑ توڑ، گویا ہر طرح کا جائز ناجائز ہتھکنڈا آزمایا جانے لگا۔ دھڑے بندیاں بھی عروج کو پہنچ گئیں۔ ذاتی اثر و رسوخ، سرکاری اداروں کا دباؤ اور دھونس کے آزمودہ فارمولے بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ، مطلب برآری کرنے کی غرض سے، مذہبی، لسانی، علاقائی، نسلی اور ذات برادری کے تعصبات کو بھی ابھارا گیا۔

حکومتی پارٹی کے امیدوار میاں کمال اکبر نے امین کو فون کال کر کے کہیں علیحدگی میں آمنے سامنے بیٹھ کر باہمی دلچسپی کے امور پر بات چیت کرنے کی پیشکش کی، جو اس نے قبول کر لی اور بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا۔ کمال نے کہا: "بغیر کسی لگی لپٹی کے صاف کھری بات کروں گا، وہ یہ کہ آپ میرے مقابلے میں الیکشن ہار رہے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ کچھ خرچہ پانی لے کر میرے حق میں دست بردار ہو جائیں۔ آپ شریف باپ کی اولاد ہو، سیاست نہیں کر سکتے۔ میں نے میٹرک ایف اے بی اے، سارے امتحان بغیر

پڑھے پاس کر لیے...... وہ اس طرح کہ سینٹر میں نقل لگائی، پرچے حل کروائے، پھر بھی فیل، لیکن بورڈ اور یونیورسٹی سے سندیں اور ڈگری لے کے رہا۔ بے شک دونوں اداروں کا ریکارڈ چیک کروالیں، باقاعدہ اندراج موجود ہوگا۔ میں کچا کام نہیں کیا کرتا۔ اب تو حکومت میرے ساتھ ہے۔ کہیں تو فالتو بیلٹ پیپر اور مُہر وغیرہ ابھی دکھا دوں!! مختصر بات یہ ہے کہ آپ نے پڑھ کے دو دو ایم اے کر لیے، وہ اور بات ہے اور یہ الیکشن والا معاملہ ہی اور ہوتا ہے......"

"کمال صاحب! آپ کو کامیابی کا پکا یقین ہے، پھر کیوں مجھے دست بردار کرواتے ہیں؟" امین نے ٹوکتے ہوئے پوچھ لیا۔ کمال کہنے لگا: "اس لیے کہ حلقے میں آپ کی شرافت کا فوبیا ہو گیا ہے۔ اور کوئی مقابلے میں ایسا ہے ہی نہیں، جس سے خطرہ ہو۔ آپ دست بردار ہو کر مالی نقصان سے بچ جائیں گے اور میری عزت رہ جائے گی...... عزت تو خیر، میں ویسے بھی بنا ہی لوں گا۔ وہ یوں کہ کچھ ہماری پارٹی کے اصلی ووٹ ہیں۔ کافی سارے ووٹوں کا سودا ہو چکا ہے، پانچ سو روپیہ فی ووٹ۔ باقی جو کمی رہ گئی، وہ اسی طرح پوری ہو گی، جیسے سندیں ڈگری لی جاتی ہے۔ آپ سمجھ جائیں۔ جس کے پیچھے حکومت کی طاقت ہو، وہ نہیں ہار سکتا۔ پولنگ شروع ہوتے ہی خریدے ہوئے ووٹر بھگتائیں گے۔ انہوں نے پولنگ بُوتھ میں جا کر پرچی بیلٹ بکس میں ڈالنے کی بجائے ہمیں لا کے دینی ہے۔ نقد و نقد ادائیگی۔ کھرا سودا۔ جب ہمارے ورکر ووٹ ڈالنے جائیں گے تو خریدی ہوئی پرچیاں اُن کی جیب میں ہوں گی۔ باقی کی کمی پوری کرنے کے لیے حکومت جانے یا میاں کمال اکبر جانے...... اور شہر بھر میں آپ کو ہر کوئی کہتا پھرے گا: "امین صادق! تُو بھون دانے......" امین صادق نے اُٹھتے ہوئے ہاتھ ملایا اور کہا: "ٹھیک ہے کمال صاحب! آپ اپنی عزت رکھنے کے لیے وہی کمال دکھائیں، آزمودہ طریقوں والا...... میں دانے ضرور بھونوں گا۔"

پولنگ سے تین دن پہلے، صغیرہ ایک عمر رسیدہ اور دو ادھیڑ عمر مردوں کے ہمراہ امین صادق سے ملنے آ گئی۔ محمد حسین کو گھور کر دیکھا اور امین سے کہا: ''آپ سے گفیہ (خفیہ) بات کرنی ہے۔ سب کو باہر بھیجیں۔'' سارے لوگوں بشمول محمد حسین کو دفتر سے باہر جانے کو کہا تو عورت بے دھڑک بول پڑی: ''آپ نے جو صدقہ خیرات دیا، اُس کا بہت زیادہ ثواب ہوا ہے، وہ ہم پر احسان نہیں......''

کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔ اپنے ساتھی مردوں کی طرف ایک نظر دیکھ کر امین سے مخاطب ہوئی: ''یہ بزرگ ہماری برادری کے بڑے ہیں...... اور دوسرے دونوں میرے سگے بھائی......'' لحظہ بھر کو رُک کر حکومتی سیاسی جماعت کے امیدوار کا نام لے کر کہنے لگی کہ اُس نے ہمیں ایک ہزار روپیہ فی ووٹ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے برادری سے کہا، مجھے امین صادق سے بات کرنے دو۔ وہ اچھے رحم دل انسان ہیں۔ حالانکہ آپ نے ہمارا اڈا تھانے بند کروایا، اُس نے چھڑوا دیا۔ برادری کی تین استانیوں کی تبدیلی دور دور شہروں میں ہو گئی، وہ بھی واپس کرا دی۔ ہمارے چار بندے، تھانے والے ناحق پکڑ کر لے گئے، وہ بھی رہا کرائے۔ کئی غریبوں کے گھروں کا پانی اور بجلی محکمے نے بند کر دی تھی، اس اللہ کے بندے نے خود سر پر کھڑے ہو کر سب کی بجلی لگوائی اور پانی بھی کھلوا دیا۔ بل خود دیا ہے یا معافی دلوا دی، ہمیں نہیں پتا۔ بلدیہ نے ساری آبادی کو سرکاری جگہ خالی کرنے کا نوٹس دیا تھا، اس اللہ کے بندے نے میرے بھائیوں کو ساتھ لے جا کر معاملہ دبا دیا۔ افسر نے تسلی دی اور کہا کہ آرام سے رہو، کچھ نہیں ہو گا۔ میرے سمیت ہماری بیس عورتوں کا بے نظیر والا وظیفہ بھی لگا دیا۔ پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ ووٹ آپ کو دیں۔ اب آپ بتائیں کہ ہمیں کیا دیں گے؟''

امین صادق نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جواب دیا: ''کچھ نہیں۔ اُسی کو جوش دلا کر ریٹ اور بڑھائے۔ میں بولی میں حصہ ہی نہیں لے رہا۔'' تیسرے روز انتخابات

ہو گئے۔ امین صادق کا انتخابی نشان گھوڑا تھا۔ حلقے کی بعض گلیوں کے ووٹروں نے اعلان کر رکھا تھا کہ وہ گھوڑے پر مُہر لگائیں گے۔ کمال کے کارندوں کی اوباش منڈلی ٹکڑیوں میں بٹ گئی۔ جہاں بھی امین صادق کی ووٹر خواتین آتی دکھائی دے جاتیں، اوباش لڑکے بازو ہلا کر فحش اشارے کرتے اور بولنے لگتے: "جو گھوڑے کو (ووٹ) دے گی، وہ گھوڑے...... لے گی۔" بیشتر خواتین شرم سار ہو کر واپس لوٹ گئیں۔ جو نتائج آئے، ان کے مطابق امین صادق اُنچاس ووٹوں کے فرق سے ہار گیا۔

حاجی انور نے تبصرہ کیا: "میرے عزیز! یہ ہے الیکشن جیتنے کا اصل طریقہ اور جمہوریت کا حُسن۔"

ooo

بگھیاڑ

اپنا نام س سے سائمہ لکھنے والی لڑکی کو بن دیکھے جانے ہی صائمہ بتول جعفری سے محبت ہو گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ دونوں کے عزائم ایک جیسے تھے۔ عمر نے اس کو صائمہ بتول کی پنجابی نظم کیا سنادی کہ ہر وقت لبوں پر اشعار مچلتے رہتے۔ خصوصاً دو تین مصرعے بڑی بے ساختگی سے ادا ہو جاتے: ''گلی دے اک مُنڈے دے نال نس جاواں۔ جی کردا اے مولوی صاحب نوں سرگی جا کے کُٹ لگاواں......'' (گلی کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ جاؤں۔ جی چاہتا ہے۔ مولوی صاحب کو سحری کے وقت جا کر خوب ماروں پیٹوں)

یہی عمر وہ لڑکا تھا، جس کے ساتھ بھاگ جانے کو دل چاہتا۔ لیکن ان دونوں کو ہی یہ سنگین مسئلہ درپیش رہا کہ زادِراہ کے معاملے میں تہی دست تھے۔ کوئی زیور نقدی، گھروں میں تھی ہی نہیں کہ ہاتھ صاف کرتے اور اس لعنت زدہ بستی سے بہت دور کہیں جابستے۔ شہر کی مشرقی سمت کے ایک گوشے کو چھوتی ہوئی چھوٹی سی بے ترتیب غلیظ بستی میں ایک ہی مسجد تھی، جس کے امام، مولوی شمس الرحمٰن کے خلاف سائمہ کے دل میں بچپن سے ہی پرخاش جڑ پکڑ گئی۔ مولوی شمس کے والد محترم عبیدالرحمٰن ہی دراصل مسجد

مولوی تھے۔ بہت نیک اور نرم خو انسان۔ جن کی وفات کے بعد شمس الرحمٰن نے امامت کا قابلِ احترام منصب سنبھال لیا۔ گو کہ وہ ظاہری حلیے سے اصلی مولوی دکھائی دیتا لیکن باطن سے پورے کا پورا کھوٹا تھا۔

تقریباً نو سال کی عمر تک اسکول پڑھنے کے علاوہ سائرہ دیگر بچوں کے ساتھ پچھلے پہر مسجد میں مرحوم مولوی صاحب کے پاس سپارہ پڑھنے بھی جایا کرتی تھی۔ عمر بھی ہمراہ ہوا کرتا۔ لڑکے لڑکیوں کو الگ الگ بٹھایا جاتا۔ تب شمس چودہ پندرہ برس کا ہو گا۔ مولوی صاحب اکثر بیمار رہتے تاہم امامت خود کیا کرتے۔ البتہ بچوں کو سبق دینے اور سننے کی ذمہ داری زیادہ تر شمس کو سونپ کر حجرے میں لیٹ جاتے۔ یوں تو مولوی صاحب بھی چھڑی ہاتھ میں ہی رکھتے اور لاپرواہی برتنے والے بچے کو سزا بھی دیتے لیکن زیادہ سختی نہ کرتے۔ جبکہ شمس بے رحمی سے پیٹتا مگر لڑکیوں کے ساتھ رویہ نسبتاً نرم رکھتا، خصوصاً ایسی لڑکیوں کے معاملے میں رحم دلی کا مظاہرہ کرتا، جو شکل وصورت میں بھلی لگتی تھیں۔ مفلسی میں پلنے کے باوجود بعض بچوں کی رنگت اُجلی اور نین نقش پُرکشش تھے۔ اور پھر سب بچے حسبِ حکم وضو کر کے مسجد آنے کے پابند تھے لیکن زیادہ تر صرف چہرے پر چھینٹے مار کر ٹرخا دیا کرتے۔

سائرہ کی گوری رنگت اور بانکی تیکھی چتون دیکھ کر بستی کی بڑی بوڑھیاں ہونٹوں پر انگلیاں رکھے سوچنے لگ جاتیں کہ "اُن دنوں" اس لڑکی کی ماں کس کوٹھی میں کام کرنے جایا کرتی تھی۔ سائرہ ہی واحد لڑکی تھی، جس کو سبق بھولنے پر شمس انوکھی سزا دیا کرتا۔ چھڑی ایک طرف ڈال کر اس کے دونوں گالوں کو ہاتھوں میں بھرنے کی سعی ناتمام میں ہلکے ہلکے سے مسلنے لگتا تو کبھی بدن پر طبع آزمائی کرتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ کرتا۔ اُس کی ڈانٹ محض دکھاوے کی ہوتی۔ البتہ وفورِ جذبات میں ہاتھوں کی گرفت کبھی کبھار کڑی بھی ہو جاتی۔ ایسے میں سائرہ کے لبوں سے سسکاری برآمد ہوتے ہی درواز

دتی میں مشغول ہاتھوں کے لمس کی ہیئت ہی بدل جاتی۔ ہاتھوں میں نرمی اور ملائمت یوں عود کر آتی، گویا پیار و محبت میں سہلانے کو ہی حرکت میں آئے ہوں۔

اُن دنوں شمس موقع پا کر سائمہ سے پوچھ لیا کرتا کہ اُس نے صحیح طرح پورا وضو کیا ہوا ہے یا نہیں۔ وہ جھوٹ بول دیا کرتی کہ ہاں، کیا ہوا ہے۔ مزید وضاحت چاہتے ہوئے پوچھتا: ''استنجا بھی کیا تھا؟'' اس مرحلے پر نہ جانے وہ کیوں شرما جاتی اور سر جھکا کر محض سر اثبات میں ہلا دیتی۔ مگر سنِ شعور کو پہنچ کر وہ خوب جان گئی کہ استنجے کے حوالے سے وضاحت طلب کرتے ہوئے شمس کی آنکھیں اُلٹ پلٹ کر یوں کیوں چڑھ جایا کرتی تھیں، جیسے مکھی چڑھ جانے پر ان کی ہو جاتی ہیں۔

استنجا اور وضو طہارت کے معاملے میں سائمہ ایسی بے باک ہوئی کہ صرف منہ دھو کر چل دیتی۔ اُس کو سوائے نماز اور چند آیات کے کچھ بھی یاد نہ ہوا لیکن شمس نے اس کی نالائقی پر پردہ ڈالنے میں فراخیِ قلب کا رویہ اپنائے رکھا۔ تاہم کبھی کبھی موقع پا کر دبے دبے لفظوں میں سخت تنبیہ کر دیا کرتا: ''اگر تم نے میری بات نہ مانی تو چھڑی سے اتنا ماروں گا کہ تیرے جسم پر نیل پڑ جائیں گے۔''

اُنھی دنوں سائمہ کی ماں مر گئی۔ گویا اس پر ایک اور آفت ٹوٹی۔ اکلوتا بڑا بھائی لڑکپن میں ہی گھر چھوڑ کر کراچی بھاگ گیا تھا۔ دادی اتنی بہری تھی کہ دیوار سے بھی آواز ٹکرانے پر ہلکی سی گونج پلٹ آتی، مگر بوڑھی عورت دیدے پھاڑے دیکھتی رہ جاتی۔ وہ صرف چہرے کے تاثرات پڑھ کر یا اشاروں کنائیوں سے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق نتیجہ اخذ کر کے ردِعمل ظاہر کرتی۔ اتنا اونچا بولتی کہ پوری بستی میں سنائی دیتی۔ بے تاثر چہرے والے کی گالیاں سن کر دعاؤں کے ڈونگرے برسانے لگتی اور بظاہر تُرش رُو کے لبوں سے خواہ کلمۂ خیر ہی کیوں نہ ادا ہو رہا ہو، خبطی بڑھیا بھڑک اٹھتی۔

باپ دن بھر بائیسکل پر شہر کی گلیوں میں خوار ہوتا۔ جو بھی ردی شے، مُفت یا

دام کے بدلے میں دستیاب ہوتی، سمیٹ لیتا۔شام ہونے سے پہلے پہلے کباڑ خانے میں بیچ کر اپنا دارُو اور ضروری سودا سلف لے کر گھر لوٹ آتا۔دارُو پی کر یوں پُرسکون ہو جاتا، گویا رُوح پر لگے زخموں پر مرہم رکھ لیا ہو۔

ماں کی وفات کے بعد دادی نے سائمہ کو حکم دیا کہ جب تک اُس کی بہُو کا قبر میں حساب ہو رہا ہے،ایک بندے کی روٹی ہر روز شام کو مولوی صاحب کے گھر میں لازماً دے کر آیا کرے۔دونوں گھر ایک ہی گلی میں چالیس پچاس قدم کی دوری پر تھے۔اس بستی کی ساری گلیوں کی لے آؤٹ،ٹاؤن پلانر کی بجائے کسی سُست رو بیمار بیل نے مُوتتے ہوئے کر ڈالی تھی۔

سرِ شام ہی دادی کو ہول اُٹھنے لگتا کہ منکر نکیر غضب ناک ہو رہے ہیں لہٰذا جلد سے جلد روٹی تیار کر لی جائے۔ہدایات دیتے ہوئے اُس کی آواز مسجد کے اسپیکر پر بھی غالب آ جاتی۔ٹرے یوں سجائی جاتی کہ دو پُھلکے،سالن یا ترکاری کی رکابی اور دودھ کا پیالہ رکھا جاتا۔صاف کپڑے سے ڈھانپ کر سائمہ ٹرے اٹھائے مولوی صاحب کے ہاں چلی جاتی۔

سائمہ کو اپنے گالوں اور بدن کے اُن حصوں کا گوشت پھڑکتے ہوئے محسوس ہونے لگتا، جہاں شمس نے وقتاً فوقتاً مسلا ہوتا۔تاہم اُس کو اپنی ماں کی بھلائی بہت عزیز تھی۔منکر نکیر کے خوفناک چہرے آنکھوں کے سامنے آ جاتے۔اُس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ماں جن گھروں میں کام کرنے جایا کرتی تھی، وہاں سے بخشیش اور مانگے تانگے کی اشیا کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ اُڑا لایا کرتی تھی۔معصوم دل میں یہ خواہش توانا ہوتی گئی کہ مولوی صاحب خود یا اُن کی بیوی کھانا کھائے تا کہ منکر نکیر اِس کی ماں پر زیادہ سختی نہ کریں۔چشمِ تصور سے قبر کے اندر دیکھنے لگتی۔ایسے ایسے ہولناک مناظر دکھائی دے جاتے کہ لرز اُٹھتی۔

ساتویں روز دادی کی اپنی غلطی سے ہنڈیا جل گئی۔عجلت میں خاگینہ کی پلیٹ تیار کی۔پھر بھی اتنی دیر ہوئی کہ عشاء ہونے میں نصف گھنٹے کا وقت باقی رہ گیا۔سائمہ ٹرے اٹھائے جوں ہی مولوی صاحب کے گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ شمس کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں۔اُس نے سائمہ سے ٹرے لے کر میز پر رکھی اور دروازے کی سنگل کنڈی چڑھالی۔پلٹ کر سائمہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور ایسی نظروں سے دیکھا کہ اُس کو ملکوں کی کوٹھی یاد آ گئی،جس کے گیٹ میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ بھیاڑی نسل کا خوفناک کتا بندھا ہوتا تھا۔

سائمہ تھرتھر کانپنے لگی اور ایک لفظ بھی بول نہ پائی۔خوف سے حلق میں گرہ پڑ گئی۔وہ پچکار کر بولا: ''ڈرو نہیں۔تجھے ایک ضروری بات بتانی ہے۔سارے گھر والے دعوت پر گئے ہوئے ہیں۔مغرب پڑھ کر میں صف پر ہی لیٹ گیا اور آنکھ لگ گئی۔کیا دیکھتا ہوں کہ تمہاری اماں کو فرشتے گرزوں سے مار رہے ہیں۔وہ کہہ رہے تھے کہ امام مسجد کے گھر میں اس طرح کی روٹی بھیجی جاتی ہے؟؟...... کچی پکی اور کبھی سڑی ہوئی بھاجی دال۔ذرا سا دودھ...... گوشت مرغا حلوہ کھیر اور پھل فروٹ وغیرہ ایک دن بھی نہیں بھیجا۔یوں مردے کے گناہ معاف نہیں ہوتے۔تمہاری اماں نے مجھ سے فریاد کی،رو رو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ میں اُس کی سختی معاف کرواؤں......''

یوں باتیں کرتے کرتے شمس نے نو دس سالہ لڑکی کو چپٹا تاڑ کر لیا اور بغلوں میں ہاتھ ڈال کر بستر پر لٹاتے ہوئے لاگ لاگوٹ سے بولتا گیا: ''مجھے ایک بڑا زبردست وظیفہ آتا ہے۔آج سونے سے پہلے کروں گا۔اس کا بڑا اثر ہوتا ہے۔فرشتوں کو یقین دلاؤں گا کہ روٹی ہمیں پسند ہے۔غریب بندے کو اس سے زیادہ کی توفیق نہیں ہوتی،اس لیے سکینہ کی سختی معاف کر دو۔'' اس اثنا میں شمس نے اپنے اصل عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ابتدائی مراحل بڑی افراتفری میں طے کر لیے۔ہیجانی کیفیت

طاری ہونے سے اُس کی اپنی حالت غیر ہونے لگی۔عملاً پیش رفت کرنے کو درکار ٹھہراؤ اور صبر کا یارا نہ رہا۔تاہم دیوانگی فزوں تر ہوئی۔طغیانی پر آئے جذبات کے بلند و بالا ریلے پر سوار، لڑکھڑاتی آواز میں بولا: ''اگر تم نے شور مچایا یا بعد میں بھی کسی کو بتایا تو میں تمہاری ہڈی پسلی ایک کردوں گا اور فرشتے تمہاری اماں کو گرز مار مار کر اُس کی بوٹیاں اُڑا دیں گے......''

اُسی لمحے دروازہ یوں دھڑ دھڑ بجنے لگا، گویا کوئی پاگل دیوانہ ٹکریں مار رہا ہو۔اچانک سُنگل کُنڈی گر گئی اور دونوں پٹ چوپٹ کُھل گئے۔مولوی صاحب اندر آئے اور دروازہ بھیڑتے ہی بیٹے پر پل پڑے۔سائمہ کی ہمت عود کر آئی اور روتے ہوئے شلوار پہننے لگی۔شمس کے بدن پر بھی صرف قمیص تھی، جس کا گریبان مولوی صاحب کے ہاتھ میں تھا۔وہ اُس پر جُوتے برسا رہے تھے۔فوراً ہی ہف گئے اور چارپائی کی پٹی کا سہارہ لے کر بیٹھتے ہوئے سائمہ پر ایک نگاہ ڈالی۔بستر کی چادر کو غور سے دیکھا۔کچھ تسلی سی محسوس کرتے ہوئے سائمہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولے:

''میری پیاری بیٹی کسی کو کچھ نہیں بتائے گی......اپنے ابا کو بھی......میں اس بدمعاش کی آج کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔تم نے اب مسجد میں پڑھنے بھی نہیں آنا......تجھے نماز آتی ہے۔گھر میں پڑھا کرنا اور روٹی بھی مت لایا کرو۔تمہاری ماں نے ساری زندگی محنت مزدوری کی۔وہ جنتی عورت ہے......جاؤ شاباش!''

بیٹے سے مخاطب ہو کر بولے: ''یہ لڑکی تمہاری بہن ہے۔آج کے بعد اِس کو بُری نظر سے دیکھا تو یہی سمجھ لو کہ اپنی سگی بہن زینب کے ساتھ بُرا کام کیا......بدبخت انسان! میرا بھی صحیح ثابت ہوا۔الحمداللہ کہ میں بروقت پہنچ گیا۔''

گھر پہنچ کر بھی سائمہ بُری طرح سہمی رہی۔دل میں خوف سما گیا۔اُڑتی اُڑتی ذومعنی باتیں پہلے ہی سن رکھی تھیں کہ کم عمری میں لڑکیاں زخمی ہو جاتی ہیں۔اُنھیں ہسپتال

لے جانا پڑتا ہے۔ پولیس بھی آ جاتی ہے اور بدبختوں کو ہتھکڑیاں ڈال کر جیل لے جاتے ہیں۔ اور پھر بدنامی بھی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی اِکا دُکا وارداتیں بستی میں ہو چکی تھیں، جن کا خوب چرچا ہوا اور اخباروں میں خبریں بھی چھپیں۔ ابھی تک عورتیں اور لڑکیاں ان واقعات کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔

خوف اور وحشت میں مبتلا ہونے کے باوجود سائمہ عجیب طرح کی سنسنی خیزی بھی محسوس کر رہی تھی۔ گویا اب بھی شخص کے تپے ہوئے بدن تلے دب رہی ہے۔ گو کہ اُن لمحات میں "بدبخت انسان" نے کھلبلی مچادی تھی اور وہ اپنی آنکھوں سے کچھ بھی دیکھ نہ پائی تھی۔ چونکہ چند لمحوں کو محیط کارروائی زیریں بدن تک محدود رہی۔ تاہم پنہائیوں میں انوکھے لمس سے اس کی اپنی قوتِ لامسہ ایسی متحرک ہوئی کہ یاد آنے پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

نہ جانے مولوی صاحب نے کس دل سے عشاء پڑھائی اور مسجد سے سیدھے سائمہ کے گھر چلے آئے۔ خلافِ معمول اس کے باپ کے ساتھ معانقہ کیا۔ تسلی دلاسا دے کر سمجھانے لگے کہ روٹی بھجوانے کی ضرورت نہیں۔ یہ مولویوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ اور بچی ماشاءاللہ سمجھ دار ہو گئی ہے۔ مسجد میں آنے کی بجائے گھر میں ہی باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی عادت ڈالے۔

سائمہ گُنگ ہوئی بیٹھی سنتی رہی۔ اُس کے باپ نے مولوی صاحب سے کہا:

"میں گنہگار شخص ان باتوں کو نہیں سمجھتا۔ بوڑھی ماں کی حکم عدولی نہیں کرسکتا۔ وہ ہر روز ڈنڈے کے زور پر روٹی بھجواتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یوں مرنے والی کا قبر میں جاری حساب کتاب آسان ہو جائے گا۔ آپ نے جو کہنا ہے، اسی کو بتائیں......" باپ نے بیٹی سے کہا کہ دادی کو جھنجوڑ کر جگائے۔

بُوھیا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ حواس بحال ہونے پر مولوی صاحب کو دیکھا۔ اپنی

بینائی پر شک گزرا۔دونوں آنکھوں کو مسلا اور دوبارہ غور سے دیکھنے لگی۔مولوی صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔ وہ عورت سچے دل سے مولویوں، پیروں فقیروں کے علاوہ ہر طرح کی مذہبی شخصیات کو نجات کا وسیلہ تصور کرتی تھی۔

بوڑھے بدن میں توانائی دوڑ گئی۔ غیر معمولی پھرتی سے اُٹھی اور آگے بڑھ کر مولوی صاحب کے گھٹنے چُھو لیے۔اُنھوں نے مزاحمت کرنے کی بجائے احتراماً دونوں کلائیوں سے تھام لیا اور اُسے آرام سے دوبارہ چارپائی پر بٹھا دیا۔اِس مہارت سے اشاروں کی زبان کا استعمال کیا کہ کم سن لڑکی بھی بہت کچھ سمجھ گئی۔ ہاتھ سے نوالے بنائے، ٹرے سجائی۔ انکار میں انگشتِ شہادت ہلائی۔ اللہ کی طرف اشارہ کیا۔ ناک پر اُنگلی رکھ کر مرحومہ کا حوالہ دیا۔دونوں ہاتھ باہم جوڑ کر دائیں گال سے لگائے اور آنکھیں موندتے ہوئے سر کو قدرے جھکایا......عندیہ دیا کہ مرنے والی بڑے سکون میں ہے۔

نیم پاگل عورت خوشی کے جذبات میں غوطہ زن ہوئی اور ڈوپٹے کی بجائے قمیص کے دامن سے جھولی بنائی۔ اللہ کے حضور پھیلانے تک محدود نہ رہی اور زیادہ ہی بلند کر دی تاکہ زبان سے ادا ہونے والے کلمہ ہائے شکر اور جھولی میں بھری التجاؤں کا فاصلہ اللہ میاں سے ممکنہ حد تک کم ہو جائے۔ بندگی کے اِس عاجزانہ مظاہرے میں ہوش ہی نہ رہا کہ عمر رفتہ میں جو شاید واقعی زینتیں ہوں گی، لمحۂ موجود میں نچڑی ہوئی، سوکھے پیٹ کی تجلجلی جلد سے چپکی، کپڑے کی اوٹ سے جھانکنے لگی ہیں۔ نیفے سے آدھا جُھولتا اور کچھ اُڑسا ہوا میلا کچیلا اُزار بند بھی دکھائی دے گیا۔

مولوی صاحب ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور سائمہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر بولے: ''یہ میری سیانی اور نیک بیٹی ہے۔ میری نصیحت پر عمل کرے گی۔''

دادی نے سمجھا کہ مولوی صاحب نے اُس کے لیے کچھ کہا ہے۔دامن کی

خلاصی کرتے ہوئے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بازوؤں کی پوری لمبائی تک بلند کیے
اور گلے کے اسپیکر کا فل والیم کھول کر دعائیہ کلمات ادا کرنے لگی: ''میرا اللہ سوہنا، مولوی
صاحب کو مکے مدینے شریف کا سب سے بڑا مولوی بنائے گا...... جس نے مرنے والی کو
قبر میں آرام دیا۔ وہ میری بھانجی اور بہو ہی نہیں، سگی بیٹیوں سے زیادہ پیاری
تھی۔ میرے نکمے شرابی بیٹے کا بڑے صبر سے ساتھ دیا......''

مولوی صاحب کے شریف النفس انسان ہونے میں کوئی شک نہ تھا۔ لیکن وہ
تاحال حج عمرہ کی سعادت سے بھی محروم چلے آرہے تھے۔ جس مکتبۂ فکر سے ذہنی طور پر
قریب تھے، ان کے سرکردہ علما کی عشقِ رسولؐ میں ڈوبی ہوئی رقت آمیز دعاؤں کے
الفاظ یاد آ گئے: ''اے ربِ کریم! ہمیں ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا
روضہ مبارک واگزار کرا......''

گویا دیوانی عورت کی دعا اس صورت میں بھی جزوی طور پر ہی قبول ہو سکتی
تھی، جس کے امکانات سرِ دست ذرا سے بھی روشن ہوتے نظر نہ آئے۔ لہٰذا مولوی
صاحب سلام دعا کر کے نکل گئے۔

بستی سے شہر میں داخل ہوتے ہی گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول تھا، جس سے
میٹرک پاس کر کے سائرہ دو سال سے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ البتہ عمر نے انٹرمیڈیٹ پاس
کر لیا۔ اُس کے باپ نے ساری زندگی، ملکی سطح کی بڑی سیاسی پارٹی کے مقامی سربراہ کی
جوتیاں سیدھی کرنے میں گزار دی۔ پارٹی پر ابتلا کا دور اختتام پذیر ہوا اور وہ برسرِ اقتدار
آئی تو عمر بطور کانسٹیبل، پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ وہ سائرہ کے گھر آیا اور اُس کے باپ
سے استدعا کی: ''چاچا غنی! مجھے اپنا بیٹا بنا لو، تیری ہر شرط قبول ہے......''

ٹوٹے ہوئے ملول باپ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بولتے ہوئے ابتدا میں ہی
غوطہ لگا اور خاموش ہو گیا۔ ذرا دیر کو دم لیا اور بول پڑا: ''اڑوس پڑوس اور بستی والے

بھونکتے پھرتے ہیں کہ میں کوئی موٹی اَسامی تلاش کر رہا ہوں، تا کہ بیٹی کے دو چار لاکھ روپے کھرے کرلوں۔ان پر اللہ کی لعنت ہو۔شرابی ہوں لیکن بے غیرت نہیں۔اولاد، ماں اور مرحومہ بیوی سے دلی محبت کی۔سائمہ کے ساتھ سب سے زیادہ۔بڑھاپے میں بھی اُسی طرح مزدوری کرتا آ رہا ہوں۔کبھی چھوٹی موٹی بیماری کی بھی پرواہ نہ کی۔کوئی بس نہیں چلا، میں کیا کروں؟ کوئی شرط نہیں۔ایک ہی پریشانی ہے کہ بیٹی کے رخصت ہونے پر معذور ماں کا کیا بنے گا؟ میں گھر نہیں بیٹھ سکتا......"

عمر نے غم زدہ شخص کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔اُس کو ایک ٹک دیکھے گیا۔وہ گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ذہن میں کوئی فیصلہ کر کے بول پڑا: "میں کباڑیا ہوں۔پیسے نہ ہونے کی وجہ سے میٹرک کے امتحان کی فیس داخلہ ادا نہ کر سکا۔لیکن اللہ نے سمجھ بُوجھ دی ہوئی ہے۔عورت بھی مرد کی طرح انسان ہے۔دونوں کو ایک ہی طرح کوئی دل سے اچھا یا بُرا لگ سکتا ہے۔میں جانتا ہوں، تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔میری عقل بھی کہتی ہے کہ کسی کو پسند کرنے میں کوئی برائی نہیں۔صرف ایک ہی مسئلہ ہے کہ ماں کی زندگی میں بیٹی کو گھر سے رخصت نہیں کر سکتا۔گھر جوائی رہنا اور رکھنا ایک ہی طرح کی برائی سمجھتا ہوں۔تمہارے باپ کو بھی پسند نہیں۔میں نے سرسری بات کی تھی۔تم سوچ لو۔محبت میں بندے کو قربانی دینی پڑتی ہے۔جب تک زندہ ہوں، گھر کا خرچ خود اٹھاؤں گا۔تم بندھی تنخواہ اپنے باپ کے ہاتھ میں دے دیا کرنا......"

جاتے ہوئے عمر اتنا ہی کہہ پایا: "اللہ بہتر کرے گا چاچا! تم پریشان نہ ہوا کرو۔اپنے ماں باپ کو راضی کرنا میرا کام ہے۔"

عمر کے پاس زادِراہ کی کمی نہ رہی۔لیکن وہ نئی نئی پولیس کی نوکری کو خطرے میں کیوں ڈالتا۔اور پھر سائمہ خود بھی صرف بھاگنے کی باتیں ہی کرتی رہی۔کبھی سنجیدگی سے ایسا سوچا بھی نہیں۔سہیلیوں کو بھی نظم بہت پسند آئی۔مل بیٹھ کے ضرور دہرایا کرتیں

اور محض خوش ہو لیتیں۔ البتہ مولوی کی پٹائی کرنے کے حوالے سے سائرہ کی دیرینہ خواہش ہر نئے دن کے ساتھ توانا ہوتی رہی۔ چونکہ مولوی عبیدالرحمٰن صاحب کو فوت ہوئے تین برس ہونے کو آئے تھے۔ ان دنوں شمس الرحمٰن، مولوی تھا، جو سائرہ اور اڑوس پڑوس کی لڑکیوں کا ہدف بنا رہتا۔ ان کی محفل جب بھی جمتی، ہر بات کی تان انھی الفاظ پر ٹوٹتی:

''مولوی نوں کٹ لگاواں......''

دو تین سال کے عرصہ میں مولوی شمس الرحمٰن کے شان ہی نرالے ہو گئے۔ دیکھنے میں کوئی کامیاب متمول تاجر معلوم پڑتا۔ اُس نے آج تک سائرہ کا پیچھا نہ چھوڑا۔ موقع پا کر گھر آ جاتا۔ ایسی اداکاری کرتا کہ سائرہ حیران ہو جاتی۔ ظاہر یہی کرتا کہ بزرگ خاتون کو دعائیں دینے آیا ہے۔ اُس کی شخصیت ہی ایسی بارُعب ہو گئی کہ کوئی بھی اجنبی دل سے احترام کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ تندرست اور توانا جسم، پانچ فٹ دس انچ کے لگ بھگ قد، گندمی رنگت۔ گول چہرے پر نفاست سے تراشی ہوئی سیاہ کالی گھنی داڑھی۔ بے داغ اور بےشکن، سفید براق شلوار قمیص پر سلور گرے رنگ کی واسکٹ اور اسی سے ملتے جلتے شیڈ کی قراقلی ٹوپی۔ وہ یوں بھی قبول صورت تھا۔ محدود دینی علم ہونے کے باوجود، مکالمہ کرنے میں ایسا ماہر کہ عام لوگوں پر چھا جایا کرتا۔ عمر یہی کوئی چوبیس پچیس برس ہوئی ہوگی مگر ایسی بھاری بھرکم شخصیت کہ بھرپور مرد دکھائی دیتا۔

سائرہ ابھی تک وہ لمحات بھولی نہیں تھی، جو کسی بڑے سانحہ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے تھے۔ اس عمر میں وہ اچھی طرح سمجھ گئی کہ ایک دو پل کی کسر ہی رہ گئی تھی۔ سامنا ہونے پر مولوی کی آنکھوں میں وہی تشنۂ تکمیل آرزو بھڑکتی ہوئی محسوس ہو جاتی۔ بستی کی لڑکیوں کو اندازہ تھا کہ کون کون سی شکار ہوئی اور اب بھی کس کے ساتھ وہی تعلق قائم ہے۔ سائرہ پر بھاری مصیبت یوں آن پڑی کہ دادی اس بہروپیے کو اصل مولوی جان کر عقیدت سے گھٹنے چھو لیتی۔ وہ ریاکار شخص، بوڑھی مخبوط الحواس عورت کے زودِ و

آنکھیں نیم وا کیے دستِ دعا بلند کرتا اور کچھ دیر تک ہونٹوں کو مسلسل حرکت دیے رکھتا۔ آخر میں لب سکوڑ کر زوردار پُھو پُھو سے ہوا کے بھبکے بوڑھے بدن پر یوں چھوڑتا کہ اُس کو دم دُرود ہونے کا یقین ہو جائے۔

جاہل عورت دل کی گہرائیوں سے نہال ہو جاتی۔ گویا اُس کو کامل اطمینان محسوس ہوتا کہ عمر بھر روزہ نماز سے دور رہ کر بھی محض مولوی کی پُھو پُھو کے طفیل اللہ کے حضور بخشش گئی ہے۔ حالانکہ ہونٹ بدبداتے ہوئے آنکھیں میچے وہ اکثر سائرہ سے مخاطب ہو کر باتیں کرنے لگتا۔

ڈرامے کی ایسی ہی ایک اَیپی سوڈ جاری تھی۔ ماہر اداکار، آنکھیں میچے، دستِ دعا بلند کیے، دادی کے رُوبرُو کھڑا بول رہا تھا: ''عمر دو ٹکے کا کانسٹیبل ہے۔ میری حیثیت کا تجھے اندازہ نہیں۔ میں بہت آگے جا چکا ہوں۔ آخرکار اس ملک میں ہماری حکومت قائم ہونی ہے۔ آج کے گورنروں وزیروں سفیروں اور حکمرانوں کا صفایا ہو جائے گا۔ ان میں سے کسی ایک کی کرسی پر کل کلاں تم مجھے بیٹھے دیکھ کر فخر کرو گی کہ تیرا میرا آپس کا خاص تعلق ہے۔ اور میں یہ تعلق ہمیشہ قائم رکھوں گا۔''

بڑی مشکل سے سائرہ نے غصہ ضبط کیا ہوا تھا۔ کہنے لگی: ''شرم کرو۔ مرحوم باپ کی نصیحت بھول گئے ہو۔ میں تمہاری بہن ہوں......'' دادی نے اپنے اوپر خیر و برکت کے کلام کا فیض جاری ہونے کا تصور کر کے سر جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ شمس نے مشتعل ہوئے بغیر کہا: ''میرے باپ کا عقیدہ کمزور اور دینی فہم ناقص تھا۔ ہمارے مذہب میں منہ بولے رشتے کو قطعاً کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اللہ اُن کی لغزشیں معاف فرمائے۔ اُن کی نیت ٹھیک ہی ہو گی۔ الحمدللہ، میں نے اپنی اصلاح کر لی ہے۔ ویسے بھی اُس قبیل کے مولویوں کے زمانے لد گئے۔ اب ہمارا دور ہے۔ میں کچھ اہم تنظیمی معاملات میں مصروف ہوں۔ اس مسجد میں اپنا نائب مقرر کر دیا ہے۔ صرف

تمہارے لیے آتا ہوں۔ گھر اسی لیے خالی رکھا ہوا ہے..... شہر میں بہترین رہائش ہوتے ہوئے بھی۔ صرف تمہاری خاطر۔ آج رات......"

"نکل جاؤ میرے گھر سے۔" سائمہ پھٹ پڑی اور شعلہ بار نگاہوں سے شمس کو گھورنے لگی۔ وہ کمال ڈھٹائی سے مسکرا دیا اور بولا: "تم سہیلیوں کو جس کافر و کا کلام خوش ہو کر سناتی ہو، ساری باتیں مجھ تک پہنچ گئی ہیں۔ وہ دن دور نہیں، جب ایسی ہر بدعقیدہ عورت ہماری لونڈی بنے گی۔ تم راہِ راست پر آ جاؤ۔ تیرا کچھ بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ صرف ایک آدھ لمحے کی کسر رہ گئی تھی۔ پلیسئے سے نکاح کر لیتا۔ مگر پہلے میری خواہش پوری کر دو۔ آج سحری کو مجھے کُٹ چڑھانے آ جاؤ۔ تجھے دونوں طرح سے مالا مال کر دوں گا۔ میرے پاس بڑی دولت ہے......"

اُس نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے جھانکتی ہزار ہزار روپے کے نوٹوں کی گڈی دکھائی۔ ذومعنی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہنے لگا: "اور دوسری دولت کا بھی خزانہ بھرا ہوا ہے۔ ایک بار آزماؤ۔ نہیں تو اپنی پڑوسن سہیلی سے پوچھ لو......"

سائمہ سیخ پا ہو کر آگے بڑھی مگر دبے پاؤں۔ چارپائی سے ذرا ہٹ کے، تاکہ فرش میں دھمک اور چارپائی میں جنبش نہ ہو۔ دادی پر جذب کی کیفیت بدستور قائم رہے۔ شمس فوری طور پر سمجھ نہ پایا کہ وہ اتنی قریب کیوں آئی ہے۔ سائمہ بول پڑی: "اگر باپ کی نصیحت کے مطابق بہن کے لفظ کی کوئی حرمت نہیں تو تیرا مسئلہ حل ہو گیا۔ زینب سے چھوٹی دو اور بھی ہیں۔ دونوں خزانے جی بھر کے لٹاؤ۔ گھر کی دولت گھر میں رہے گی۔" اُس نے آناً فاناً شمس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ ہک دک ہوا دیکھتا رہ گیا۔ ذرا توقف کر کے بولا: "یہ تیرا مجھ پر ادھار رہ گیا۔ بہت جلد چکاؤں گا۔"

ooo

پکڑ

میں نے سٹی پولیس چیف سے کیا ہوا وعدہ ایفا کرنے کی ٹھان لی۔ فرض شناس افسر نے مجھے اپنے آفس میں بلا کر اعتماد میں لیتے ہوئے کہا تھا: "اعجاز! تم تعلیم یافتہ پولیس افسر ہو۔ ہماری نئی نسل تباہ ہو رہی ہے۔ میں نے اس شہر کا چارج سنبھالتے ہی دل سے وعدہ کیا تھا کہ جس علاقے میں لڑکوں کے ہاسٹل کالج اور اسکول ہیں، وہاں منشیات سپلائی کرنے والے کو سب سے پہلے پکڑوں گا، باقی کے کام بعد میں ہوں گے۔ تم نوجوان ہو اور اِزجیک۔ وردی اتار دو۔ پھر سے اسٹوڈنٹ کے رُوپ میں آ جاؤ۔ دو چار دس دن اُس علاقے میں زیادہ وقت گزارو اور نگاہ رکھو۔ مجھے اصل کلپرٹ چاہیے۔ کوئی چھوٹا موٹا پُڑی باز جہاز پکڑ کر مت لے آنا......"

سخت سردی اور دھند کی لپیٹ میں آیا ہوا شہر اور میں جینز جوگرز پہنے، ہُڈی میں لپٹا ہوا بغل میں نوٹ بک اور کتاب دبائے، دن رات کے مختلف اوقات میں خوار ہوتا پھرا۔ کئی دن گزر گئے۔ کسی ٹک شاپ، لائبریری، چائے خانے اور پان سگریٹ کے کھوکھے سے سراغ نہ ملا۔ براہ راست انکوائری کرنا خلاف مصلحت جانتے ہوئے گہری نظروں سے جائزہ لیتا رہا۔ ہفتہ بھر یوں ہی گزر گیا۔ آخر کار ایک خستہ حال، نشے سے

ٹوٹے ہوئے لڑکے سے یوں راہ ورسم کرلی کہ اُس کو اپنے پاس سے پُوی دی۔کھلایا پلایا اور دوستی کرلی۔اُس کو جتنا معلوم تھا، بتا دیا۔کہنے لگا:"ہاسٹل کے باورچی، کالج کے مالی، سکولوں کے چوکیداروں اور دوسرے چھوٹے اڈّوں پر مال سپلائی کرنے والا دو تین دن لیٹ ہوگیا ہے۔کالی سیاہ گھنی داڑھی اور کھِلتی ہوئی رنگت والا وہ شخص بوڑھا ہے نہ جوان۔درمیانہ قد، ذرا بھاری بدن۔سر پر نماز والی ٹوپی اور کمبل اوڑھے ہوئے،بایاں پاؤں ذرا سا دبا کر چلتا ہے۔سفید کرولا سے اُتر کر"ہمراز پان سگریٹ شاپ" کے ساتھ والی گلی کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھتا ہے۔مسجد سے نکل کر واپس آنے کی بجائے آگے گلی میں چلا جاتا ہے......کار والا اُس کو اتار کر سیدھا نکل جاتا ہے۔"

میں نے اُسی مسجد میں نماز پڑھنا شروع کردی۔فجر کے وقت اتنی دھند ہوتی کہ چند گز کے فاصلے پر بھی منظر صاف دکھائی نہ دیتا۔تیسرے روز میں نے دیکھا کہ ایک گٹھے ہوئے بدن والا باریش شخص کمبل اوڑھے مسجد کے داخلی دروازے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بائیں ٹانگ پر قدرے احتیاط سے دباؤ ڈال کر داہنا پاؤں اٹھا رہا ہے۔میں نے وضو کرنے کے لیے تیزی سے قدم بڑھائے۔وہ طہارت خانے میں گھس گیا اور میرے وضو سے فارغ ہونے کے باوجود باہر نہ آیا۔میری خواہش تھی کہ وہ نظروں کے سامنے رہے اور جب ہال میں چلا جائے تو میں بھی اس کے ساتھ ہی دو رکعت سنت ادا کروں اور پھر جماعت ہونے تک ساتھ رہوں۔ایک ساتھ دونوں مسجد سے باہر آئیں۔اگلے لائحہ عمل پر اکیلے کوئی قدم اٹھانے کی بجائے مجھے مدد کے لیے پولیس اسٹیشن اطلاع کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔تاہم اپنے دستِ راست اے ایس آئی نوازش علی کے نام کا ایس ایم ایس سٹینڈ بائی کیے ہوئے میں چوکنا ہوا رہا۔اُس کو معلوم تھا کہ میں اِس وقت کس مسجد میں ہوں۔میں نے سگنل روانہ کردیا۔

ہال میں زیادہ تر نمازی سنتیں ادا کرچکے تھے۔نماز شروع کرنے پر ذہن آمادہ

نہ ہوا اور میری نظریں پیچھے لگی رہیں۔ وہم ہونے لگا کہ کہیں وہ نکل نہ لے۔ یہی مناسب سمجھا کہ جب تک وہ آ نہ جائے، نیت نہ باندھوں۔ جماعت کا وقت ہونے کو آیا۔ میری نگاہیں وضو خانے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں حیران رہ گیا۔ وہ نامراد غسل خانے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اُس کے پیچھے لپکا۔ وہ دائیں طرف تنگ گلی کا موڑ مُڑا ہی تھا کہ میں نے جالیا اور ریوالور کی نالی پیٹھ پر رکھتے ہوئے بائیں ہاتھ سے کمبل کھینچتے ہی کوٹ کا کالر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ غرا کر کہا: "ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ ذرا حرکت کی تو گولی سینے کی طرف سے نکل جائے گی۔" اُس نے فوراً تعمیل کرتے ہوئے دونوں بازو سر سے اوپر اٹھا لیے اور بڑی بے ساختگی سے بول گیا: "خانہ خراب!! آج نماز نہ پڑھی اور ایک دم پکڑ ہو گئی......"

ہنسی ضبط کرنا اتنا مشکل کبھی نہ ہوا ہوگا۔ اِن عجیب بے محل الفاظ پر حیرت کی انتہا ہو گئی۔ تاہم سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے اسی تحکمانہ لہجے میں کہا: "بدبخت! کیوں نہیں پڑھی نماز؟؟"۔ وہ شکست خوردہ آواز میں بول پڑا: "صاحب! کیا کرے؟ ہم بھی انسان ہے۔ رات کو سردی میں جھا لگ گیا تھا۔ نماز تو پاک بدن سے ہوتا ہے جناب! ہم مسلمان ہے، کافر نہیں......"

ooo

کھنگورا

اُونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے نہ آئے، اپنے سے اُونچا کسی کو نہیں جانتا۔
یعقوب عُرف بُوبا زَچھہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اچھے بھلے نام کو اپنے ہی گھر والوں نے بگاڑ کر اُس کو بچپن میں بُوبا کہنا شروع کر دیا اور جوانی ابھرنے کے ساتھ ہی اُس نے حرکتیں ایسی شروع کر دیں کہ برادری اور اہلِ محلّہ نے ''زچھہ'' کا لاحقہ بھی عرفیت کے ساتھ ٹانک دیا۔ ماں نے اس بیٹے اور بیٹی کو پالنے کی خاطر بڑی بیگمات کی خدمت کرتے ہوئے جوانی خاک کر دی۔ اس کا ثمر یہ ملا کہ جس دور میں خاکروب کی سرکاری نوکری کے لیے بھی بولیاں لگنا شروع ہو گئیں، یعقوب کو انکم ٹیکس کے محکمے میں نائب قاصد کی ملازمت مل گئی۔ بڑے صاحب نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ متعلقہ وزیر نے اس ادنیٰ پوسٹ کی مروجہ فیس مانگ بھی لی تو اپنی جیب سے ادا کر دے گا لیکن یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو وہ ایک محنتی ایماندار اور اَنا والی مزدور پیشہ غریب عورت کی مدد نہ کر پائے گا۔ پنجابی ہوتے ہوئے بھی بڑے صاحب کو یہ نہیں پتا تھا کہ ''زچھہ'' کثیر المعانی لفظ ہے، جس کا مطلب صرف ''ہتھیار'' ہی نہیں، بلکہ ''لفنگا'' اور ''اوباش'' بھی ہے۔

آسودہ گھروں کی خدمت گار عورتوں کو اُترنیں اور اوچھن پوچھن ہی نہیں بلکہ اچھی اچھی اشیائے خورونوش بھی ہمراہ لے جانے کے لیے مل جایا کرتی ہیں۔ لہٰذا ان کی زیرِ کفالت نکمّے کام چور خاوند مع اولاد، غذائی قلت کا شکار نہیں ہوا کرتے۔ انھی

فیوض و برکات کے طفیل نُو بازچہ نے پلے پلائے ڈنگر کا ساقد کاٹھ نکالا، چھوٹی بہن خالدہ، سولہ سترہ برس کی عمر میں ہی بھرپور جوان ہو گئی۔ البتہ اس کے باپ، سخاوت عُرف سخیا چری کی زیادہ تر دلچسپیاں چونکہ غیر صحت مندانہ تھیں، اس لیے کچھ بیمار بیمار سا نظر آتا۔ عمر بھی اپنی بیوی سے تقریباً بیس سال زیادہ تھی۔ "سر گالا منہ بالا" کے مصداق دل جوان۔ طور طریق سے لونڈا پن جھلکتا۔ ساٹھا ہو گیا مگر پاٹھا نہ رہا۔ دو تین مشاغل، روگ کی طرح پال رکھے تھے اور ان سے حتی المقدور لطف اندوز ہونے میں پیدائشی سُستی کاہلی بھی کبھی آڑے نہ آئی۔

پہلا شوق یہ کہ بڑے اہتمام سے سر اور مونچھوں کے بال سیاہ کالے رنگنا اور پھر اس فضول کاوش سے بھرپور استفادہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا۔ اپنے سے چند سال کم عمر عورت مرد کو بھی بے دھڑک "آنٹی انکل" کہہ کر مخاطب کر لیا کرتا، بس یہ کہ زد پر چڑھنے والے اپنے سفید بالوں کو رنگنے سے چُوک گئے ہوں۔ اس سلسلے میں اپنی بیٹی کی ہم عمر لڑکیوں کو تاڑنے میں بھی خود کو حق بجانب سمجھتا۔ وہ بھی اس بیہودگی سے کہ ایک ہاتھ مونچھوں کو تاؤ دینے میں مصروف ہوتا تو دوسرا از خود ہی شلوار میں لپٹی کھجلاہٹ سے نبرد آزما ہو جاتا۔

نُو بازچہ کی ایسی بن آئی کہ سر پر رائل بلیو سولجر کیپ یُوں ٹیڑھی کر کے جمائے رکھتا جیسے کیشنڈ افسر ہو۔ تن پر صاف استری شدہ ملیشیے کی شلوار قمیص ہوتی اور پاؤں میں چمکیلے سیاہ کوہاٹی چپل۔ ٹوپی کے سامنے چھوٹا سا سنہری ستارہ ٹانکا ہوا تھا۔ جب وہ بازار میں دُکانداروں کو عام سا بے ضرر سرکاری مراسلہ بھی موصول کرانے جاتا تو بغل میں چھڑی دبا رکھی ہوتی۔ بظاہر چہرے پر مسکراہٹ ہوتی لیکن واضح طور پر تمکنت بھی جھلکتی۔ گویا شعوری کوشش سے تاثر دے رہا ہو کہ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کا اہم کارندہ آ گیا ہے، ذرا سنبھل جاؤ۔

دُکاندار سے مراسلے کی وصولی پر دستخط کروا کر سینہ تان لیتا اور دبے دبے جوش سے کہتا: "ہاں جی! اور کوئی حکم۔ میرے لائق خدمت......" حالانکہ اُس کا کام ختم ہو چکا ہوتا لیکن دُکاندار کا جواب سننے کو ہمہ تن گوش چوکنا ہوا کھڑا رہتا۔ اکثر دکاندار کچھ دے دلا کر رخصت کر دیتے۔ بعض، چائے ٹھنڈا منگوانے کا کہتے تو فوراً جواب دیتا: "میں خود ہی پی لوں گا۔ ابھی بہت سے نوٹس وصول کروانے ہیں۔" کئی عندیہ پا لیتے اور مروتاً نقد نذرانہ دے کر جان چھڑاتے۔ وہ جان بوجھ کر اطلاعی مراسلے کو بھی نوٹس ہی کہا کرتا۔ باقاعدگی سے ٹیکس ادا کرنے والے پڑھے لکھے دکاندار بھرے میں آنے کی بجائے بے رُخی سے چلتا کر دیتے۔

کئی دنوں سے ایک دو شریر لڑکوں کو عجیب شیطانی سوجھی ہوئی تھی۔ وہ سخیا چڑی کے گھر کی کھڑکی یا دروازے کے ساتھ منہ لگا کر کھنگورا مارتے اور رفوچکر ہو جاتے۔ سخیا نے بھاگ کر پکڑنے کی بار بار کوشش کر دیکھی مگر ناکامی ہوئی۔ وہ اپنے گھر میں فساد کھڑا کر دیتا اور بیٹی کے ساتھ نہ صرف بدکلامی کرتا بلکہ ہاتھ اٹھانے سے بھی باز نہ رہتا۔ اس سلسلے میں بیٹے کو زیادہ طیش دلایا ہوا تھا۔

سکینہ اپنی بیٹی کے لیے فکرمند رہنے لگی۔ بیٹا ڈیوٹی پر ہوتا اور شوہر حسب معمول شوقِ آوارگی میں گم۔ ساتھ والی کوٹھی کا مالی لڑکا اسے بہت اچھا لگتا۔ شریف اور محنتی، اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہو گیا کہ یتیم لاوارث ہے اور گھر بسانے کا خواہش مند۔ دونوں بیگمات نے اس معاملے میں حوصلہ افزائی کی۔

اتوار کے روز بیگم نجمی نے سکینہ سے کہا کہ وہ چھٹی کر کے گھر جائے۔ بیٹی کو اعتماد میں لے اور ہاتھ منہ دُھلا کر صاف لباس پہننے کو کہے۔ وہ بیگم عارفہ سے عباس کو چھٹی دلوا کر ڈیڑھ دو گھنٹے تک بھیج دے گی...... بیگم نے اشارے سے سکینہ کو مزید قریب بلایا اور بڑے ٹھہراؤ سے اخلاص بھرے لہجے میں بولی: "لڑکی لڑکا ایک دوسرے کو دیکھ

لیں۔ اس میں کوئی برائی نہیں اور یہ بہت ضروری ہے۔ دونوں پسند کر لیں تو دیر نہ کرو۔ سادہ نکاح اور اُسی وقت رخصتی۔ روٹی کا خرچہ اور ضروری سامان میں دے دوں گی۔ یہ تمہارا حق بنتا ہے۔ لڑکے کو اتنا اچھا صاف ستھرا سرونٹ کوارٹر ملا ہوا ہے۔ آگا نہ پیچھا۔ تمہاری بیٹی مزے کرے گی......"

زبانی اظہارِ تشکر کی بجائے سکینہ نے دستِ دعا بلند کیے اور رونے لگ گئی۔ ہونٹ یوں ہلنے لگے جیسے خاموش فلم کا سین چل رہا ہو۔ بیگم نے ڈھارس بندھائی اور جلدی جانے کو کہہ دیا۔

انتہائی تنگ ٹیڑھی میڑھی گلی کا بے ڈھنگا سا موڑ مڑتے ہی سکینہ کے گھر کا داخلی دروازہ تھا جس پر بُو باز چھ نے پرانا ٹاٹ اُتا کر بڑا موٹا گف پردہ، سردل پر پھٹی کیلوں سے جوڑ کے لگا رکھا تھا۔ سکینہ نے دیکھا کہ دروازے کے آگے بہتی بدررو میں غلاظت رُکی ہوئی ہے۔ دوڑ کر اندر گئی۔ بیٹی سے فوراً تیار ہونے کو کہا اور خود بالٹیاں بھر بھر کے نالی میں بہانے لگ گئی۔ فارغ ہو کر تیز تر ہاتھوں سے صحن میں جھاڑو دیا۔ سامان کی ترتیب درست کی۔ بیٹے نے اپنی کمائی سے صرف ایک ہی کمرہ آراستہ کیا تھا۔ ابھی ملازمت نئی نئی تھی۔ گھر میں فیصلہ سنا رکھا تھا کہ پیسے جمع کر کے اس گندی آبادی سے جلد از جلد نکلنا ہے۔ سکینہ کو اپنی قسمت کے معاملے میں شاذ ہی خوش گمانی ہوئی ہو گی۔ وہ جانتی تھی کہ بیٹا بھی آوارگی میں باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ ممکن ہے کمائی سنبھال رہا ہو۔ اللہ ہی جانے۔ دل نہیں مانتا۔

کھیا چری صرف کھلی سے کھیلنے کو ہاتھ چلانے میں ہی بے حیا نہ تھا، بلکہ فحش گوئی کرتے ہوئے بھی ذرا نہ جھجکتا۔ اُس نے ایک سے ایک انوکھی کہاوت یاد کر رکھی تھی۔ کسی بھی فوری توجہ طلب کام میں رُکاوٹ پڑتے ہی جھٹ سے بول دیتا: "شکار دیکھتے ہی کُتی کو ہگنا آ گیا۔" جو منہ میں آتا، بولتے ہوئے پرواہ نہ کرتا کہ مخاطب، بیٹی

بیوی بیٹا یا کوئی غیر ہے۔

آج سکینہ پر شوہر نامدار کی کہی ہوئی کہاوت سو فی صد صادق آ گئی۔ وہ بے پناہ خوش تھی لیکن اسی کے ساتھ تشویش، بے چینی، جوش اور اضطراب کا ملا جلا اُبال، دل و دماغ میں طوفان برپا کیے ہوئے تھا۔ ایسا پریشر پڑا کہ دوڑ کر لیٹرین میں گھس گئی۔

عباس خوب بن ٹھن کے دروازے پر آ گیا۔ اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا لیکن لوڈ شیڈنگ نے اس کی آواز سلب کر رکھی تھی۔ ذرا سا پردہ ہٹایا تو دیکھا کہ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا ہے۔ چوکھٹ پر ہاتھ سے تھپ تھپ کی سی آواز برآمد کی اور زوردار کھنگورا مار دیا۔

اُسی لمحے باپ بیٹا گلی کا موڑ مُڑ کر عباس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ گزشتہ دو ہفتوں سے اسی تاک میں پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ جو بھی بے غیرت کھڑکی یا دروازے کے باہر سے کھنگورا مار کر بھاگ جاتا ہے، ایک بار ہاتھ آ جائے۔ گزشتہ روز بھی ناکامی ہوئی تھی۔ بیٹی نے چانٹے تھپڑ سہ لیے لیکن کچھ بتانے کی بجائے حسبِ سابق صرف رونے پیٹنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ بددعائیں دیں اور بولی: ”کھنگورا مارنے والا حرامی سامنے نہیں آتا ورنہ میں اُس کے ساتھ بھاگ گئی ہوتی۔“

باپ بیٹے نے کھنگورا مارنے والے کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ اِن دنوں وہ دونوں ویسے ہی اونچی ہواؤں میں تھے۔ ترچھے نے شکار کو گردن سے دبوچ لیا اور پورے زور سے اس کا سر دیوار کے ساتھ دے مارا۔ باپ نے بھی مغلظات بکتے ہوئے مردانگی دکھانا ضروری سمجھا۔ عباس کو بولنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پہلی ٹکر سے ماتھا پھٹ گیا تھا۔ آنکھوں کے آگے تارے چھوٹنے لگے۔ بے جان سا ہو کر دیوار کے ساتھ ہی ڈھیر ہو گیا۔ تجیا نے بالوں سے پکڑ کر جھٹکے دینا شروع کر دیے۔ اتنے میں سکینہ روتی پیٹتی دروازے پر آ گئی۔

باہر نکل کر عباس کو بے سدھ ہوئے گرے پڑے دیکھا۔ اُس کے ماتھے سے

خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ سینہ کوبی کرنے لگی۔ اتنا ہی کہہ پائی کہ ساتھ والی کوٹھی کا مالی ہے۔ میرے کہنے پر بیگم صاحبہ نے بھیجا تھا اور وہ غش کھا کر وہاں ہی لیٹ گئی۔

گلی میں ہجوم ہو گیا۔ تخیا اور ز چھہ نے کہا: "اس نے ہماری غیرت کو للکارا ہے۔" اڑوس پڑوس والے پہلے ہی باپ بیٹے سے خار کھائے ہوئے تھے۔ کسی نے قریبی چوکی کو فون کر دیا۔ چند منٹ میں دو موٹر سائیکلوں پر چار پولیس اہلکار پہنچ گئے، جن میں ایک بوڑھا حوالدار بھی تھا۔ زخمی کو ایک کانسٹیبل کے ہمراہ رکشہ میں ڈال کر فوراً ہسپتال روانہ کیا اور ملزموں کو گرفتار کر کے لے گئے۔

سکینہ کو بیگم صاحبہ نے گیٹ سے اندر ہی نہ آنے دیا اور کہا کہ اُس کا میاں اور بیٹا، دونوں جرائم پیشہ ہیں۔ ز چھو کو ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ بیگم عارفہ نے پورا اثر ورسوخ استعمال کیا تا کہ باپ بیٹے کی ضمانتیں نہ ہوں۔ سکینہ نے بڑی مشکل سے ایک سستے نوجوان وکیل کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔

خدا خدا کر کے عباس کی حالت بہتر ہوئی، تاہم وہ ابھی ہسپتال میں ہی تھا۔ سکینہ نے لاکھ سمجھایا کہ باپ بیٹا، غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ لیں۔ کتے کی دم ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ تخیا چرسی نے ایک ہی رٹ لگائے رکھی اور عدالت میں کھڑک کر بولا: "اس نے کھنگورا مار کر ہماری غیرت کو للکارا تھا......"

سکینہ بھری پڑی تھی۔ ذرا پرواہ نہ کی کہ سامنے جج صاحب بیٹھے ہیں اور عدالت میں غیر لوگوں کے ساتھ وکیل اور پولیس پارٹی بھی کھڑی ہے۔ پھٹ پڑی: "کنجری کی نسل! اور بچا اپنی غیرت...... وکیل اپنی فیس کی قسطیں تیری بیٹی سے وصول کر رہا ہے اور پولیس والے مجھ سے۔ ایک شرم حیا ہی تھی، جو مزدوری میں ہڈیاں تڑواتی رہی۔ تم دونوں جیل جاؤ یا جہنم، ہماری بلا سے۔"

OOO

فی امان اللہ

سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل زبیر احمد زبیری نے ماہر استاد پتنگ باز کی طرح ڈھیل دینا شروع کردی۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ پیچا لڑ جائے لیکن ڈور نہ ٹوٹے اور ساتھی تماشائیوں کے رُوبرو باہم اُلجھی ہوئی دونوں پتنگوں کو آرام سے اتار لیا جائے تاکہ شک کی گنجائش باقی نہ رہے۔ بہت جلد اُمید بر آئی اور پیچا لڑنا شروع ہوگیا۔

چند ماہ پہلے جب خورشید عالم نے جائننگ رپورٹ دی اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی پوسٹ سنبھالی تو زبیری نے دیہاتی پس منظر کے حامل تندرست توانا، تاہم سادہ مزاج نوجوان افسر کو گہری نظروں سے دیکھا اور تو لتا رہا۔ کئی دن غور کیا اور اپنی اسکیم پر عمل درآمد شروع کردیا۔ دوستانہ رویہ اختیار کیا اور ایک مہربان مُربّی کی مانند پیش آنے لگا۔ حیلے بہانے گاڑی دے کر اپنی سرکاری رہائش گاہ پر بھیج دیتا۔ خود دیر تک دفتر میں بیٹھنے کا شروع سے ہی عادی تھا۔ دن بھر ڈی جی اور اپنے ہم پلہ افسروں سے گپ لڑایا کرتا اور اوقاتِ کار کے بعد فائلوں کا ڈھیر سامنے رکھ کر بیٹھ جاتا۔ آفس سے متصل کشادہ کمرے کو آرام کرنے کی غرض سے بہت اچھی طرح آراستہ کر رکھا تھا۔

جائنٹ ڈائریکٹر سبطِ علی سے دوستی تھی۔ اُس کو اعتماد میں لیا اور باہمی مشاورت سے منصوبے کی نوک پلک درست کر لی۔ زبیری، کرن کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا اور جان گیا کہ مناسب موقع ملتے ہی بہک جائے گی۔ سبطِ علی سے کہا: ''آج سے اکیس برس پہلے ٹھیک میں نے خود اسی طرح سروس جائن کی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا تعلق بہت چھوٹے قصبے سے ہے۔ دیہاتی اور قصباتی بیک گراؤنڈ والے نوجوان افسر بڑے شہروں میں آ کر جدید ماحول کی چکاچوند میں اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ خصوصاً ماڈرن لڑکی کو قریب سے دیکھ کر بڑی جلدی پھسل جاتے ہیں......اور اگر وہ خوبصورت بھی ہو تو دل نکال کر اُس کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔ اُن دنوں عثمانی صاحب نئے نئے ڈی جی پروموٹ ہوئے تھے۔ مجھ پر زیادہ ہی مہربان ہو گئے۔ اکثر گھر بلا لیتے۔ کرن اُن کی سب سے چھوٹی اولاد تھی، اے لیول کی اسٹوڈنٹ۔ پڑھائی سے زیادہ مجھ میں دلچسپی لینے لگی۔ عثمانی صاحب نے موقع غنیمت جانا اور مجھے مزید سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔ ویسے وہ اچھے شریف انسان تھے لیکن میں سمجھ گیا کہ بیٹی کو میرے پلے باندھ کر انھوں نے جان چھڑائی تھی......''

''اور اب آپ یہی فارمولا خورشید پر آزما رہے ہیں......'' سبطِ علی نے زبیری کی بات قطع کرتے ہوئے کہا اور ہنس پڑا۔ زبیری بھی ہنس دیا اور بولا: ''ہاں! کیا کروں؟ آپ سب جانتے ہیں۔ وہ باز نہیں آئے گی۔ اس کو یہ بھی پرواہ نہیں کہ اگلا تجربہ کیسا رہے گا۔ بیٹی اور بیٹا جب سے امریکہ گئے ہیں، وہی اے لیول والی اسٹوڈنٹ بن گئی ہے۔ اپنی فٹ نس کے حوالے سے جنونی ہو گئی ہے۔ کوئی نہیں مانے گا کہ دو بچوں کی ماں سینتیس سالہ عورت ہے۔ پچیس چھبیس سال کی دکھائی پڑتی ہے......''

سبطِ علی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا کر کہا: ''یار زبیری صاحب! اس میں کوئی شک نہیں۔ ویسے یہ ہے زیادتی۔ ہم اپنی بیویوں سے نالاں ہیں کہ اپنا خیال نہیں

رکھتیں۔ موٹی اور بوڑھی ہو گئی ہیں۔ آپ کی بھابھی صاحبہ کی اصل عمر چوالیس پلس ہے لیکن دیکھنے میں کم وبیش ساٹھ سال کی لگتی ہیں۔ میں نے ایک روز اُن سے کہہ دیا کہ اگر کسی محفل میں مسز کرن زبیری نے آپ کو آنٹی کہہ کر پکار لیا تو ندامت ملے گا۔ وہ محترمہ اس معاملے میں immune ہیں۔ فرمانے لگیں: کہتی رہے، ہم سے اب اتنا تردد نہیں ہوتا۔ اُس عورت نے اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رکھا ہے۔ صبح منہ اندھیرے چھت پر یوگا، دن کو پہلے پہر گھنٹہ گھنٹہ رسّی پھلانگنا، پچھلے پہر مشین پر ایکسرسائز اور رات کو ہلکی واک......اللہ کی پناہ......''

دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ سبطِ علی نے کہا: ''ہمیں گلا ہے کہ بیویاں ایکسرسائز نہیں کرتیں۔ آپ اپنی بیگم سے پریشان ہے کہ اپنے آپ کو فٹ کیوں رکھا ہوا ہے۔ خیر...... وہ، سچ کہتی ہیں عورتیں کہ مرد کسی حال میں بھی خوش نہیں ہوتا۔ چودری سکندر والی بات کہ مرد جب عورت کو ڈانٹنے دبانے پر آیا ہوا ہو لیکن بیوی سرے سے غلطی ہی نہ کرے اور کوئی جھوٹا سچا عذر بھی نہ رہے تو کہتا ہے: تم آٹے گوندھتے ہوئے ہلتی کیوں ہو؟......اسی پر ٹھکائی شروع ہو جاتی ہے۔''

''نہیں...... آپ جانتے ہیں اصل وجہ......'' زبیری اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے لبوں پر زخم خوردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کچھ سوچ کر بول پڑا: ''ہر وقت کی چخ چخ برداشت نہیں ہوتی۔ میں اسی لیے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا ہوں۔ بار بار ایک ہی طعنہ نہیں سنا جاتا۔ وقت بے وقت سنانا شروع ہو جائے گی: تم موٹے بھدے اور بوڑھے ہو گئے ہو۔ مجھے دیکھو! کیا تم میرے ساتھ جچتے ہو؟''

دونوں دوست سنجیدہ ہو گئے۔ سبطِ علی کہنے لگا: ''Its too much......تو ٹھیک ہے...... پھر انتظار کس بات کا؟ سب انتظام اے ون ہے۔ بس صرف آپ کی طرف سے سگنل ملنے کی دیر ہے......'' قدرے توقف کر کے سبطِ علی نے کہا: ''یہ آپ

نے بالکل صحیح سوچا۔اس طرح بیٹی اور بیٹے کی نظر میں آپ سرخرو ہوں گے۔"

زبیری بول پڑا:"عثمانی صاحب مرحوم کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔میں نہیں چاہتا کہ اُن کی بیٹی کے ساتھ میری طرف سے ناانصافی ہو۔انھوں نے میرے ساتھ زبردستی نہیں کی تھی۔صرف اتنا کیا کہ مواقع خوب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وافر فراہم کیے اور میں involve ہوگیا۔بچی بات ہے، مجھے اچھی لگتی تھی۔میں بچہ نہیں تھا......خورشید بھی بچہ نہیں۔اگر اُس کو پسند ہے تو مرد بنے......اور میری دلی خواہش ہے کہ کرن خوش رہے۔یوں ہی تنہا چھوڑ کے الگ نہ ہو جاؤں۔"

کوٹھی سے شیر محمد سیکیورٹی گارڈ نے موبائل فون سے بس کال دی۔دفتر میں چھٹی ہو چکی تھی۔زبیری نے عجلت میں سبطِ علی کو اطلاع دی اور فائلیں سمیٹ کر چوکیدار سے تالا لگوایا۔متوازن چال چلتے ہوئے اپنی رہائش گاہ کے گیٹ پر جا کر کھڑا ہوگیا۔شیر محمد نے صرف سر کی ہلکی جنبش سے اثبات کا اشارہ دیا۔چند منٹ ہی باہر انتظار کیا تھا کہ سبطِ علی اپنے ہمراہ ڈی ایس پی فاروق کو لے کر پہنچ گیا۔

بچا کھلنے پر دونوں بیڈ روم سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئے۔صوفوں پر نظر پڑتے ہی اوسان خطا ہو گئے۔زبیری اپنے ساتھیوں کے ساتھ اطمینان سے بیٹھا نظر آیا۔اُس کے ساتھ باوردی پولیس افسر بھی تھا۔کرن اُلٹے پاؤں پھر گئی اور بیڈ روم کا دروازہ بند کر لیا جب کہ خورشید کو ایک انچ اِدھر اُدھر ہلنے کا یارا نہ رہا۔

وڈیو دیکھنے دکھانے کی نوبت ہی نہ آئی۔تاہم زبیری نے اپنے قبضے میں کر لی۔خورشید نے رفتہ رفتہ حوصلہ پکڑ لیا۔کوئی چالاکی نہ دکھائی۔نہ صرف اقرار کیا بلکہ ساری تجاویز پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ڈی ایس پی کی تیار کی ہوئی تحریر پر دستخط کر دیے۔ساتھ ہی بغیر تاریخ ڈالے استعفا لکھ دیا جو سبطِ علی نے جیب میں ڈال کر کہا:"اگر تم معاہدے سے پھر گئے تو سمجھ لینا یہ منظور ہو چکا ہے۔"

کامیابی ملنے پر بھی زبیری ٹوٹ گیا اور چپکا بیٹھا رہا۔ڈی ایس پی فاروق نے ہاتھ میں لیا ہوا اقرار نامہ لہرایا اور پولیس افسروں والے دبنگ لہجے میں خورشید کو مخاطب کرتے ہوئے بولا: ''کوئی ہشیاری چترائی نہیں چلنے دوں گا۔''

خورشید نے کامل اطمینان سے جواب دیا۔''عدت پوری ہونے دیں۔اِس کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔''

ooo

مُخلص

"شراب خانہ خراب۔" کون ہوگا جو اِس مقولہ کی صداقت سے انکار کرے۔
چند ہم پیالہ وہم نوالہ دوستوں کی روزانہ محفل جما کرتی۔ شراب کا دور چلتا اور ماسوائے احسن کے، سارے ہی نشے میں چُور ہو کر بہک جاتے۔ ضیا کی حالت زیادہ خراب ہو جاتی۔ گھر جانے کا ہوش نہ رہتا۔ احسن کو زیادہ فکر اسی کی ہوا کرتی اور وہ بڑی حکمت سے اُس کو باتوں میں لگا کر مزید پینے سے روک دیتا۔

ضیا کا گھر ٹوٹنے کو تھا۔ وہی فاخرہ، جس کو شریکِ حیات بنانے کی خاطر والدین سے باغی ہو گیا اور دیوانگی طاری ہونے پر خود کو زخمی کر لیا، اب وہ بے چاری رات رات بھر انتظار کی آگ میں جلتی رہتی۔ تنگ آ کر خلع کا نوٹس بھجوا دیا۔

احسن نے دوستوں کو سمجھایا کہ ضیا کو برباد ہونے سے بچانا اِن کا فرض ہے۔ باتوں باتوں میں اس کے دل میں خوابیدہ ہوئی پڑی، بیوی کی محبت کو جگایا جائے۔ سب دوست اس طرح کی گفتگو کریں کہ ازدواجی تعلق کی اہمیت اجاگر ہو اور وہ کسی طرح اپنے گھر جانے پر آمادہ ہو جائے۔

طے شدہ حکمتِ عملی کے تحت مے وصل سے حاصل ہونے والے کیف و سرور

پر باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے تجربات بیان کرنے لگے۔ کسی نے گزشتہ رات کو اٹھائے ہوئے لطف کا حوالہ دیا تو بعضوں نے آج ہی بڑی بھرپور شب وصل منانے کا عزم ظاہر کیا۔ کہنے لگے: مئے وصل سے لطف اندوز ہونے کا مسلمہ اصول ہے کہ ہلکا ہلکا سُرور ہو اور حواس بھی قائم رہیں۔ لہٰذا آج مے کشی ذرا کفایت سے ہو گی۔

ضیا کفایت پر آمادہ نہ ہوتا لیکن اُس کو پتا ہی نہ چلا کہ بوتل کب خالی ہوئی ہے۔ دراصل احسن نے آنکھ بچا کر خالی بوتل رکھ دی اور جس میں ابھی ایک تہائی باقی تھی، اُٹھالی۔ شروع میں اُس پر "چلو میں اُلو" ہونے والی بات صادق آیا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ عادی ہوتا گیا۔ بلانوش تب بھی نہ ہوا، تاہم دوسروں کی نسبت آدھی پی کر بہک جایا کرتا۔ آج حالت مختلف رہی۔ سرور میں تھا لیکن کسی حد تک حواس میں۔

گیارہ بجے کے قریب احسن نے سب کو مخاطب کر کے قدرے بلند آواز میں کہا: "دوستو! اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ جہاز لینڈ کر چکا ہو گا۔ ابا جی اور امی جان پہنچنے والے ہیں۔ تین چار روز بعد دونوں بزرگ، چھوٹی بیٹی سے ملنے شیخوپورہ چلے جائیں گے۔ پھر محفل جمے گی۔ یار زندہ صحبت باقی......"

ضیا چونک اُٹھا۔ بیوی سے ناراضگی اور اُس کا بھجوایا ہوا نوٹس یاد آ گیا۔ تنک کر بولا: "میں نہیں گھر جاؤں گا۔ بڑی آئی خلع لینے والی...... بے مروت عورت کو یاد نہیں رہا، اُس کو پانے کے لیے کتنا ذلیل ہوا تھا۔ ذرا سی پی لیتا ہوں۔ خواہ مخواہ بک بک کرنے لگتی ہے......"

دوست کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر زیرِ لب مسکرانے لگے۔ طارق نے کہا: "میرے پیارے دوست ضیاالحسن! اتنی پیا کرو، جتنی آج پی ہے۔ بندہ اگر سرور نہ لے تو پینے کا فائدہ کیا؟ باقی کا نشہ مئے وصل سے پورا کرو، تاکہ دو آتشہ بن

جائے...... واہ! یہ ہے زندگی۔"

نیم رضا سا ہو کر بھی ضیا انکار میں سر ہلاتا رہا۔ کہنے لگا: "اِدھر گیراج میں سو جاتا ہوں یا سرونٹ میں ماسی جیناں کے پاس۔ اُس بے چاری نے مجھے کیا کہنا ہے، یا میں نے اُس سے۔ دونوں پڑے رہیں گے......"

سارے دوست ہنس پڑے۔ باہمی مشاورت سے منصوبہ تیار کیا ہوا تھا۔ مرحلہ وار عمل شروع ہو گیا۔ اُحسن نے کہا: "ماسی کو صدیاں بیتیں، شوہر سے بچھڑے۔ رات کے اِس پہر وہ یہ نہ سمجھ لے کہ بلم گھر آیا ہے۔ تم یہ پنگا نہ لو اور طارق کے گھر چلے جاؤ۔ فائدے میں رہو گے......" ضیا نے لحظہ بھر کو سوچا۔ اُٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑانے لگا۔ بولا: "یہ ٹھیک ہے۔ چلو طارق! مجھے اپنے گھر لے چلو......"

خالق نے ضیا کو اپنے ساتھ پچھلی سیٹ پر بٹھا لیا اور طارق نے گاڑی چلا دی۔ دس بارہ منٹ کی ڈرائیو تھی۔ فاخرہ کو ساری اسکیم کا علم تھا۔ کوئی بھی متوازن ذہن کی عورت خوشی سے اپنا گھر نہیں توڑتی۔ وہ اپنے گھر کا گیٹ کھول کر انتظار کرنے لگی۔ جوں ہی طارق کی گاڑی پورچ میں آ کر رُکی اور خالق نے سہارا دے کر ضیا کو اتار لیا تو بیوی پر نظر پڑتے ہی غصیلی آواز میں بول پڑا: "یہ کیا بے حیائی کا پارٹ ہے؟...... تم اِس وقت طارق کے گھر میں کیوں آئی بیٹھی ہو؟"

اس اثنا میں طارق نے گاڑی ریورس کر کے سڑک پر کھڑی کر دی اور خالق عجلت میں گیٹ کے پٹ بھیڑ کر نکل گیا۔ فاخرہ نے میاں کی بات کا جواب دینے کی بجائے گیٹ بند کر دیا۔ ضبط کیے رکھا اور شوہر کی کمر میں بازو ڈال کر اندر لے گئی۔

ذرا سی پذیرائی ہونے پر دل میں سوئی محبت نے انگڑائی لی۔ خانہ خمار میں ہوئی رندوں کی جادو اثر گفتگو نے بھی رنگ جمایا۔ حسن و شباب کی باتیں اور مے وصل

کی۔ گلے شکوے مٹ گئے اور بن کہے سنے دو آتشہ بن گیا۔ تجدید محبت کو مکالمہ کی حاجت ہی نہ رہی۔

چند دن اسی کیف ونشاط کے عالم میں گزرے جیسے ہنی مون کی ابتدائی راتیں۔ فاخرہ محسوس کرنے لگی کہ آنچ دھیمی پڑنے لگی ہے۔ طویل رفاقت میں بہت سے بھید ازخود آشکار ہو جایا کرتے ہیں۔ سمجھ گئی کہ آتشِ دروں کو آتشِ تر درکار ہے۔ نگاہ ناز ڈال کر رسیلے لہجے میں بولی: ''جائیں آج احسن بھائی سے مل آئیں۔ وہ آپ کے مخلص دوست ہیں۔ مگر جلدی لوٹ آنا۔''

ooo

ناشکری

"آؤ پلاٹوں کی باتیں کریں اور پراپرٹی پراپرٹی کھیلیں۔" یہ تھا ان چاروں کا اصل مقصدِ حیات اور دین ایمان۔ فرینڈز کارپوریشن کے شراکت دار۔ممتاز مختار، کبیر اور صغیر۔ایک ہی دادا کی اولاد۔ پہلے والے دونوں آپس میں سگے بھائی اور اسی طرح دوسرے دونوں بھی ایک ماں باپ کی اولاد۔

دادا، محمد بشیر عرف بابا بشیر بھُڑیا، بڑا شریف نجیب اور دیانتدار شخص کے طور پر منڈی میں مشہور ہوا۔کہا کرتا: یہ وطن بھی قدرت کی عجیب کاریگری کا نمونہ ہے۔ ملنے پر آیا تو خون کا ایک قطرہ نہ گرا۔اور جب مل گیا تو صدیوں کی کسریں نکل گئیں۔لہو کی ندیاں بہہ گئیں۔لنگر کی دال روٹی کھانے والا اس کی خاطر بڑی شان سے جان لڑا دے اور لوٹ کے کھا جانے والا مُلک میں سو سو کیڑے نکالے......واہ میرے مولا!......

تیرے شان نرالے۔کیسے کیسے لیڈر دیے، مادر فروش، ماں کی جمع پونجی اُڑائی، برتن بھانڈے بیچے، اب سر کی چھت بھی گروی رکھ دی۔رنڈی سے یاری نبھانے کو اُس کی تجوری بھر دی...... حلال کی روٹی کمانے والے کے دانتوں سے پسینا نکلے اور حرام سمیٹنے والے کو باردانہ کم پڑ جائے۔

بابا بشیر زندہ نہ رہا، ورنہ دیکھتا کہ اُس کے پوتے کیا گُل کھلا رہے ہیں۔ چاروں کے چاروں شادی شدہ اور اولاد والے۔ کبیر اور ممتاز میں تہرا رشتہ۔ دونوں ایک دوسرے کے بہنوئی اور سالے بھی۔ بلڈرز، ڈویلپرز اور ریئل اسٹیٹ ڈیلرز کے طور پر فرینڈز کارپوریشن کے نام کی فرم رجسٹرڈ کروا رکھی تھی۔ گاہک کو الجھانے پھنسنے اور گمراہ کرنے کی غرض سے چاروں نے اپنے الگ الگ پراپرٹی کے دفاتر بھی کھول رکھے تھے۔ معروف اخباروں میں اس پارٹی کے پانچ الگ الگ ناموں سے تسلسل کے ساتھ اشتہار شائع ہوتے رہتے۔ اشتہارات کی عبارت میں قرآنی آیات، احادیث یا مشاہیر کے مختصر اقوال بھی بوقتِ ضرورت شامل کر لیے جاتے۔ اس معاملے میں صغیر بڑا ماہر تھا کہ جائیداد کی خرید و فروخت میں دلچسپی رکھنے والوں کو کیسے راغب کرتا ہے۔ پانچ پھندے ہمہ وقت لگے رہتے، وہ بھی دور دور مختلف جگہوں پر۔ کسی نہ کسی میں کوئی نہ کوئی شکار پھنس جاتا۔ چاروں مل بانٹ کے کھا لیتے۔

اصطلاحات بھی خوب گھڑ رکھی تھیں۔ آٹھ دس لاکھ کی مالیت کے سودے کو مرغا، بیس پچیس والے کو بکرا، تیس پینتیس تک کی ڈیل کو ڈنبہ، پچاس سے ایک کروڑ کے درمیان والے کو ویہڑہ، دو تین کروڑ کے سودے کو بیل اور اس سے بھی اوپر والے کو یاک کا نام دے رکھا تھا۔

آپس میں گفتگو اس طرح کی کیا کرتے: آج ڈنبہ ہی ہاتھ لگا ہے۔ دوسرا کہا کرتا: بیل بڑا منہ زور تھا، لیکن قابو آ ہی گیا...... جب کوئی ہشیار گاہک، ایک بھائی کے چنگل سے نکل لیتا لیکن دوسرے، تیسرے یا چوتھے کے جال میں الجھ کر پھنس جاتا تو کاٹ پیٹ کے بعد جشن مناتے ہوئے تبصرہ کرتے۔ صغیر کہتا: ''بکرا، ممتاز اور کبیر کو بہت بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ بڑے بے ایمان ہیں، لوٹ لیتے لیکن میں بچ نکلا......''

سودا برابر آتے ہی اس میں کم سے کم منافع کی حد مقرر کر لیا کرتے۔ ان کے

لباس، زیرِ استعمال گاڑیاں اور دفتروں کی تزئین و آرائش دیکھ کر گاہک متاثر ہو جاتا۔ انتہا درجے کے خوش اخلاق، ملنسار اور مہذب۔ خاطر مدارت کرنے میں فراخ دل۔ مہمانوں کے آنے پر ہن کہے اور پوچھے موسم کے مطابق تواضع کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ عملے کے ارکان اشارے کنائے اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مالکان خود ایسے شیریں کلام کہ تھوڑی دیر کی مجلس میں مہمان کو بے تکلف کر کے، خرید یا فروخت کے پس پردہ مقصد اور مجبوری کو بھانپ لیتے۔ فروخت کرنے والے کی ضرورت اور مجبوری کی نوعیت جان کر ہمدردی کا نقاب اوڑھ لیتے اور کہتے: "مارکیٹ بہت ڈاؤن ہے۔ جینوئین بائر کی تلاش میں وقت لگتا ہے۔ اگر پانچ دس لاکھ روپے سے کام نکل سکتا ہو تو ہمیں اپنا بھائی سمجھیں اور قرضۂ حسنہ کے طور پر قبول کرلیں۔ امید ہے پانچ چھ ماہ تک مارکیٹ تیز ہو جائے گی۔ آپ کو نقصان ہونے کی بجائے اچھا خاصا فائدہ ہو سکتا ہے......"

ایسی ہمدردانہ گفتگو سن کر گاہک گرویدہ ہو جاتا۔ لیکن تین دن کے بھوکے کو لحۂ موجود میں دال روٹی مل رہی ہو تو اگلے روز کے لیے فائیو اسٹار کا دعوت نامہ موصول ہونے پر صبر نہیں آ جاتا۔ فوری طور پر مصنوعی گاہک کھڑا کیا جاتا۔ اختتام پر معاہدہ لکھا جانے کے ساتھ ہی موٹی رقم بطور بیعانہ ادا کر دی جاتی تاکہ لُٹ جانے کا احساس ہو جانے پر بھی دوگنا واپسی آسان نہ ہو۔ آخری لمحے تک چرب زبانی کی بلند سطح قائم رہتی۔ ایک کروڑ کے سودے میں بیس پچیس لاکھ کا ٹانکا لگا کر بھی میٹھے رسیلے لہجے میں کہتے: "ہمارا حقِ خدمت صرف ایک پرسنٹ ادا کر دیں۔ وہ بھی نہ لیتے، لیکن کیا کریں، دفتر کے اخراجات اور تنخواہیں بھی مشکل سے پوری ہوتی ہیں۔ زیادہ کا لالچ کبھی نہیں کیا، بس یہ کہ گزارہ ہو جائے اور آپ جیسے مہربانوں کی خدمت کا سلسلہ جاری رہے۔

سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اتنی تاخیر کر دیا کرتے کہ کھانے کا وقت ہو جائے۔ ایسی پُرتکلف ضیافت کرتے کہ زخم خوردہ مہمان کی ٹیس، مسکراہٹ میں بدل جایا

کرتی۔فارغ ہونے پر آپس کی گفتگو میں ایک فی صد کمیشن کو اوجڑی اور سری پائے کہا کرتے۔گویا اچھا بھلا پلا ہوا جانور ذبح کر کے باقیات بھی سمیٹ لیں۔ایسی مہذب انداز کی نوسر بازی کا سلسلہ سر بازار چلا رکھا تھا کہ لاکھوں سے کم کی دیہاڑی لگنے پر کاروبار میں مندی ہونے کا تذکرہ چھڑ جایا کرتا۔

چاروں بھائیوں کی رہائشی کوٹھیاں پوش ایریا کی ایک ہی کشادہ سڑک پر تھیں۔لیکن انھوں نے گھروں سے بہت دور ایک لگژری اپارٹمنٹ اور ایک محل نما بنگلہ اپنی عیاشیوں کے لیے خرید رکھا تھا۔محفلِ ناؤ نوش ہر روز ہی جمتی اور جب جی میں آتا، دادِعیش ونشاط دینے کو نئے نئے پیکرِ حسن وشباب کا اہتمام کر لیا جاتا۔جس ملک میں حرام کی دولت کے انبار ہوں، وہاں گلی گلی میں چکلے کھل جایا کرتے ہیں اور دیس دیس کی رنڈی پہنچ جایا کرتی ہے۔وطنِ عزیز میں بھی اس جنس کی کوئی کمی نہ رہی۔ہر رنگ اور نسل کی، ایک فون کال پر۔انھوں نے ہر تجربہ کر دیکھا۔راوی نسل کی پلی پلائی بھینس جیسی چمکیلی سیاہ کالی جلد والی افریکن سے لے کر دودھ گلاب کی آمیزش میں ڈھلی نازک کومل یورپین۔سانولی سلونی سری لنکن انڈین بنگالن۔چھنی چندھی تھائی چینی، جن سے شغل کریں نہ کریں، دن بھر کی تھکن دور کرنے کو مساج ضرور کرواتے۔سب سے زیادہ شوق، تاجک ازبک لڑکیوں سے کرتے اور ایسی ہی ریاستوں سے آئی ہوئی، جن کے مرد، جہادی تنظیموں میں برسرِ پیکار تھے۔

حرام کی دولت سے خوش حالی ضرور آئی لیکن بے حیائی اور بے غیرتی بھی ہمراہ وافر لائی۔کوئی پرواہ نہ رہی کہ وہ چاروں آپس میں چچازاد ہی نہیں، سگے بھائی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سالا بہنوئی بھی ہیں۔مہینے دوسرے یا حد تیسرے میں ایک آدھ بار بھی ٹرپ میں آ جاتا۔تب عشرت کدے میں خوب رنگ رلیاں منانے کو نکل جاتے۔پسندیدہ ریاستوں کی نسل بک کروائی جاتی۔پچیس ہزار فی کس کے حساب سے

ایک لاکھ، علاوہ دیگر لوازمات کے۔ تھوڑے بہت بے غیرت تب ہی ہو گئے تھے، جب موٹر سائکلوں پر بھاگ دوڑ کر کے کوئی دُکان مکان کرائے پر چڑھانے میں کامیاب ہو جاتے یا چھوٹی موٹی پراپرٹی بیچ کر کمیشن کما لیتے۔ چاروں میں ہم آہنگی سلوک اتفاق اور بے تکلفی شروع سے ہی تھی۔ صبح تیاری کے مراحل میں کوئی نہانے کی بات کرتا تو دوسرا فوراً بلا جھجک سوال کر دیتا: ''غسلِ واجب کا معاملہ آن پڑا ہے یا ویسے ہی روٹین کا نہانا دھونا؟'' چاروں میں سے جس کسی میں شرم حیا کی رَمق باقی رہ گئی تھی، لاڈ پیار میں لپٹی ڈانٹ پھٹکار کرتے ہوئے کہہ دیتا: ''بے وقوف! سوچ سمجھ کے بات کیا کرو۔ کوئی سالا اپنے بہنوئی سے ایسا سوال نہیں کرتا۔'' سالا صاحب کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولتا: ''کیوں! اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اماں حوا سے یہ کام شروع ہوا اور جب تک دنیا قائم ہے، جاری رہے گا۔''

کسی بھی موضوع پر بحث ہو رہی ہوتی، یہ چاروں بھری محفل میں لاتعلق ہوئے رہتے۔ مذہب، سیاست، اخلاقیات یا ادب میں ذرا سی دلچسپی نہ لیتے۔ کوئی فلمی کہانی کے پلاٹ پر مبنی جملہ بول دیتا تو فوراً چوکنے ہو کر پوچھ لیتے: کون سے سیکٹر میں؟ کس سائز کا؟؟ خود صرف پلاٹوں اور پراپرٹی کی باتیں کرتے یا پھر منہ کا ذائقہ بدلنے کو نئی نئی گاڑیوں کی۔ ان کی اولادیں تباہ ہو رہی تھیں۔ آٹھ آٹھ دس دس سال کے لڑکے لڑکیاں قیمتی گاڑیوں کو بُری طرح چلاتے۔ گھروں کی چھتوں پر اکٹھے ہو کر ہلا گلا کرتے، احترام کے مہینوں میں بھی رات کو بلاوجہ ہی سیکڑوں ہزاروں کی آتش بازی پھونک ڈالتے۔ مہنگے ترین تعلیمی اداروں میں داخلے لے رکھے تھے لیکن دلچسپی صرف ہر جدید ایجاد اور آسائش سے جُڑی ہوئی برائی میں لیتے۔

چاروں بیویوں نے بالآخر خوب صلاح مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ دوٹوک بات کی جائے۔ پہلے اپارٹمنٹ گئیں لیکن بند پا کر عشرت کدے آ پہنچیں۔ یوں چھاپا پڑنے پر

شوہر حیران پریشان ہو گئے۔ اولاد کی اخلاقی بربادی پر بات ہوئی۔ ممتاز اور صغیر سیخ پا ہو کر ایک دوسرے کی تقلید و تائید میں بولنے لگے: ''تم مائیں کس مرض کی دوا ہو؟ کوئی کمی رہ گئی ہے تو بتاؤ۔ ہر گھر میں چار چار نوکر دیے ہوئے ہیں ناشکری عورتو! اتنا عیش آرام وزیروں سفیروں کی بیویوں کو نصیب نہ ہوا ہوگا۔''

سب سے بڑی خاتون، باقی تینوں کی بھی نمائندگی کر رہی تھی۔ اپنے شوہر، کبیر کو مخاطب کر کے بولی: ''تم چاروں بھائیوں کو کیا کمی رہ گئی ہے جو یہاں کرائے کی عورتوں کے ساتھ منہ کالا کرتے ہو؟ ہم کس لیے ہیں؟ ہمیں کیوں قید کر رکھا ہے؟'' وہ منہ پھاڑ کے بول پڑا: ''تو دفع ہو جاؤ، کس نے روکا ہے؟ تم چاروں منہ لال کر لیا کرو یا نیلا پیلا......''

ooo

سانجھ

اکیڈمی میں ہفتہ وار چھٹی کے روز یاسین کے ساتھ سرِ راہ سامنا ہو جانے پر ولی احمد نے انتہائی عجز و انکسار سے سلام کیا۔ جواب ملنے پر ماتھے تک اٹھا ہوا داہنا ہاتھ نیچے آیا۔ چہرے سے عقیدت بھری محبت اور خلوص کے ملے جلے جذبات مترشح ہوئے۔ ذرا سا جھکا اور دونوں ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیے۔ مصافحہ کرنے کے بعد سیدھا ہاتھ یوں سینے پر رکھ لیا گویا دل میں ٹھنڈک پڑ گئی ہو۔ گردن کو ذرا خم دے کر احوال پوچھا اور چل دیا۔

ولی احمد کی عمر بھی اُن دنوں یہی کوئی تیس پینتیس سال کے درمیان ہو گی۔ یاسین کا ہم عمر یا شاید دو تین سال چھوٹا تھا۔ اُس کی رنگت، سانولی سے گہری اور سیاہ کالی سے قدرے ہلکی تھی۔ سر کے بال تارکول کی مانند کالے چمک دار، بہت باریک اور گھنگھریالے، ہُو بہُو کراچی کے مکرانیوں کے سے تھے۔ نین نقش بھدے تھے نہ پُرکشش، البتہ قد پانچ فٹ دو انچ سے زیادہ نہ تھا۔ مجموعی طور پر شخصیت سے فروتنی اور آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ وہ گھریلو نوعیت کے سارے ہی کام سُگھڑ عورتوں کی طرح بڑے سلیقے سے کرنا جانتا تھا۔

شہر کی اہم سڑک پر واقع یاسین کی اکیڈمی میں طلبا اور طالبات کے علاوہ اہلِ علم و دانش حضرات کی آمد و رفت بھی لگی رہتی، جن کی تواضع کے لیے ولی احمد نے بڑے ہی بے معلوم طریقے سے خود کو مامور کر لیا۔ اُس نے سب سے پہلی ملاقات کو ہی ایسی کُنجی کے طور پر استعمال کیا کہ جب چاہا، یاسین کے دل کا دروازہ کھول لیا۔ اکیڈمی کی عمارت یوں بھی لب سڑک تھی اور اس کے کھلے دروازوں نے ولی احمد کے داخلے پر روک ٹوک نہ لگائی تو اس نے بھی اندر قیام کرنے کی اجازت چاہنے کا تکلف نہ کیا۔ عمارت کے عقبی رہائشی حصے کی دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی کا فریضہ بھی سنبھال لیا۔ فارغ اوقات میں اکیڈمی کے آگے پڑی کرسیوں میں سے کوئی ایک اٹھا کر فٹ پاتھ کے قریب رکھ لیتا اور آرام سے بیٹھا آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہتا۔ اُس نے اپنے ذہن میں یقیناً کوئی پیمانہ فِٹ کر رکھا تھا، کہ جوں ہی اِس پر پورا اترنے والا شخص سرِ راہ چلتا دکھائی دے جاتا تو فوراً آگے بڑھتا اور خلوص میں ڈوبی ہوئی اُسی انکساری سے "اَلسّلام علیکم" کہتا، جس سے پہلی مرتبہ یاسین کے ساتھ پیش آیا تھا۔

یاسین نے ایک بار پوچھ لیا کہ ہر کسی کو سلام کیوں کرتے پھرتے ہو۔ وہ مشرقی پنجاب خصوصاً جالندھر کی پنجابی بولا کرتا، جس میں اُس کی فطری منکسر المزاجی اور خوش اخلاقی کا وافر عنصر شامل ہونے سے لب و لہجہ بہت نرم اور رسیلا ہو جاتا۔ یاسین سے بات کرتے ہوئے عقیدت بھری چاہت کی آمیزش ہو جاتی۔ اُس روز سلام کرنے کے حوالے سے یاسین کے سوال پر ولی نے بھرپور مسکراہٹ دیتے ہوئے کہا: "سرا! بندہ ہی بندے کا دارُو ہوتا ہے اور ضرورت پڑنے پر کام آتا ہے...... انسان کو چاہیے کہ آپس میں ہنس بول کر ملے جُلے......"

معاشرتی سماجی معاملات کو برتنے کے حوالے سے یاسین کا انحصار زیادہ تر کتابی اور نصابی علوم پر ہی تھا۔ "دارُو" کا لفظ ذہن میں آنے پر دھیان اس کے عمومی

معانی کی طرف ہی جایا کرتا؛ مثلاً دوائی، بارود یا شراب وغیرہ۔ اُس روز ولی کا جواب سن کر خیال آیا کہ دارُو سے مراد، علاج معالجے اور درماں سے بھی ہے۔ اُس کو معلوم تھا کہ ولی کی تعلیم بڑی واجبی سی ہے۔ غالباً پانچویں جماعت تک۔ تاہم اُس نے وضاحت سے اپنی اصل تعلیم کے بارے میں بتانے کی بجائے بڑی ہنرمندی سے گفتگو کا رُخ موڑ دیا تھا اور یاسین نے بھی حسب عادت کریدنے سے گریز کیا۔ البتہ ولی کی ذہانت کے بارے میں سوچتے ہوئے قائل ہونے لگتا کہ انسان نے درس گاہوں سے بہت بعد میں سیکھنا شروع کیا، جب کہ اس سے قبل وہ ہزاروں سال سے زندگی کو عملاً برتنے کے نتیجے میں سیکھتا چلا آیا ہے۔

سات آٹھ ماہ کے عرصہ میں ولی نے یاسین کی عادات ایک لحاظ سے بگاڑ کر رکھ دیں۔ بندۂ بے دام بنا خدمت کرتا رہا۔ ایک کمرہ اور واش روم اُس نے ذاتی استعمال میں رکھا۔ تین وقت کا اچھا کھانا کھالیتا۔ جب بھی ضرورت پڑی، اُس نے تھوڑی بہت رقم بھی مانگ لی۔ البتہ اُس کے لباس کے معاملے میں یاسین نے خود خیال رکھا۔ کبھی کبھار یاسین کو اُلجھن ہونے لگتی کہ یہ شخص خواہ مخواہ اس کی زندگی میں کیوں گھسا چلا آیا ہے۔ عربی کا اُونٹ ثابت ہوا ہے، صرف اتنا فرق رہا کہ مالک کو خیمے سے باہر نہیں کیا۔ دراصل وہ اس سے قبل اکیلا رہنے کا عادی تھا۔ کپڑے بازار سے ڈرائی کلین ہوجاتے۔ اکیڈمی کے اوقاتِ کار میں رہائشی حصے کی صفائی ہوجایا کرتی۔ برتن بھی دُھل جاتے۔ صبح کا ناشتا خود بنالیا کرتا اور کھانا سامنے والے ریستوران سے آجاتا۔

یاسین نے کہیں سُن یا پڑھ رکھا تھا کہ انسان جب خوش اور حیران ہونا چھوڑ دے تو زندگی بے کیف ہوجایا کرتی ہے۔ وہ سوچا کرتا کہ کس بات پر حیران یا خوش ہوا جائے۔ جب کچھ ہے ہی نہیں تو بس ٹھیک ہے۔ اچھی گزر رہی ہے، کوئی غم بھی تو نہیں۔ لیکن اس اثنا میں ولی نے یاسین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ گزشتہ چند ہفتوں

سے وہ بتا کر دو تین گھنٹوں کے لیے غائب ہو جایا کرتا۔ اُس میں ایک اور خصوصیت بڑے کمال کی تھی کہ ہر عمر کی عورت سے بہناپا کرنے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ سرِ راہ چلتی خواتین کو روک کر گہری سہیلیوں کی طرح ہنس ہنس کر بے تکلفانہ گفتگو کرنے لگتا۔ مجموعی طور پر اُس کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ خواتین کے محرم بھی اِس پر معترض نہ ہوتے۔ بعض عورتیں خود اُس سے باتیں کرنے کو رُک جایا کرتیں۔ اکیڈمی کے دائیں بائیں اور پچھواڑے کے کچھ معزز گھرانوں کی خواتین اِس عجوبہ شخص کے ساتھ دکھ درد کی باتیں کرنے کو بُلا لیا کرتیں۔ یاسین کو رفتہ رفتہ پتا چل گیا کہ ولی کے پاس کئی گھرانوں کے سربستہ راز بھی ہیں۔ وہ خود ہی اس کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے بڑے قرینے سے کچھ کچھ آشکار کر دیا کرتا۔

اکیڈمی میں جمی نجی محفل کے دوران شہر کے عمر رسیدہ دانشور اور صاحب علم شخصیت، پروفیسر طاہر صاحب نے ایک مرتبہ یاسین کو مخاطب کر کے کہا تھا: ''یاسین صاحب! عنقریب کہیں اگر یہ خبر مشہور ہو کہ آپ کے ولی احمد نے عصرِ حاضر کی حسین ترین لڑکی پھنسالی ہے تو حیران مت ہوئیے گا......'' شرکاء محفل کُھل کر ہنسے لیکن یاسین حیرانی سے پروفیسر صاحب کو دیکھتا رہا اور بول پڑا: ''سر! یہ کیونکر ممکن ہے؟...... اگر ایسا ہو گیا تو میرے نزدیک یہ اس صدی کا سب سے حیران کن واقعہ ہوگا۔''

صدی کا حیران کن واقعہ فی الحقیقت رونما ہو گیا۔ ولی نے جب گلی محلے برادری خاندان اور نشئی باپ کا نام لے کر بتایا کہ اُس کی بیٹی سے شادی کر رہا ہے تو اولین مرحلے پر یاسین کے حواس خطا ہو گئے۔ انتہا درجے کی حیرانی پر صدمہ غالب آ گیا۔ وہ لڑکی ہی نہیں، اُس کی ماں بھی ابھی لاکھوں میں ایک تھی۔ وہ عورت بدنام ضرور ہوئی مگر بعید نہیں کہ احساسِ محرومی کے مارے ہم عصر مردوں نے حسد کے انگاروں پر لوٹتے ہوئے افواہوں کے شعلے بھڑکائے ہوں۔ یاسین ہی نہیں؛ اور بھی شہردار جو ماں

بٹی کے حسن و جمال کے چشم دید گواہ تھے، یہ ناقابلِ یقین خبر سن کر حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے لگے۔ چونکہ ان میں سے کئی ایک ایسے ہوں گے جو ماں بٹی کے منہ سے ''گزشتہ را صلوٰۃ، آئندہ را احتیاط'' کا کلمہ سنتے ہی نیکی کے پردے میں لطف اٹھانے کو ''ہم خرما و ہم ثواب'' کی عملی تصویر بننے میں جھٹ پل کی تاخیر بھی گوارہ نہ کرتے۔ یاسین سوچنے لگا کہ اس درجے کی حیرت سے زندگی کا پُر کیف ہونا کسی سانحہ سے کم نہیں۔ وہی ولی احمد جو اس کو عام سا مرد دکھائی دیا کرتا، اب اس کی نظروں میں کالا ٹھگنا بُھتنا ہوتا گیا۔ گو کہ وہ ایک سنجیدہ طبع انسان تھا، اس کے باوجود عجیب بیہودہ سوال ذہن میں الف ہوا رہتا۔ آخر کار پوچھ بیٹھا: ''ولی! ایک بات تو بتاؤ!!! تمہاری پیدائش سے پہلے تمہارے والدین کہاں رہتے تھے؟...... میرا مطلب ہے، کراچی تو نہیں رہے؟......''

شاید حیرتوں کا موسم آ گیا تھا۔ یاسین یہ محسوس کر کے حیران رہ گیا کہ ولی کی رنگت مزید کالی ہوئی ہے اور جھینپ زدہ مسکراہٹ پر شکوہ گزاری عود کر آئی ہے۔ گویا اُس نے سوال کے اندر چھپے سوال کو بھی پڑھ لیا تھا۔ اتنا ہی کہہ پایا: ''سر! میں اپنے سگے باپ سے زیادہ آپ کی عزت کرتا ہوں......'' یاسین گنگ ہو کر رہ گیا، ورنہ اگلا سوال یوں کیا ہوتا: ''کیا کراچی کے علاقے لیاری میں مقیم رہے؟''

سردیوں کے موسم میں شدت آ گئی تھی۔ ولی نے رات کے کھانے میں یاسین کی پسند کے مطابق مچھلی دو طرح سے پکائی تھی۔ فرائی اور سادہ چاولوں کے ساتھ قورے کی طرز کا شوربے والا سالن۔ ٹی وی سیٹ آن کر کے یاسین بستر پر ٹیک لگائے کتاب کے مطالعہ میں مگن ہوا رہا۔ ولی نے بڑے اہتمام سے میز پر کھانا لگایا اور حسب عادت دھیمے نرم لہجے میں بولا: ''سر! کھانا ٹھنڈا نہ ہو جائے......'' یاسین نے کتاب تکیے کے ساتھ رکھ دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولا: ''تم بھی کھا لو، جاؤ۔ یہاں کھڑے رہنے کا کیا فائدہ؟'' ولی بول پڑا: ''جی! ٹھیک ہے...... سر! وہ!!!...... میری

ساس صاحب اور بیوی آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتی ہیں...... ابھی نو بجے تک...... یا شاید سوا نو پہنچ جائیں......"

ایک اور حیرانی...... یاسین نے کرسی کھینچتے ہوئے گردن گھما کر ولی کو دیکھا اور بولا: "مجھے!!! وہ کیوں؟......" قدرے ٹھٹک کر: "ساس اور بیوی بن بھی چکی ہیں اور تم نے بتایا نہیں......" ولی اپنے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے ہنس کر بولا: "انشااللہ سر! بنی ہوئی سمجھیں...... اور آپ سے ہی ملنا ہے، اور میرا ہے کون؟...... میرے مائی باپ آقا مالک، سب کچھ آپ ہی ہیں سر!" یاسین مسکرا کر رہ گیا اور کرسی سنبھال لی۔ توجہ میز کی طرف مبذول کیے ہوئے بول پڑا: "آئیں بڑی خوشی سے...... اُن کی تواضع کے لیے کچھ کر رکھو......" ولی تشکر آمیز لہجے میں بولا: "جی سر! فرائی کا چھوٹا ڈونگا پڑا ہوا ہے۔"

خبرنامہ شروع ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ آ گئیں۔ بیٹی دبکی رہی، جب کہ اُس کی ماں قدرے بلند آواز میں بولی: "السلام علیکم سرجی!......"

ولی اپنی ہونے والی یا بقول اس کے بن چکی ساس کے ساتھ کھڑا سرکس کا مسخرا دکھائی پڑا۔ آفت کے بطن سے جنم لینے والی آفت بھی ہُو بہو اُس جیسی۔ گویا بڑی چھوٹی بہنیں ہوں۔ دبلی پتلی اور لمبی، سراپا کشش اور حُسن ہی حُسن۔ اُجلے لباس اور روشن چہرے دیکھ کر یقین نہ آیا کہ افواہیں درست ہیں۔ گمان گزرا کہ ممکن ہے، درست ہوں۔ تاہم لوگوں کو خون معاف ہو جاتے ہیں۔ یاسین نے تینوں پر بھرپور نگاہ ڈالی اور بے اختیار ہنس پڑا۔ ولی کا قد، بکرانی طرز کے پھولے ہوئے بالوں سمیت اُن دونوں سے کم از کم چار انچ چھوٹا تھا۔ اس مضحکہ خیز منظر پر ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

اُم آفت بڑی بے باکی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور بولی: "ہائے سرجی! ویسے ہی جا رہے ہیں، بیٹھنے کا نہیں کہہ رہے......" اُس نے ہاتھ نچاتے ہوئے بیٹی سے بیٹھنے کو کہا اور ولی کی طرف رُخ موڑ کر بولی: "بیٹھ اوئے ولیا!"...... تینوں بیٹھ گئے۔ ولی کھسیانا

ہوا ضے گیا۔ آفتوں نے گرم شالیں اس اہتمام سے اوڑھ رکھی تھیں کہ شباب کی لہریں بدستور پھوٹتی رہیں۔ مبادا دم پخت ہونے سے جسموں کو گزند پہنچے۔

بے شمار باتیں ہوئیں۔ دونوں نے ولی کے زیرِ تصرف کمرہ دیکھا۔ فرائی مچھلی کا ڈونگا خالی کیا۔ چائے پی۔ اُمّ آفت نے یاسین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"سرجی! ولیا آپ کو اپنا آقا مائی باپ اور نہ جانے کیا کیا بتاتا پھرتا ہے۔ ہماری اور اس کی عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ لڑکی نے بیاہ کر اسی گھر میں آنا ہے۔ ہمیں کوئی لالچ نہیں۔ صرف لوگوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ آپ جو بھی زیور کپڑا لڑکی کو دیں گے، وہ اُسی رات واپس آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ بس آپ ہماری لاج رکھ لیں۔ ولیمہ کی دعوت پر ہماری طرف سے صرف بیس پچیس بندے ہی آئیں گے۔ باقی آپ کے اپنے مہمان جتنے بھی ہوں، ہمیں اس سے غرض نہیں۔ وہ آپ کی اپنی عزت کا سوال ہے......"

عجیب نوٹنکی کا پارٹ شروع ہوا۔ یاسین کو حیرت اور تجسّس نے گھیرے رکھا۔ کھیل کا حتمی انجام دیکھنے کی خواہش شدید تر ہوئی۔ پرائی شادی کا خرچہ اٹھانا سراسر حماقت ہی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر ذہنی طور پر تیار ہو گیا کہ نقد رقم کے بدلے میں مال اور دُلھن نے آ جانا ہے، لہٰذا گھاٹے کا سودا قطعی نہیں۔ اور پھر ایسا انوکھا نو بیاہتا جوڑا دنیا میں کہیں نہ ہوا ہو گا، جس نے اسی چھت کے نیچے رہنا ہے، جو اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ گویا اصل ڈراما ایک لحاظ سے نظروں کے سامنے ہونا ہے۔ اور ایسی بے جوڑ شادی کا منطقی نتیجہ دیکھنے کا سنہری موقع گنوا دینا بہت بڑی حماقت ہو گی۔

اُمّ آفت خود ہی چند ایک مرتبہ آئی اور زیور کپڑوں کے لیے رقم لے گئی۔ ہر مرتبہ ذومعنی جملے بول کر تاثر دیتی رہی کہ وہ احسان اتارے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گی۔ یاسین نے بہت عرصہ پہلے سے اُس کو دیکھ رکھا تھا، اور بار بار مگر کبھی ہم کلام ہونے

کا موقع نہ ملا۔ اب جو چند ملاقاتیں ہوئیں تو اس کا اندازِ تکلم اچھا نہ لگا۔ اُس کی جسمانی حرکات وسکنات، خصوصاً آنکھیں مٹکا کر باتیں کرنے سے نہ صرف شخصیت کا عامیانہ پن جھلکتا، بلکہ صاف پتا چلتا کہ وہ دعوتِ استفادہ دے رہی ہے۔ یاسین کو یہ جان کر افسوس ہونے لگا کہ افواہیں غلط نہیں اُڑیں اور پھر یہ عورت اپنی خوبصورتی اور جوانی کو بے دریغ ضائع کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ کاش یہ خود کو سنبھال لے اور کچھ تہذیب اور شائستگی بھی سیکھ لے کہ ان صفات کے بغیر انسان کا ظاہری حُسن گہنا جاتا ہے۔ اس سے رہا نہ گیا اور پوچھ بیٹھا کہ وہ کس طرح احسان اتارنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یاسین نے اس عورت کے چہرے سے پہلی مرتبہ حیا کی سرخی جھلکتی ہوئی محسوس کی۔ قدرے جھینپ کر پست لہجے میں بول گئی: "سرجی! میرے پاس دولت کے خزانے نہیں دبے ہوئے۔ یہی ہے، قدرت کا دیا ہوا، جو میں آپ کے سامنے ہوں۔ وہ حاضر ہے......"

دونوں کی نگاہیں مِل گئیں۔ پل دو پل کو یا شاید کچھ زیادہ دیر تک ملی رہیں۔ وہی شوخ وشنگ، آنکھیں مٹکانے والی عورت جانے کیوں آبدیدہ ہوگئی۔ یاسین کی حیرت انتہا کو چھو گئی...... کون سی سوچ آئی، کیسا گداز دل میں اُتر آیا کہ ہیئت بدل گئی۔ وہی دل کش تن بدن اور رُوپ سروپ دلآویز ہوگیا۔ کون سی تبدیلی آئی کہ سفلہ پن ڈھل گیا...... یاسین سمجھ نہ پایا کہ وہ لمحے کیونکر معتبر ہوگئے۔ بے اختیار بازو کھول دیے اور وہ ان میں سما گئی۔ وہ اسی طرح کندھے پر سر رکھے، سینے سے لگی سسکیاں لیتی رہی۔ یاسین نے بازوؤں کی گرفت نرم کی اور اپنے سے الگ کرتے ہوئے اتنا ہی کہہ پایا: "میرا احسان اُتر گیا ہے۔ تم پر کوئی بوجھ نہیں رہا۔ آئندہ اُس طرح سے اتارنے کی بات نہ کرنا۔ وہ رو پڑی اور بنا کچھ بولے اُس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ یاسین نے سائیڈ ٹیبل پر پڑے ڈبے سے ٹشو پیپر کھینچے اور اُس کی آنکھوں سے بہے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ چلی گئی اور یاسین سوچتا رہا کہ حُسن سوگوار ہوکر اور بھی جادُو اثر ہو جاتا ہے۔

نکاح کی تقریب میں شریک ہونے پر یاسمین کا دل نہ مانا۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے فون پر کہنے لگی: "سرجی! آپ بے شک نہ آئیں۔ میں ولیے کو سمجھا لوں گی۔ ویسے بھی نکاح کے بعد ان دونوں نے رخصت ہو کر آپ کے پاس نہیں آنا۔ ہم آپ سے جھوٹ بولتے رہے ہیں۔ دیکھنے میں آپ کے ساتھ صاف سیدھا دھوکا ہوا لگتا ہے۔ لیکن میرے دل میں آپ کے لیے ذرا بھی کھوٹ نہیں، اس لیے بے قصور ہوں۔ پندرہ بیس دن بعد خود آپ کو ساری کہانی سناؤں گی۔ اُسی وقت پر آؤں گی، جب نو بجے والی خبریں لگتی ہیں۔ پندرہ بیس دن کی بجائے، ہو سکتا ہے، ہفتہ پہلے آجاؤں۔"

خلقِ خدا کا مفروضہ سچ ثابت ہونے کو آیا۔ جمعرات کو پچھلے پہر سردیوں کی جھڑی لگی اور بدھ تک اسی طرح جاری رہی، کبھی رم جھم کبھی بوچھاڑ۔ شام کے بعد پھوار برسنے لگ گئی لیکن سرد جھونکوں کے ساتھ۔ یاسین کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگ گیا کہ ایک ایسی عورت کا خواہ مخواہ انتظار کیوں رہنے لگا ہے، جس کے ساتھ تو جوانی میں صرف دیکھنے کی حد تک تعلق رہا، اور پھر بھری جوانی میں اُس کی شہرت نے صدمہ پہنچایا۔ اور جب ملاقات ہوئی، تب اُس نے واقعی مایوس کیا۔ تاہم آخری ملاقات میں ایک اور ہی رُوپ دکھا کر حیران کر گئی۔ بہت سی اُلجھنیں ہیں، جن کو وہی سُلجھا پائے گی۔ اگر ہر سوال کا صحیح جواب دینے سے کترا نہ گئی۔ شاید اسی لیے اُس کی راہ تکنے لگا ہوں۔

ہوا کے تیز تھپیڑوں سے مینہ کے چھینٹے برآمدے کے اندر تک آنے لگے اور یاسین کے کمرے کی کھڑکی کے شیشے بھیگ گئے۔ ایسے طوفانی موسم میں وہ آ گئی۔ اُس کی چھتری اُلٹ کر ناکارہ ہو چکی تھی۔ تاہم سر سے پاؤں تک رین کوٹ میں ملفوف ہونے کے باعث بھیگنے سے محفوظ رہی۔ صرف چہرہ بارش کے پانی سے تر تھا۔ اُس نے رین کوٹ اُتار دیا اور یاسین کے ہاتھ سے تولیہ لے کر چہرہ خشک کرنے لگی۔ چہرے اور

ہاتھوں کی جلد ڈھل جانے سے مزید دمک اُٹھی۔ بھیگے ہوئے موزے بھی اتار دیے اور یاسین کے کہنے پر اسی تولیے سے پاؤں خشک کر کے قالین پر چلتی بیڈ کے قریب آ گئی۔ یاسین نے ہیٹر کے سامنے کرسی رکھ دی اور بیٹھنے کو کہا۔ اُس نے گھٹنوں تک فراک نما اُونی سویٹر پہن رکھا تھا، جس کی جیب سے پلاسٹک میں لپٹا، خاکی لفافے کا پیکٹ نکال کر میز پر ڈال دیا اور اطمینان سے بیٹھ گئی۔ مسکرا کر بولی: ''جمعرات کی لگی جھڑی اب کل ہی ختم ہوگی۔ میں نے اسی لیے دو دن پہلے ہی، سوموار کو برساتی خرید لی تھی کہ سرجی سے ملنے ضرور جانا ہے۔''

یاسین کی نظریں اُس کے چہرے سے چپکی جا رہی تھیں۔ مسکرایا اور کہنے لگا: ''تم مجھے میرے نام سے کیوں نہیں پکارتی؟'' وہ ہنس پڑی اور نظریں ملا کر بولی: ''دل تو بہت چاہتا ہے مگر ہمت نہیں پڑتی۔ پچھلی ملاقات میں نام بولتے بولتے رہ گئی۔ دل نے کہا: اڑیے! ابھی نہیں...... اپنی اوقات میں رہ...... ذرا یاد کریں، جب آپ نئے نئے کالج میں داخل ہوئے تھے۔ سلیٹی رنگ کی پینٹ، سرخ ٹائی، سفید قمیض اور......'' قالین میں میرُون رنگ کی طرف اشارہ کر کے بولی: ''اس طرح کے سرخ رنگ کا کوٹ...... ہُو بہو وہ مُورت میں نے سنبھال کے رکھی ہوئی ہے......''

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور بولنے لگی: ''بھلا کہاں؟...... آپ کو نہیں پتا...... میں بتاتی ہوں...... اپنے دل میں ایک کمرہ بنایا۔ اُس کو روز سجایا کرتی تھی۔ باریاں دروازے کھول کے ہوا لگواتی اور صفائی کرتی۔ کنگنی پر رکھی آپ کی مورتیں ایک ایک کر کے ہاتھ میں لیتی اور ڈوپٹے سے جھاڑ کر دوبارہ کنگنی پر رکھ دیتی۔ جتنے آپ کے رُوپ دیکھے، اتنی ہی مورتیں بنالیں اور ترتیب سے کنگنی پر سجا دیں۔ کبھی کبھی یوں لگتا، جیسے ہم دونوں...... آپ اور میں اس کمرے میں رہ رہے ہیں۔ پھر یہ خیال آتا، نہیں، میرا وہم ہے۔ آپ دور دیس گئے ہوئے ہیں۔ کوئی خط پتر لکھا نہ خیر خبر دی۔ بھول گئے ہوں گے۔ مگر میں

انتظار کروں گی...... اُن دنوں میری عمر اٹھارہ سال دو تین مہینے ہوئی ہو گی۔ بیٹی بھی ڈیڑھ سال کی ہو چکی تھی...... مجھے پندرھواں سال لگا تھا، جب میری شادی ہوئی۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھاتی اور کہتی: شرم کر بے حیا! نکاح تیرا افراسیاب سے ہوا ہے اور رہتی ہو اُس کے ساتھ، جو مُورتیں نشانی دے گیا اور مُڑ کے نہیں آیا......"

باہر بارش تھم جانے سے سناٹا چھا گیا۔ وہ سحر زدہ سی آواز میں بولتی جارہی تھی:

"افراسیاب ابھی برباد نہیں ہوا تھا۔ ہر وقت میرے آگے پیچھے پھرتا۔ اتنا فضول خرچ بندہ، توبہ اللہ جی! معاف کر...... میں اُس کو منع کرتی۔ وہ باز نہ آتا اور یہی کہتا کہ وہ اپنے چاؤ پورے کر رہا ہے۔ روزی روٹی کے لیے کوئی کام نہ کرتا۔ مجھ سے شادی کرنے کی خاطر اتنی ضد کی کہ باپ اور بھائیوں سے فساد کر کے جائیداد سے اپنا حصہ الگ کروایا۔ میرے باپ نے منہ کھول کے پیسے مانگ لیے...... ذرا حساب لگائیں، اُس زمانے میں تین لاکھ روپیہ...... کہتے ہیں، اتنی رقم میں نیا ٹرک مل جاتا تھا۔ افراسیاب نے بڑی قیمتی زمین صرف پانچ لاکھ میں بیچ دی۔ تین لاکھ میرے اماں ابا کو دیئے اور کچھ شادی پر پاگلوں کی طرح فضول خرچ کر ڈالے۔ باقی کے شادی کے بعد بغیر سوچے سمجھے اڑانے شروع کر دیے۔

سائیڈ ٹیبل پر پلیٹ میں رکھی برقی کیتلی نے سیٹی بجائی۔ یاسمین نے پیالے ترتیب سے رکھے اور کیتلی کا سوئچ آف کر کے پانی انڈیلا۔ ٹی بیگ چینی اور دودھ ملا کر چمچ ہلانے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی: "ساس سسر جب تک زندہ رہے، مجھ سے دشمنی نہ چھوڑی۔ ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ اُن کا بیٹا میری وجہ سے برباد ہوا ہے۔ میں نے اُس پر جادو کر دیا اس لیے وہ پاگل ہو گیا۔ مجھے جادو ٹونا آتا ہی نہیں۔ ویسے ہی مجھ پر الزام دھرتے رہے۔ معیزہ جب چھ سات سال کی ہوئی تو سسرالیوں نے ہمارے گھر میں فساد کھڑا کر دیا۔ کہنے لگے، لڑکی اُن کی عزت غیرت ہے۔ ہم میاں بیوی اس کو

خراب کر دیں گے۔ افراسیاب نے اُن دنوں پوڈر کا نشہ بھی شروع کر دیا ہوا تھا۔ صرف دو دکانوں کے کرائے پر ہمارا گزارہ ہو رہا تھا۔ وہ سارا سارا دن سردار دل نواز کے پاس گزار دیتا اور اُس کے ساتھ بیلے میں شکار کھیلنے چلا جاتا۔ رات کو بھی بڑی دیر تک اُس کے پاس رہتا۔"

چائے کا پیالہ اور بسکٹوں والی پلیٹ مہمان کے آگے کھسکا کر یاسمین نے پوچھا کہ لڑکی کا اتنا خوبصورت نام کس نے رکھا تھا۔ وہ چائے کا گھونٹ لے کر بولی:

"میری نند نے۔ ایک ہی نند ہے اور خاندان میں صحیح طرح کالج تک صرف وہی پڑھی ہے...... اُسی نے بتایا تھا کہ معیزہ نام، حضور پاکؐ کی بلّی کا تھا......" عقیدت بھرے جذبات اُمڈ آنے سے وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئی۔ خیالی سا گھونٹ بھرتے ہوئے بولنے لگی:

"میں نے نند سے کہا: کہیں بے ادبی نہ ہو جائے، ہم اُس بلّی کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ کہنے لگی: جاہل ہو تم بالکل۔ سوائے رنگ رُوپ اور شکل، تیرے پلّے دھیلے کی عقل نہیں۔ تیری ماں بہن کتنی کا نام عائشہ ہے اور میری کا زینب...... اور جن عورتوں کا فاطمہ اور حلیمہ ہوتا ہے، اُس سے بے ادبی نہیں ہوتی؟......"

اوپر تلے چند گھونٹ چائے کے لیے اور ایک بسکٹ کھا کر پیالے میں بچی ہوئی چائے پی ڈالی۔ انگلیوں کی پوروں سے ہونٹوں کے دونوں گوشے صاف کیے اور بولنے لگی: "افراسیاب کہنے لگا: سُنبل جان! افراسیاب کی چند جان! میرے ماں باپ کی بات مان لو۔ ہماری بچی اپنی پھوپھو کی طرح پڑھ لکھ جائے گی۔ دس قدم پر گھر ہے، جا کر مل آیا کرنا...... میری کیا حیثیت کہ میں روک لیتی۔ صرف اُن لوگوں کی باتوں سے کلیجا جلتا تھا۔ اللہ پاک نے مجھے حُسن دیا ہے، اس میں میری کوئی غلطی نہیں۔ لوگ مجھے دیکھتے ہیں، میں کیا کروں؟ اگر میں خراب ہوں تو بتاؤ...... خرابی اُس وقت شروع ہوئی، جب افراسیاب پوڈر بھی پینے لگ گیا۔ میری شادی کے وقت صرف شراب پیتا تھا۔ مجھے پکا

یقین ہے کہ سردار دل نواز نے اُس کو پوڈریا بنایا تھا۔ خود وہ شراب ہی پیتا رہا۔ ایک بار نشے میں بک دیا۔ میں حیران ہو گئی۔ کہنے لگا: تجھے حاصل کرنے کے لیے تیرے شوہر کو ہیروئین کا نشئی بنایا ہے......"

بجلی اتنے زور سے چمکی کہ کمرے کے اندر کی روشنی ایک دو لمحوں کے لیے ماند پڑ گئی۔ فوراً بعد بادلوں کی ہولناک گرج کڑک سے کھڑکیاں دروازے لرز اُٹھے۔ دونوں نے ایک ساتھ کھڑکی کے شیشوں پر نگاہ ڈالی۔ وہ سہم گئی اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگی۔ کپکپاتی آواز میں بولی: "سر جی! چائے مزے کی تھی۔ ایک کپ اور پیئوں گی......" یاسمین نے کیتلی کا سوئچ آن کر دیا۔ بارش دوبارہ برسنے لگی۔

یاسمین نے سوال کیا کہ سردار دل نواز کے ساتھ تعلق کیسے قائم ہوا تھا۔ وہ کہنے لگی: "خاوند کی غیرت مر جائے تو بیوی کچھ نہیں کر سکتی۔ میرا سسرال ہر بات کا جرم میرے سر ڈالتا ہے۔ میری کسی نے دہائی نہ سنی اور افراسیاب نے مکان بیچ دیا۔ ساتھ دکانیں بھی گئیں۔ بالکل ہی چھٹی ہو گئی۔ کوئی سمجھ نہ آئی کہ اُس نے ڈیڑھ سال میں ساری رقم کہاں پھونک ڈالی۔ سردار نے اپنا باغ والا گھر رہنے کو دے دیا۔ افراسیاب کا جسم ہی بے کار نہ ہوا، دماغ بھی گل سڑ گیا۔ روز ہی مجھے سمجھانے لگ جاتا اور کہتا: میں ختم ہو چکا ہوں، زیرو بٹا زیرو۔ اور تم اصلی جوان اب ہوئی ہو، اٹھائیس سال کی عمر میں اٹھارہ سال کی لڑکی سے زیادہ خوبصورت اور فل بٹا فل جوان دکھائی دیتی ہو۔ تمہارے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ تمہارے لائق اصل میں سردار دل نواز جیسا بندہ ہے، فل بٹا فل جوان۔ وہ تم پر فل بٹا فل عاشق ہے۔ اگر تم نے انکار کیا تو مر جائے گا۔ میرا وہ دوست ہی نہیں بلکہ اللہ کے بعد وہی سہارا ہے۔ یہ شادی بیاہ کی فضول رسمیں ایسے ہی بنی ہوئی ہیں۔ اصلی معاملہ وہی ہوتا ہے، مرد عورت والا۔ مجھ جیسے زیرو بٹا زیرو بندے کے لیے جوانی برباد نہ کرو۔"

احساسِ زیاں تھا یا ندامت، آنکھیں صرف نم ہوئیں لیکن گلا پامال ہو گیا۔ شاید آنسو اندر گرے ہوں۔ کہنے لگی: "سردار زیادہ وقت ہمارے پاس گزارنے لگا۔ خاص کر رات اُدھر ہی رہتا۔ ہر نعمت کے ڈھیر لگائے رکھتا۔ میرے ایسے ایسے کپڑے زیور اور تحفے لایا کرتا، جو ملک کے صدر کی بیٹی کو بھی نصیب نہ ہوتے ہوں گے۔ افراسیاب کو پُڑی مانگنے کی بھی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ ہر وقت حاضر رہتی۔ وہ زیادہ وقت بے ہوش پڑا رہتا۔ بالکل اَدھ مُوا سا۔ نیچے گھاس پر، کبھی برآمدے کے فرش پر یا کسی کمرے میں الگ تھلگ۔ دیکھنے سے ایسا دکھائی دیتا، جیسے جیتا جاگتا بندہ نہیں، گارا تھاپ کے سوکھا سڑا پُتلا بنایا ہو...... اب بھی ایسا ہی ہے۔ جب تک آنکھوں کی پتلیاں نہ ہلائے، یہی شک پڑتا ہے کہ مٹی کا بے جان بُت پڑا ہوا ہے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ وہ آخری بار کب نہایا تھا......"

یاسین نے چائے کا کپ آگے رکھا اور چُپ چاپ دیکھے گیا۔ اُس نے چائے کے کئی گھونٹ لیے۔ ٹی بیگ کو ڈبکیاں دینے لگی اور ساری چائے ایک ساتھ پی کر بولی: "بڑا سخت جان ہے۔ اللہ سے فریاد کرتی ہوں کہ اس کو اٹھا لے یا ٹھیک کر دے۔ دنیا میں ہی سارے عذاب بُھگت رہا ہے......"

سُنبل جان نے کالے سیاہ چمکیلے موٹے گف مخمل کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی، جس میں کہیں کہیں سرخ گلاب کے کھلے ہوئے پھولوں کا پرنٹ تھا۔ اُس نے بایاں گھٹنا میز سے باہر نکالا اور اس پر چٹکی بھر کر مخمل کا کپڑا ایک ڈیڑھ انچ اوپر اٹھا لیا۔ یاسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی: "افراسیاب کے جسم پر کھال اس طرح سے ڈھیلی ہو چکی ہے۔ جتنا کھینچیں، کھنچتی چلی جائے گی۔ زیادہ زور نہیں لگانا پڑتا۔ جُھریاں ایسے پڑ گئی ہیں، جیسے سو سال کی بوڑھی عورت ہو۔ ناواقف بندہ دیکھ کر بالکل نہیں مانے گا کہ چالیس پینتالیس سال کا مرد پڑا ہوا ہے۔"

''اِس خاندان کے سارے مردوں کی داڑھی مونچھوں کے بال برائے نام ہی اُگتے ہیں۔ افراسیاب کے بھی بہت کم ہوا کرتے تھے۔ پچھلے مہینے اُس کو پارک میں دوپہر کو لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ سر پر جھاڑی اُگی ہوئی اور چہرہ دیکھ کر یوں لگا جیسے بوڑھی بیمار عورت کا ہو......'' یاسین نے سنبل جان کو ٹوکتے ہوئے اُس کی تصدیق کر دی۔ وہ کہنے لگی: ''میں مانتی ہوں کہ سردار سے میری دوستی ہو گئی اور اچھا لگنے لگا۔ بندہ کیا کرے؟ آخر عورت بھی انسان ہے۔ جب اُس کا خاوند کھلی چھٹی دے اور ہر بات پر کہے: زیرو بٹا زیرو، فل بٹا فل...... میں نے کہا، چلو پھر ٹھیک ہے۔ سردار نے میرے نخرے بھی خوب اٹھائے۔ اُس کی اپنے برابر چوٹی کے لوگوں اور بڑے بڑے افسروں سے دوستیاں تھیں۔ راتوں کو پارٹیاں ہوتیں۔ دوستوں کی بیویاں یا دوست عورتیں ساتھ ہوا کرتیں۔ ناچ گانے اور شرابیں، سب کچھ ہوتا۔ سردار ہر جگہ مجھے ساتھ لے جایا کرتا۔ اس طرح بڑے بڑے لوگوں سے میری اچھی واقفیت ہو گئی......''

یاسین نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھ لیا کہ سردار کے مرنے کی اصل کہانی کیا ہے۔ وہ بولی: ''سردار مہینے میں ایک دو بار شکار کھیلنے ضرور جایا کرتا تھا۔ ساتھ افسر اور بڑے لوگ بھی ہوتے۔ کچھ بیگمیں ہوتیں۔ کبھی کبھی میں چلی جاتی۔ عورتیں خیمے میں رہ جاتیں اور نوکروں سے کھانے پکوایا کرتیں۔ سردار کو سُور مارنے کا زیادہ شوق تھا۔ اُس دن میں اور صرف چار بیگمیں تھیں۔ بڑے بڑے نسلی اور قیمتی کتے ساتھ ہوا کرتے تھے، جو جنگل میں سُوروں کو ڈھونڈ کر باہر نکالتے۔ سردار کا سالا، سردار شاہجہان اُس دن شکار پارٹی میں شامل تھا۔ ہم عورتیں بیٹھی گپیں لگا رہی تھیں۔ کتوں کے بھونکنے سے سمجھ گئیں کہ شکار مل گیا ہے۔ تڑتڑ گولیاں چلیں۔ دہائی مچ گئی اور دس پندرہ منٹ بعد ہی پانچ چھ بندے، لہو میں تربتر ہوئے پڑے سردار کو گیلی کی طرح کندھوں پر اٹھائے آ گئے۔ پیچھے سے پسلیوں میں گولی لگی اور دل کو چیر گئی۔ وہ بے چارہ فوراً ہی مر گیا تھا۔ اُس کا سالا

واویلا کر رہا تھا کہ سُور پر فائر کیا مگر لالہ دل نواز بیچ میں آ گیا......"

سُنبل اُس لمحے اُداس ہو گئی اور بولی: "ساری دنیا جانتی ہے کہ سالے نے سوچ سمجھ کر بہنوئی کا نشانہ لیا اور ایل جی کا فائر مار کے پسلیاں توڑ دیں۔ مگر بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ایک ہی خاندان ہے۔ برادری کا اکٹھ ہوا۔ فیصلہ ہو گیا کہ اتفاقی حادثہ ہے۔ مرحوم کی اسی طرح موت لکھی ہوئی تھی۔ مقدمہ خارج ہو گیا۔ اب بیوہ اعلانیہ کہتی پھرتی ہے: کیا ہو گیا؟...... بھائی میرا سُور کا شکار شوقیہ کیا کرتا تھا۔ وہی شکار اب بھی کیا، کون سا ظلم کر دیا......"

نہ چاہتے ہوئے بھی یاسین ہنس پڑا، تاہم فوراً سنجیدہ ہو گیا۔ اُس کی طرف دیکھ کر اتنا ہی کہا: "پھر کیا ہوا؟" وہ کہنے لگی: "بڑی جابر عورت ہے۔ عورت لگتی ہی نہیں۔ بالکل مردوں جیسی کاٹھی، خوب تگڑی اور گرج دار آواز۔ چہرے پر بال بھی اُگ آتے ہیں۔ پچھلے سال جب سردار قتل ہوا، اس سے دو تین مہینے پہلے سارا خاندان اکٹھا کر لیا اور خاوند کو دبا کر راضی کیا۔ اکلوتے بیٹے کو ایسی قسم ڈالی کہ وہ چپ ہو گیا۔ ایک لفظ نہ بول سکا۔ ہُو بہُو اپنے جیسی اپنی سگی بھتیجی سے بے چارے چھوٹے سردار خاور نواز کا نکاح کروا دیا۔ اُسی شاہجہان کی بیٹی کے ساتھ۔ بیٹے نے بڑی منتیں کیں کہ اُس کو پڑھائی ختم کر لینے دے لیکن نہ مانی اور مہینے بعد رخصتی کروا کر بہو کو گھر لے آئی......"

سُنبل جان لحظہ بھر کو خاموش ہو گئی اور کچھ سوچ کر بولی: "مجھ غریب کو سرداروں نے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی اور کہا کہ میں کہیں چلی جاؤں...... کہاں چلی جاتی؟...... ساس سُسر غم کے مارے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جیٹھ اپنے اپنے گھروں کے اور نند کی شادی ہو گئی۔ میں نے سوچا، بڑے بڑے لوگوں سے واقفیت بنی تھی۔ آزمانے کا یہی وقت ہے۔ پارٹیوں میں بچی بات ہے، اتنا ہلا گلا ہوتا اور کسی کو ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ بڑے چھوٹے کا فرق ختم ہو جاتا اور سب برابر کے دوست بن جاتے۔

مجھے بھی افسر لوگ ''دوست'' کہہ کر بلاتے۔ میں ایس پی صاحب سے جا ملی اور ساری بات بتائی۔ انھوں نے اُسی وقت سردار شاہجہان کو فون ملایا اور بولے: سردار صاحب! ہمارا یار جیسے مرا، سب کو پتا ہے۔ بیوہ نے پرچہ درج کرایا، واپس لے لیا، قانون بے بس ہو گیا۔ کاش! بے چارے کا باپ یا بھائی زندہ ہوتا...... خیر! وہ آپ کے خاندان کا اندرونی معاملہ تھا۔ لیکن سُنبل جان ہماری دوست ہے...... مرحوم دوست کی دوست۔ اس کی حفاظت ہمارے ذمے ہے......''

یاسین اُس کو ایک ٹِک دیکھے جا رہا تھا۔ زیرِ لب مسکرایا تو وہ بھی مسکرا دی اور کہنے لگی: ''بالکل امن امان ہو گیا۔ ایک بات کا بڑا افسوس ہے۔ اپنے پاک صاف ہونے کی قسم نہیں دیتی۔ سردار کے ساتھ میرے تعلق کا سب کو پتا ہے۔ میں کچھ اور خاص بڑے لوگوں کی بات کر رہی ہوں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ لوگ جھوٹ بہت بولتے ہیں۔ جس نے کبھی مجھے زندگی میں انگلی سے بھی نہیں چھوا، وہ بھی مزے لے لے کر لوگوں کو کہانیاں سناتا ہے...... کچھ اس طرح کی، جیسے کئی کئی راتیں میرے ساتھ گزاری ہوں۔ سردار کے علاوہ، پانچ نہ ہوئے تو شاید چھ ہوں۔ وہ بھی شک والی بات ہے۔ چلو، کُل سات ہی مان لیے۔ لیکن اُن ساتوں میں سے باقی کے چھ بات بھی نہیں کرتے...... اور شہر سارے کے مرد منادی کرتے پھرتے ہیں...... ظالم لوگ میری معصوم بیٹی کو بھی نہیں بخشتے۔ وہ اللہ کے فضل سے اس طرح پاک صاف ہے، جس طرح سیپ میں بند پڑا ہوا سچا موتی......''

''گولی مارو لوگوں کو۔ مجھ سے قسم لے لو، کبھی کسی سے بات کی ہو، ایسی......

حالانکہ جوانی میں قدم رکھتے ہی تیرے ساتھ نظر بازی ہوئی...... تم نے جو بیٹی کے ساتھ ظلم کیا ہے، اُس نے میرے ہوش بھلا دیے ہیں۔ اُس کو بُڈھے کے ساتھ بیاہ کر کس سے بدلہ لیا ہے؟'' یاسین نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی: ''کوئی ظلم نہیں کیا۔ ابھی

بتاتی ہوں......'' اُس نے ذرا سا توقف کیا اور میز پر پڑے پیکٹ کو دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا اور کھولتے ہوئے بولی: ''پہلے اپنی امانت لیں...... پھر اصل کہانی سنیں......''

پیکٹ میں سے بینک کی سیل کی ہوئی پانچ پانچ سو روپے کے نوٹوں کی گڈی نکل آئی۔ یاسین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگی: ''بہت مہربانی۔ میں نے مشکل سے اپنا مکان خریدا اور ضروری سامان، فرنیچر وغیرہ...... بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے بالکل خالی ہوئی پڑی تھی۔ آپ نے ایسے وقت پر مدد کی، جب میں کسی اور کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہتی تھی...... یہ پکڑیں ناں!!!''

یاسین غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ سوچ کر بول پڑا: ''میں نے واپس لینے کی نیت سے نہیں دیئے تھے...... میرے پاس اِن کی کمی بھی نہیں...... اور یہ ہیں بھی بہت زیادہ۔ میں نے بائیس تئیس یا زیادہ سے زیادہ پچیس ہزار دیئے ہوں گے......'' وہ کُرسی سے اُٹھی اور نوٹ اُس کے پہلو میں بیڈ پر ڈال دیئے۔ سیدھا ہاتھ بڑھا کر اُس کے بائیں کندھے پر رکھ دیا اور جذباتی لہجے میں بول پڑی: ''اس کندھے کا کرایہ ادا کرنے کی میری حیثیت ہی نہیں۔ صرف ہدیہ نذرانہ پیش کر رہی ہوں...... اِس کندھے کا، جس پر سر رکھ کر میں روئی تھی......''

وہ پھر رو پڑی اور یاسین نے اُس کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔ اُس کی اپنی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ وہ جلد ہی سنبھل گئی اور بازوؤں سے نکل کر کرسی، بیڈ کے قریب کھینچ لی۔ آنکھیں صاف کر کے بیٹھ گئی اور کہنے لگی: ''جتنے بھی دوست ملے...... خاوند کو بھی شامل کر لیں۔ سارے ہنسنے کھیلنے والے ہی تھے۔ دکھ درد سُننے اور آنسو پونچھنے والا کوئی نہ مِلا۔ رونے کو کندھا اُسی نے دیا، جس کی پہلی پہلی مُورت اور بعد کی کئی مُورتیں، دل میں اوسارے کمرے کی کنگنی پر سجا رکھی تھیں...... دُکھوں کی سانجھ کسی سے نہ بنی سر جی! آخر آپ سے ہی ہوئی...... دُکھوں کی سانجھ سے بڑا رشتہ کوئی نہیں ہوتا۔ اس

کی قدر مجھ سے پوچھیں۔ میں اِس تجربے سے گزری ہوں...... جب خاوند اُلٹی پٹی پڑھانے لگ گیا اور میں نے دُکھی ہو کر اپنی سگی ماں سے گِلہ شکوہ کیا تو وہ بے زار ہو کر بولی؛ مرجانی! اللہ نے عورت کو اسی کام کے لیے بنایا ہے۔ تم نے اپنا اچار ڈالنا تھا؟ جا دفع ہو اور عیش کر۔ اچھا کھا پی اور مزے لوٹ......" وہ آبدیدہ ہوئی مگر ہنس پڑی۔

جمعرات کی صبح بڑی نکھری تھی۔ آسمان صاف اور دھوپ راحت بخش۔ زبانِ خلق غلط ثابت ہوگئی...... دونوں ناشتا کر رہے تھے۔ یاسین بول پڑا: "رات معتبرہ کی بات رہ گئی۔ اب تفصیل سے بتاؤ۔ اتنی پیاری بچی کے ساتھ ظلم کیوں کیا؟......" وہ کہنے لگی: "اوروں کی باتیں ہوتی ہی رہی ہیں زندگی بھر...... اپنی، خاص دل کی باتیں کرنے کا موقع رات کو ملا اور باقی سب کچھ بھول گیا۔ اب ناشتا کرلوں۔ بات ذرا لمبی ہے۔ فارغ ہو کر سناتی ہوں۔" کچھ سوچ کر بولی: "آپ کا یہ سکول کالج کب کھلتا ہے؟ داخلے والے لڑکے لڑکیاں آنے لگ گئے تو......" اُس نے نفی میں سر ہلا دیا اور کہا: "ابھی کہاں آئیں گے؟ لمبی چھٹیاں ہیں......"

واش رُوم سے تسلی کر کے مُشکل جان نکل آئی۔ بیڈ پر دونوں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور رضائی سینے تک کھینچ لی۔ یاسین کے بائیں کندھے پر سر ٹکاتے ہوئے وہ بول پڑی: "سردار خاور نواز نے بہت بڑی افسری کا امتحان پاس کر کے اسلام آباد میں گورمنٹ کی نوکری شروع کردی ہے۔ وہاں وہ اپنی کوٹھی میں رہے گا۔ بڑی شاندار بلڈنگ ہے۔ میں کئی بار وہاں رہی ہوئی ہوں، سردار دل نواز کے ساتھ۔ خاور جن دنوں افسری کی ٹریننگ کر رہا تھا، چھٹی پر گھر آیا تو ایک رات مجھے ملنے آ گیا...... اللہ بُری نظر سے بچائے۔ کسی کو نہ بتائے، پھر بھی پتا چل جائے کہ کوئی سردار ہے۔ اُس کے آنے پر میں ڈر گئی۔ یہی سوچا کہ ماں یا ماے کے کہنے پر ڈانٹنے آیا ہوگا۔ نہ صاحب! وہ تو اتنے پیار سے ملا اور کہنے لگا: "آنٹی! آپ میرے مرحوم والد صاحب کی دوست تھیں، اس

لیے دل سے قدر کرتا ہوں۔ اُن کے ساتھ میری والدہ صاحبہ اور ماموں جان نے ظلم کیا۔ امی جان بڑی سخت مزاج ہیں اور ابا جی ان سے عمر میں چار پانچ سال چھوٹے تھے۔ خاندان کے وقار کی خاطر وہ بیوی کی زیادتیاں برداشت کرتے رہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ آپ کو بہت پسند کرتے تھے، اس لیے میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ اُن کی زندگی کی اصل ساتھی آپ ہی تھیں۔"

یاسمین کے جسم میں حرکت ہوئی۔ اُس نے گھٹنے سمیٹ لیے۔ سُنبل کا سر دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی گود میں رکھا اور حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا دی اور بولی: "قسم سے، جو اُس نے کہا، وہی بتا رہی ہوں...... وہ کہنے لگا: میرا مسئلہ یہ ہے کہ امی جان، میری تین چھوٹی بہنوں کی بھی ماں ہیں اور میں اپنی بہنوں سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ گھر میں کسی قسم کی بدمزگی نہ ہو۔ تاکہ سکون رہے اور میری بہنوں کو ذہنی پریشانی نہ ہو۔ اسی لیے ماموں کی بیٹی سے نکاح کر لیا لیکن امی جان سے صاف کہہ دیا کہ مجھے آپ کی بھتیجی ذرا بھی پسند نہیں۔ انھوں نے کہا: مجھے معلوم ہے۔ جس طرح تمہارا باپ مجھ سے نفرت کرتا رہا، تم بھی اسی طرح کرو گے۔ لیکن خاندان کی ریت یہی ہے کہ بیوی خاندانی ہو۔ باقی تم اپنے باپ کی طرح باہر جو مرضی ہوئی، جھک مارتے رہنا۔ آج تک ہمارے خاندان کی کون سی عورت اپنے خاوند کو روک سکی ہے؟...... لیکن دو تین سال کے پرہیز والی شرط تم کو لازماً ماننا ہوگی تاکہ کم سے کم دو بچے مجھے اپنی خاندانی بیوی سے لازماً دے سکو...... چونکہ یہ بھی شروع دن سے ہمارے خاندان کا اصول چلا آ رہا ہے......"

عجیب طرح کے موضوع پر ہونے والی باتوں میں یاسمین کی دلچسپی بہت بڑھ گئی۔ سُنبل کو کندھوں سے تھام کر سیدھا بٹھا دیا اور کہا: "گردنیں موڑنے سے بات کا مزہ نہیں آ رہا۔ آمنے سامنے بیٹھتے ہیں......" وہ سامنے بیٹھ گئی اور یاسمین نے اُس کے

بگر د رضائی لپیٹ کر دونوں پلوؤں سے اپنا بدن ڈھانپ لیا۔ وہ کہنے لگی: "خاور نے بتایا کہ اُس نے ماں سے وعدہ کر لیا ہے۔ اللہ کرے، پہلی دوسری کوشش پر ہی اولادِ نرینہ بل جائے، تا کہ لمبی آزمائش نہ پڑے۔ ریحانہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ خاندانی بیویوں کی طرح خاوند کا پیچھا نہ کرے، صبر سے گھر میں رہے، چونکہ اِس گھر کی اصل مالکہ وہی ہے۔ پہلی دوسری اولاد میں ملاوٹ نہ ہونے دے، اِس کے بعد وہ آزاد ہے۔ زمینوں پر اور گھر میں جدّی پشتی خادموں کی پلٹن ہے۔ کئی ایک خاوند سے بھی بہتر گھبرو جوان ہیں۔ کوئی اعتبار کا نہ ہو تو میکے سے لے آئے......"

یاسمین نے ہنس کر ہلکا سا ہاتھ چلا دیا لیکن چپیٹ لگانے کی بجائے دونوں گال پنجے کی گرفت میں لے کر چہرہ نزدیک لانے کا عندیہ دیا۔ اُس نے مچل کر سر سینے سے لگا دیا اور ہنس کر بولی: "قسم سے...... یقین نہیں آیا ناں!!...... لیکن میں بالکل صحیح کہانی سنا رہی ہوں...... وہی افراسیاب والی بات، فل بٹا فل اصل کہانی...... اور اب، فلموں میں جس طرح یک دم پارٹ کچھ کا کچھ آ جاتا ہے...... خاور نے آگے چل کر جو کہا، اب وہ سنیں۔ کہنے لگا: آنٹی! میں بات کو گھما پھرا کر کرنے کا عادی نہیں۔ بات یہ ہے کہ جس طرح ابا جی کی پسند آپ تھیں، اسی طرح میری پسند آپ کی بیٹی ہے۔ اپنی مجبوری آپ کو بتا چکا ہوں، بھنوں والی۔ امی جان کی شرط ہے کہ جب تک خاندانی بیوی سے اولاد نہیں ہو جاتی، بقول اُن کے میں جھک نہیں مار سکتا۔ حالانکہ میرے نزدیک جھک یہ نہیں بلکہ وہ ہے جو ریحانہ سے نکاح کر کے ماری ہے...... اب سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میں معیزہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کسی غریب بندے سے معاہدہ کریں کہ منہ مانگی رقم لے کر جھوٹا سا دکھاوے کا نکاح کر لے تا کہ نکاح نامہ بطور ثبوت پاس ہو۔ دونوں فوراً میرے پاس اسلام آباد آ جائیں۔ میں اُس شخص کو گھر میں ملازمت دوں گا اور نقد رقم، جو آپ نے طے کر رکھی ہو گی۔ بظاہر وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے بطور ملازم میرے گھر

میں رہیں گے...... اگر اُس نے نکاح کے بعد معیزہ کو ہاتھ لگایا تو میں کسی نہ کسی طرح اُس کا ہاتھ کٹوا دوں گا۔ میں آپ کو قرآن پاک پر حلف دینے کو تیار ہوں، کہ جس دن مجھے امی جان کی طرف سے سخت ایکشن کا خطرہ نہ رہا، میں معیزہ سے باقاعدہ نکاح کر لوں گا...... ہوسکتا ہے کہ میں فوراً طلاق دلوا کر جلد ہی نکاح کر لوں لیکن تین چار سال کسی پر ظاہر نہ ہونے دوں...... ایک بات آپ پلے باندھ لیں کہ میری اصل محبت اور بیوی، آپ جو بھی کہہ لیں، وہ معیزہ ہی ہے۔ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔''

یاسین نے اُس کو کندھوں سے تھام کر سیدھا کیا اور حیران پریشان ہو کر دیکھنے لگا۔ حیرانی مزید بڑھی، جب دیکھا کہ متعدد تجربوں سے گزرنے والی عورت، آنکھوں میں گہری نظر ڈالنے سے شرما گئی ہے۔ وہ بول پڑی: ''خاور نے مجھے دس لاکھ روپے دیئے اور بتایا کہ اُس کا دوست عباس رضا خود ملنے آئے گا۔ یہاں چھوٹا کمشنر لگا ہے، جس کو بسسٹنٹ کہتے ہیں۔ مکان خریدنے کے لیے کسی تحصیلدار کی ڈیوٹی لگائے گا۔ وہ فون بھی فوراً لگوا دے گا...... مجھے کہنے لگا: آنٹی! آپ کا فون لگتے ہی مجھے اطلاع مل جائے گی۔ میں ہر روز رات کو خود فون کر لیا کروں گا۔ جس دن نکاح ہوگا، میری گاڑی آ جائے گی۔ آپ نے خود معیزہ کے ساتھ بیٹھ کر میرے پاس آنا ہے...... لو جی!...... سر جی! میرا دماغ پھر گیا۔ سوچوں، یااللہ! تیری بندی گناہ گار...... ماں باپ سے کبھی بھول کر بھی کوئی نیکی ہوئی نہیں...... پھر بھی اتنا کرم......'' وہ ہنس پڑی اور ساتھ ہی بے اختیار آنسو بھی چھلک آئے۔

کہانی میں واقعی ایسا موڑ آیا کہ یاسین حیران رہ گیا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا اور بولا: ''سنبل جان!...... اے جانِ من! وہ ولی احمد بڑی لیس دار چیز ہے۔ ایسے لوگوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کس وقت کیا کر گزریں۔ سردار خاور نواز نیا نیا سی ایس ایس افسر بنا ہے۔ بعید نہیں کہ گھو چٹے ولی احمد بلیک میل کرنے لگ جائے۔ آخر وہ معیزہ

کا قانونی شرعی شوہر ہے۔"

شکیل نے انکار میں سر ہلا دیا اور کہا: "اس بات کا بالکل وہم نہ کریں۔ پکا بندوبست ہے..... قدرت کی طرف سے۔ آپ کو نہیں پتا۔ اُس کی ناف تلے برابر میدان ہے، اور ذرا سی گھتی۔ بے چارہ گھسرا ابھی نہیں، گھسری ہے ناں! اسی لیے جو پیسا ہاتھ لگے، اپنے مطلب کے مرد پر خرچ کر دیتا ہے۔ وہاں اسلام آباد میں بڑا خوش ہے۔ میں نے نکاح کے دس ہزار روپے چکائے ہوئے تھے۔ معیز و کو بیٹی کہتا ہے۔ مجھ سے کہا: باجی جی میری امانت معیز و بیٹی کے پاس رکھوا دیں۔ میں ضرورت پڑنے پر لے لیا کروں گا۔ صرف پانچ سو روپے اُس وقت لے لیے۔ میں نے اگلے روز دیکھ لیا کہ مالی سے دوستی ہو گئی ہے۔ رات کو اُسی کے کوارٹر میں سویا تھا۔"

ooo

پرتو

مالی ضرورت سے زیادہ میری مجبوری تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے محکمے کے ملازمین کی کوآپریٹو سوسائٹی میں ملازمت اختیار کر لی۔ سوسائٹی نے شہر سے باہر تقریباً بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایسی زمین خرید لی، جس میں جھاڑ جھنکاڑ کا جنگل اُگا ہوا تھا۔ وہ نیولوں کی قدرتی کالونی تھی، جنھوں نے سارے رقبے میں بلیں کھود کھود کر مٹی بھربھری کر رکھی تھی۔ بلی کی جسامت کے نیولے میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ سوسائٹی کی انتظامیہ نے خرید کردہ اراضی کو خاردار تاروں سے گھیر لیا، جس سے سُوروں کے ریوڑ آنے رُک گئے، تاہم چھوٹے جنگلی جانوروں کی آمد و رفت کا سلسلہ بند نہ ہو سکا۔ فرنٹ پر بڑا شان دار گیٹ تعمیر کیا گیا، جس کے ساتھ سیکیورٹی پوسٹ مع کوارٹر، ساتھ ہی اندر سائٹ آفس، اُوورہیڈ واٹر ٹینک اور مسجد کھڑی کر دی گئی۔ گیٹ سے آگے صرف پانچ سو گز لمبی مین بلیوارڈ بنائی گئی۔ مسجد اور سائٹ آفس کے بالمقابل بچوں کے پارک کا بورڈ لگا کر چند جھولے، سی سا (See-Saw) اور سلائیڈ نصب کر دی۔

قومی اخبارات میں بڑے پُرکشش اشتہارات شائع ہوئے کہ آج مٹی کے بھاؤ پر پلاٹ خریدیں اور مستقبل قریب میں سونے کے مالک بن جائیں۔ جی پی او سے

صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر۔ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے جنرل پبلک کا بھی محدود کوٹہ رکھا گیا ہے۔ پہلے آئیں پہلے پائیں۔ درخواستیں زیادہ وصول ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کی جائے گی۔

میری مجبوری یہ تھی کہ میں اپنے ہی گھر میں گزشتہ ایک دہائی سے ناپسندیدہ شخصیت بن کے رہ گیا تھا، لہٰذا رضا کارانہ اپنی پوسٹنگ سائیٹ آفس میں کروالی، جہاں ایک لحاظ سے چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی تھی۔ خوب آراستہ دفتر کے ساتھ رہائش کے لیے آرام دہ کمرہ بھی مل گیا۔ محکمے کے اسٹاف اور افسروں کی اکثریت نے سوسائٹی کی ممبرشپ حاصل کر رکھی تھی لیکن زمین شہر سے زیادہ دور خریدی جانے پر اعتراضات اٹھنے لگ گئے اور بددلی سی پھیل گئی۔ جس کے نتیجے میں زیادہ تر ممبران صرف پہلی قسط ہی ادا کر کے ٹھنڈے ہو گئے۔ لہٰذا اشتہاری مہم سے متاثر ہو کر عام پبلک آنے لگ گئی مگر سائیٹ آفس پہنچنے تک اُن کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا اور بعض برہمی کا اظہار کرنے لگتے۔ کئی ایک یوں زیرِلب بُڑبُڑا رہے ہوتے، گویا گالیاں بک رہے ہوں۔ میں چونکہ یہ سمجھتا تھا کہ اُنھوں نے یہاں تک پہنچنے میں خاصی مشقت اٹھائی ہے، اس لیے صبر کا دامن نہ چھوڑتا اور حتی الوسع خوش اخلاقی سے پیش آتا۔ ہر طرح کے افراد آتے۔ اکیلے یا دو دو، موٹر سائیکلوں پر، میاں بیوی اور بعض بچوں کے ہمراہ، بذریعہ رکشہ ٹیکسی یا موٹر کار۔ بچوں کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوتا۔ وہ آتے ہی جھولوں کی طرف دوڑ پڑتے اور میں اُن کے والدین کی گِلہ گزاری کو نظر انداز کرتے ہوئے دیوار پر لگے جہازی سائز کے نقشے کی طرف متوجہ کر کے مستقبل کے عظیم الشان رہائشی منصوبے کی خوبیاں بیان کرنے لگتا۔

وہ دسمبر کی آخری تاریخ تھی۔ سیاہ بادل چھائے ہونے سے سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سہ پہر کے وقت رہائشی کمرے کی کھڑکی سے میں نے ایک سبز رنگ کی بڑی سی کار کو گیٹ سے داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ فوراً دفتر میں آ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی سے اکیلا

شخص اُترا۔ میں نے دیکھا کہ گوری رنگت کے وجیہہ شخص نے شب خوابی کا گاؤن پہن رکھا ہے۔ پاؤں میں گاؤن سے ملتے جلتے بھورے رنگ کے اونی موزے اور ڈارک تان سلیپرز ہیں۔ وہ دفتر میں آنے کی بجائے سیکیورٹی گارڈ طلاوت خان کے ساتھ باتیں کرتا ہوا مین بلیوارڈ پر آگے کی طرف چل دیا۔ میں نے آفس بوائے غلام شبیر سے چائے بنانے کو کہا۔

کیتلی میں پانی کھولنے لگا لیکن مہمان آگے ہی آگے چلتا گیا۔ میرے اشارے پر شبیر نے سوئچ آف کر دیا۔ میں نے کوٹ کے کالر کھڑے کیے اور مفلر لپیٹ کر دفتر سے نکل آیا۔ دور تک نگاہ ڈالی۔ وہ دونوں، اسکیم کی سڑک جہاں تک پختہ بنی ہوئی تھی، اُس سے بھی کہیں آگے جا چکے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ نرالا شخص ہے، جو خود ہی معائنہ کرنے نکل پڑا۔ اُس کی گاڑی کو دیکھا۔ اس نمونے کی شیورلیٹ لڑکپن میں نئی نئی دیکھی تھی۔ غالباً پچپن اور ساٹھ کے درمیانی عرصے کا کوئی ماڈل ہوگی۔ اتنی پرانی اور قیمتی گاڑی کو بڑی اچھی حالت میں دیکھ کر مجھے گمان گزرا کہ کوئی رئیس ابنِ رئیس ہوگا۔ بعید نہیں کہ مالی وسائل سکڑ گئے ہوں اور نئی گاڑی خریدنے کی استطاعت نہ رہی ہو۔

مجھے سردی محسوس ہونے لگ گئی۔ دفتر میں چلا آیا اور ہیٹر کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ پچیس تیس منٹ کے بعد وہ شخص اندر داخل ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر خیر مقدمی کلمات کہے اور اپنا تعارف کرایا۔ اُس نے مصافحہ کرتے ہوئے جواباً ذرا سی بھی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا۔ تاہم اُس کے رویے میں سرد مہری اور رعونت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ یوں ملا گویا معمول کی ملاقات ہو۔ لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ اور چہرے پر اَن جانی چمک دکھائی پڑی۔ صبیح چہرے پر ایک دن کی بڑھی ہوئی کلین شیو سے سفید بالوں کے بُرے جھانک رہے تھے۔ البتہ سر کے بال گھنے تھے، جنہیں کنگھی سے باقاعدہ سنوارنے کا اہتمام کرنا گویا ضروری نہ سمجھا ہو۔ اپنا تعارف کرانے کی بجائے اتنا ہی بولا:

"مجھے سرمد کہتے ہیں۔"

میں نے اچھے سیلز مین کی طرح اُس کے نام کی تعریف کی۔ لیکن وہ شکریہ ادا کرنے کا مکلف نہ ہوا اور کہا: "یہ ہاؤسنگ اسکیم بڑی زبردست ہے......" اس سے پہلے کسی کی زبان سے توصیفی الفاظ ادا ہوتے سنے ہی نہ تھے۔ یہی سمجھا کہ طنزاً کہا ہوگا۔ عرض کیا: "آج نہیں تو کل یہاں خوب آبادی ہو جائے گی...... میرا مطلب ہے، چند سالوں میں انشاءاللہ آپ کا کہا ہوا سچ ثابت ہوگا۔" وہ بڑی بے ساختگی سے بول گیا: "اللہ نہ کرے......" مسکرا کر ذرا توقف سے دوبارہ بولا: "اِس کا اشتہار کئی بار نظر سے گزرا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر ہے تو ایک لحاظ سے شہر کے ساتھ جُڑا ہوا ٹاؤن ہوگا......"

میرے نزدیک اُس کی باتیں مبہم تھیں۔ صحیح طور پر سمجھ نہ پایا۔ تاہم گاہک پھنسانے کی غرض سے کہا: "دراصل یہاں تک آنے والی سڑک سنگل ہے اور شہر کے گنجان آباد علاقے سے گزرتی ہے۔ یہاں سے بائی پاس روڈ تعمیر کرنے کا عظیم منصوبہ حکومت کے زیرِ غور ہے۔ ساتھ ہی شہر کو ملانے والی سنگل روڈ بھی ڈبل ہو جائے گی۔ تب انشاءاللہ! آپ کی شیورلیٹ دس منٹ میں یہاں پہنچ جایا کرے گی۔"

اُس نے پھر وہی الفاظ اُسی بے ساختگی سے بول دیے: "اللہ نہ کرے۔"

میں نے خیر سگالی کے طور پر ہلکا سا قہقہہ لگا دیا۔ دراصل میں سمجھ ہی نہ پایا کہ اُس نے بددعا کیوں دی ہے۔

شبیر نے میز پر چائے اور بسکٹ لا رکھے۔ سرمد نے فوراً ایک نگاہ لڑکے پر ڈالی اور خوش گوار لہجے میں بولا: "شاباش بیٹا! اس کی بہت ضرورت تھی۔ لیکن میرے کپ میں ایک اور ٹی بیگ ڈالو۔ تب میرے مطلب کی چائے بنے گی۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا: "سڑک ڈبل ہو جائے، تب بھی اسی صورت میں آپ کے بتائے ہوئے

وقت میں پہنچا جاسکتا ہے کہ سارے موڑ نکال کر سڑک کو تیر کی طرح سیدھا کر دیا جائے اور شیور لیٹ کے لیے وی آئی پی روٹ لگا کر سڑک ایک سرے سے دوسرے تک خالی کرائی جائے...... اللہ نہ کرے وہ بُرا وقت آئے، ورنہ اس جگہ کا قدرتی حُسن تباہ ہو جائے گا۔ یہ خوبصورت مناظر، پُرسکون ماحول اور تازہ ہوا پھر میّسر نہ ہو گی۔ اللہ اُس بُرے وقت سے محفوظ رکھے۔ آپ مجھے قبرستان کے لیے مختص جگہ، موقع پر لے جا کر دکھا دیں۔ تلاوت خان کو پتا نہیں۔ چائے پی کر چلتے ہیں۔"

میں کھسیانا سا ہو کر ہنس پڑا اور کہا: "میں دکھا دیتا ہوں۔ ابھی صرف چار بُرجیاں لگا کر نشان دہی کی گئی ہے۔ آبادی شروع ہی نہیں ہوئی۔ آپ یہاں آباد ہونے کا پہلے فیصلہ تو کرلیں۔ قبرستان کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ اللہ خیر کرے......"

وہ کہنے لگا: "پلاٹ سے زیادہ اسی جگہ کی اہمیت ہوتی ہے۔ اصل جائے سکونت...... Life is an accident but death is an essential truth. کسی نے پیدا ہونا ہے یا نہیں، کوئی نہ جان پایا۔ لیکن جو پیدا ہو گیا، اُس نے مرنا ضرور ہے۔ پیدائش دراصل، میرے نزدیک حادثہ ہے، جب کہ موت سانحہ نہیں، جیسے عموماً سمجھا جاتا ہے۔ کسی بھی نوع کے جاندار کا جوڑا اس مقصد کو مدِ نظر رکھ کر باہم ملاپ نہیں کرتا کہ بچہ پیدا کرنا ہے۔ وہ دونوں محض جنسی بھوک مٹانے کی غرض سے اختلاط کرتے ہیں۔ پیدائش، اسی بھوک کے مٹنے کا refuse ہوتا ہے...... جو ایسے بن جاتا ہے، پیدا ہونے والے کے لیے...... اور پیدا کرنے والی کے لیے بھی...... صدمے اس سلسلے کے زیادہ تر وہی جھیلتی ہے، یا پیدا ہونے والے کو زندگی بھر جھیلنے پڑتے ہیں...... کبھی یہ ایسے نہیں بھی بنتا...... حُسنِ اتفاق سے......"

میرے دماغ میں آتش بازی کے پٹاخے سے چلنے لگ گئے۔ refuse کے حوالے سے دوسری بھوک کی جانب توجہ مبذول ہو گئی۔ سر جھٹک کر رہ گیا۔ چائے کا

مزید گھونٹ بھرنا یاد ہی نہ رہا۔ جب کہ وہ سامنے بیٹھا کامل اطمینان سے چائے پیتا رہا۔ اُس نے بسکٹ نہ لیا۔ آخر میں دونوں ٹی بیگ انگلیوں کی پوروں میں لے کر کپ میں نچوڑ ڈالے اور طشتری میں رکھ دیے۔ پیالے میں جو کچھ بچا رہ گیا تھا، ایک ہی بڑے سے گھونٹ میں پی کر مسکرا دیا۔ پیچھے مُڑ کر دیوار سے لگی کرسی پر بیٹھے آفس بوائے کو ایک نظر دیکھا اور بولا: ''خوش رہو بچے!''

پیدائش کے بارے میں مہمان کے خیالات سے مجھے اختلاف ہوا اور خاموش نہ رہ پایا۔ اتنا ہی کہا: ''میری ناقص رائے میں پیدائش کا عمل حادثہ نہیں، بلکہ عین امرِ ربی ہے۔ تمام رُوحیں اُس ذاتِ باری نے تخلیق کی ہیں۔ کائنات کا نظام جس سلیقے سے چل رہا ہے، اس میں کوئی بھی activity بلا مقصد نہیں ہو سکتی......''

سرمد مسکرا دیا اور میز پر پڑے اخبار کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے بولا: ''ہاں! اِس اخبار میں جو تفصیل چھپی ہوئی ہے، ''چند سال کے بچے کو زیادتی کے بعد قتل کر کے گٹر میں ڈال دیا۔'' شاید کسی بڑے مقصد کی خاطر ہوا ہو۔ دراصل میری عقل واقعی ناقص ہے۔ میں آج تک یہی سمجھتا رہا کہ خالقِ کائنات نے ایک خود کار مربوط نظام وضع کر رکھا ہے، جس کے تحت تخلیق کا عمل جاری رہتا ہے۔ اب اُس بے پرواہ ذات کو اِس امر سے کوئی سروکار نہیں کہ زمین پر کون کیا کر رہا ہے۔ جو جس پر غالب آ جائے، جیسا چاہے سلوک کرے، یہ زور آور کی صوابدید ہے...... خیر! چھوڑیں اس قصے کو...... میں چلتا ہوں۔ مجھے یہ جگہ اچھی لگی۔ کل آپ کے ہیڈ آفس جاؤں گا، بکنگ کے لیے......''

سرمد کے اُٹھتے ہی میں اور شبیر بھی کھڑے ہو گئے اور اُس کو گاڑی تک رخصت کرنے کی غرض سے ساتھ چل دیے۔ تلاوت خان بھی قریب آ گیا۔ سرمد نے اُس کے اور میرے ساتھ سرسری انداز میں ہاتھ ملایا جب کہ شبیر کو دیکھ کر مسکرایا، اُس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور گرم جوشی سے مصافحہ کر کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میری طرف دیکھ کر کہا:

"قبرستان پھر کبھی دیکھ لیں گے۔"

اگلے روز ہیڈ آفس میں چالیس بائی اَسّی کے پلاٹ کی یکمشت ادائیگی ہو گئی اور قبضہ دلانے کے لیے عملے کے دو ارکان سرمد کے ہمراہ آ گئے۔ اُس نے سائیٹ آفس سے پانچ سو گز آگے جہاں تک مین بلیوارڈ بن چکی تھی، وہاں پلاٹ پسند کیا تھا جس کا قبضہ حاصل کر لیا۔ ہمیں یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ وہ جلد از جلد مکان تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ سب انجینئر اور سرویئر نے یقین دہانی کرائی کہ سوسائٹی کی انتظامیہ نے اس سلسلے میں بھرپور تعاون کرنے کے احکامات جاری کیے ہیں۔

چھ ماہ سے بھی کم عرصہ میں انتہائی سادہ، صرف تین کشادہ کمروں، کچن، اسٹور، سرونٹ، پورچ، برآمدے اور گیرج پر مشتمل مکان تعمیر ہو گیا اور سرمد نے مختصر سا گھریلو سامان لا کر رہائش اختیار کر لی۔ اُس کے ہمراہ دو اور جاندار بھی آئے۔ ایک بوڑھا توتا اور دوسرا کمیاب نسل کا سفید جرمن شیفرڈ کتا۔ توتے کو وہ "چاچا" کہہ کر پکارتا۔ دونوں آپس میں بے تکان باتیں کرتے اور ٹھیٹھ پنجابی میں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے۔ کتے کو your excellency کہہ کر مخاطب ہوتا۔ مجھے اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں ایسا منفرد انسان دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اُس کے بارے میں جاننے اور قریب ہونے کی دلی خواہش تھی۔ وہ اچھا لگتا لیکن اُسی طرح پیش آتا جیسے پہلے روز ملا تھا۔ گرم جوشی نہ سرد مہری۔ اپنے بارے میں کبھی کچھ نہ بتایا۔ کون ہے، کہاں سے آیا۔ کوئی آگے پیچھے بھی ہے یا دنیا میں تن تنہا۔ روزی کا وسیلہ کیا ہے۔ سابقہ عمر کہاں اور کیسے گزری۔ ایسا ہر سوال بڑی ہوشیاری سے ٹال دیتا۔ زندگی کے بارے میں عجیب گنجلک فلسفے گھڑ رکھے تھے۔ تقدیر کو مانتا نہ دعا پر یقین ہونے کا اقرار کرتا۔ مختصر جواب دیتا اور بحث کرنے سے کترا جاتا۔ اس کے باوجود اُس سے باتیں کرنے اور قریب ہونے کو جی چاہتا۔

جس روز اُس کے مکان کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا، سوسائٹی انتظامیہ نے اشتہاری مہم کا آغاز ایک نئے ولولے سے کر دیا: ''تعمیرات شروع، محدود تعداد میں پلاٹ رہ گئے ہیں۔ بکنگ کا آخری موقع۔'' جب مکان آباد ہو گیا تو اشتہارات کی عبارت یوں شائع ہونے لگی: ''لوگ امن سکون سے رہ رہے ہیں۔'' کشمیر کا اثر بھی ہوا ہوگا۔ کچھ آس پاس اور سامنے نئی ہاؤسنگ سکیموں کے بورڈ بھی لگ گئے۔ نتیجتاً چند اور الاٹیوں نے بھی گھر بنانا شروع کر دیئے۔ لیبر آ جانے سے رونق بڑھ گئی۔ انتظامیہ کی طرف سے ملازم رکھا ہوا پیش امام، مولوی علی احمد خود ہی دوبارہ حاضر ہو گیا اور باقاعدگی سے پنجگانہ نماز پڑھانے لگا۔

ایک روز میں نے تعمیراتی کام شروع ہونے پر سرمد سے خوشی اور اطمینان کا اظہار کر دیا۔ وہ لمحہ بھر خاموش رہا اور پھر بول پڑا: ''فی الحال تو میرا گھر محفوظ ہی نظر آتا ہے۔ زیرِ تعمیر مکان گیٹ کے نزدیک ہیں۔ تشویش تب ہوگی، جب یہ سرگرمیاں میرے اڑوس پڑوس تک پھیل گئیں۔ پھر سوچوں گا کہ کیا کرنا ہے......'' زیرِ لب مسکرایا اور ذرا توقف کر کے بولا: ''آپ دعا پر یقین رکھتے ہیں۔ میں بھی سچے دل سے دعا کروں گا، آپ بھی کریں۔ اللہ مجھے اِس آزمائش سے محفوظ رکھے......'' میں اس بات کا کیا جواب دیتا۔ کھسیانا ہو کر ہنس دیا۔

آفس بوائے شبیر نے میرے لیے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ وہ سرمد کا ایسا گرویدہ ہوا کہ اوقاتِ کار کے بعد اُس کے پاس چلا جاتا۔ لڑکے کے ہمہ وقت موجود نہ رہنے سے جو میرے چھوٹے موٹے ذاتی نوعیت کے کام کاج آسانی سے ہو جاتے تھے، وہ اب خود کرنا پڑتے۔ لیکن میں اُس کو چوبیس گھنٹے حاضر رہنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے حیرانی بھی ہوا کرتی کہ اٹھارہ بیس سال کا محض میٹرک پاس لڑکا اِس اُلجھے ہوئے ذہن کے گہرے گھمبیر انسان سے کیا گفتگو کرتا ہوگا۔ دونوں میں کون سی قدر مشترک

ہے۔ عمروں میں زیادہ نہیں تو تیس برس کا فرق ضرور ہو گا۔ بہت غور کیا، میں سمجھ نہ پایا کہ آخر اس تعلق کی نوعیت کیا ہے۔

ہاؤسنگ اسکیم کے عقبی حصے میں زیادہ ہی گھنا جنگل بن گیا تھا اور آخری حد پر نصب خاردار تار کہیں کہیں سے ٹوٹ گئے تھے، جس کے نتیجے میں جنگلی جانور اندر آجاتے۔ خصوصاً گیدڑ اور سؤر، ریوڑ کی شکل میں آتے۔ حفاظتی باڑ کی مرمت کے مرحلے پر سرمد نے ایسی بات کر دی کہ مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ کہنے لگا: "مجھے جنگلی حیات کی کشش ہی یہاں لے آئی تھی۔ اور تار میں نے خود پلاس سے کاٹے تھے۔ بہتر ہو گا کہ تار فی الحال اگلے حصے میں لگوائیں، جہاں آبادی ہو رہی ہے۔ وہاں سے اسکیم کی چوڑائی بہت کم ہے..... غالباً عقبی حد کا بیسواں حصہ۔ یوں خرچ بھی کم اُٹھے گا۔"

میں نے یہ تجویز ہیڈ آفس کو پہنچا دی۔ چیئرمین اور بورڈ کے ارکان ویسے بھی سرمد کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اِس شخص نے پہل نہ کی ہوتی تو آج بھی منصوبہ وہاں ہی رُکا ہوتا۔ اُنھوں نے اتفاقِ رائے سے اس تجویز کو منظور کیا اور کام شروع کروا دیا۔

ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں سرمد ایک تگڑا سا بکرا لایا کرتا اور ذبح کروا کر کم و بیش نصف گوشت شبیر کے ہاتھوں، مزدوروں مستریوں کو بھجوا دیتا۔ تلاوت خان اور اُس کے دونوں ساتھی سکیورٹی گارڈوں کو بھی حصہ مل جاتا۔ میرے عملے میں چار افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اُن میں سے صرف دو نچلے درجے کے ملازموں اور سوپر کو بن مانگے دیا جاتا۔ جب کہ مجھے، میرے دونوں نائبین، مولوی صاحب اور چند رہائش پذیر گھرانوں کو سرے سے پوچھا ہی نہ جاتا۔ شبیر کی زبانی سرمد کے خیالات معلوم ہوئے۔ کہنے لگا: "صاحب کا خیال ہے کہ خود اکیلے اچھا اچھا کھانے سے جرم کا احساس ہوتا ہے۔ جو بالکل ہی افورڈ نہیں کر سکتے، اُن کو اپنی خوشی اور تسلی کی خاطر کھلانا چاہیے۔"

مجھے معقول تنخواہ کے علاوہ اچھی خاصی پنشن بھی ملتی تھی، پھر بھی خواہش بیدار ہوتی کہ اتنا اچھا گوشت مل جائے تو کیا مضایقہ ہے۔ میں خود کو شرم دلاتا کہ ایسی گھٹیا سوچ زیب نہیں دیتی۔ مجھ سے زیادہ مولوی علی احمد کی ذہنی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اُس کو ایسا ہوکا لگا کہ تقریباً ہر روز ہی نماز کے بعد میرے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرنے لگا اور میں مزہ لیتا۔ مجھے کہتا: "یہ کیسا بے دین شخص ہے۔ ذرا شرم نہیں۔ نماز پڑھتا ہے نہ حق ہمسائیگی کا خیال رکھتا ہے۔ اس کا نام بھی مشکوک ہے۔ اسی طرح کے کسی گمراہ شخص کو حضرت صلاح الدین ایوبیؒ نے قتل کروا دیا تھا......"

میری ہنسی چھوٹ جاتی۔ کئی بار خیال آیا کہ اس کی اصلاح کر دوں اور بتاؤں کہ صلاح الدین ایوبی کبھی ہندوستان آیا ہی نہ تھا۔ اور یہ کہ سرمد کو کس نے گردن زدنی قرار دلوا کر قتل کیا۔ پھر یہ سوچ کر رہ جاتا کہ مولوی کو نہ چھیڑوں۔ اپنی ہی دھن میں لگا رہے۔ نماز کے بعد میرا بھی گپ شپ میں اچھا وقت گزر جاتا ہے۔

تعمیراتی کام میں کچھ تیزی آ گئی اور لیبر میں اضافہ ہو گیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ سرمد نے بکرے کی بجائے دو بہت بھاری مینڈھے منگوا لیے ہیں۔ شبیر نے بتایا کہ گوشت پورا نہیں ہوتا اور بکرا مہنگا بھی ہے۔ بکرے کی قیمت کا تیسرا حصہ اور ڈال کر دو چھترے مل گئے ہیں اور گوشت تقریباً دوگنا نکلے گا۔ مولوی علی احمد کو بڑی دور کی سوجھی۔ میں گزشتہ کئی مہینوں سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ سرمد سے مکالمہ کرنا چاہتا ہے۔ مجھے کئی بار اشتعال دلانے کی کوشش کر دیکھی لیکن میں صرف اس صورتِ حال سے حظ اٹھانے تک محدود رہا۔ اُس نے مجھے اعتماد میں لے کر کہا: "ذرا میرے ساتھ چلیں۔ نیکی کا کام ہے۔ سرمد کو نماز کی تلقین کرتے ہیں۔ ممکن ہے یوں اُس کو اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو جائے...... اور ایک مجبوری بھی ہے۔ میری زوجہ اور والدہ محترمہ کو جوڑوں کے درد ہیں۔ خاص طور پر اس سردی میں تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ دونوں

خواتین کو جاءِ نماز کی بجائے بھیڑ کی کھال استعمال کرنے سے افاقہ ہو گا......"

مجھے گمان گزرا کہ صورتِ حال دلچسپ رُخ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ بعید نہیں کہ سرمد کوئی نرالا فلسفہ پیش کر دے۔ فوراً سنجیدگی اختیار کر لی اور مولوی صاحب کو ہمراہ لے کر سرمد کے ہاں جا پہنچا۔ اُس کے گھر کا وِکٹ گیٹ اکثر کھلا ملا کرتا۔ پورچ کے اگلے حصے میں سہ پہر کی مری مری پیلی دھوپ پڑ رہی تھی۔ کنڈے سے لٹکے پنجرے کی طرف دھیان ہی نہ گیا۔ اچانک کانوں میں بڑی تیز زنانہ سی آواز پڑی: "کون او اوئے! کدھر جا رہے ہو؟؟......"

چونک کر اُوپر دیکھا۔ میں پہلے بھی کئی بار "چاچا" کی گالیاں کھا چکا تھا۔ تفریح لینے کی خاطر اُس کو ڈانٹ کر کہا: "چپ کر بدمعاش!!" بس پھر کیا تھا۔ ایسی گندی گالیاں دیں گویا تو تا نہ ہوا، لوفر لفنگا مرد ہماری ماں بہن ایک کر رہا ہو۔ میری ہنسی چھوٹ گئی لیکن میرے ساتھی کا چہرہ شرم خجالت اور غصے سے لال ہو گیا۔ اتنے میں اندر سے سرمد نکل آیا۔ "ہزایکسی لینسی" نے صرف ایک بار بھوں کی آواز نکالی۔ لیکن سرمد نے اتنا ہی کہا: "تو تو یور ایکسی لینسی!!!" اور وہ چپ ہو گیا۔ جب کہ چاچا ہمیں بے نقط سناتا رہا۔ بلکہ مالک کے ڈانٹنے پر اُس کے ساتھ بھی فوراً اپنا پدری رشتہ جوڑ دیا۔ تھوڑی دیر اُول فول بکا اور خاموش ہو کر گردن نیچے سکوڑ کر بیٹھ رہا۔

دھوپ میں بچھی کرسیوں پر ہم بیٹھ گئے۔ میں نے مولوی صاحب کو تبلیغ کرنے کا موقع ہی نہ دیا اور بات گھما پھرا کر کرنے کی بجائے صاف لفظوں میں اُن کی والدہ اور بیوی کی بیماری اور حکیمی نسخے کا حوالہ دے کر کھالوں کا مطالبہ کر دیا۔ اُسی رو میں پوچھ لیا: میںڈھے نظر نہیں آ رہے، کہاں ہیں اور کب ذبح کرنے کا ارادہ ہے؟"

سرمد نے بغیر لگی لپٹی کے بولنا شروع کر دیا: "کھالیں شبیر لے جاتا ہے۔ اُس سے چھین کے مولوی صاحب کو کس منہ سے دوں؟...... ویسے کسی بھی لمحے میری اپنی

کھال اترنے والی ہے...... وہ بھی اُلٹی۔ مگر میرے خیال میں انسانی کھال حرام ہوتی ہو گی...... ہاں! شاید جُوتے وغیرہ بنانے میں کوئی قباحت نہ ہو...... مولوی صاحب دیکھ لیں۔ میں نے وصیت پہلے ہی کر رکھی ہے، آنکھیں اور دیگر اعضا donate کرنے کی غرض سے۔ اسی وصیت میں اضافہ کر دوں گا کہ کھال مولوی صاحب کی ہوئی...... ویسے معزز خواتین کے لیے جاء نماز کے نیچے روئی کے گدے بچھانے سے زیادہ آرام ملے گا۔ اور پھر یہ دونوں بھیڑیں نہیں بلکہ اُن کے نر ہیں۔ کہیں خواتین کے نیچے ان کی کھال بچھانا معیوب نہ ہو۔"

کوشش بسیار سے بھی میں ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ مولوی صاحب نے لال بھبھوکا ہو کر کہا: "صد افسوس! گھر آئے مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک! آپ جیسے لوگوں سے عالمِ دین کی قدر کرنے کی توقع رکھنا ہی غلط ہے۔ ساتھ آئے معزز شخص کا تو خیال کر لیتے...... ویسے اس لڑکے سے آپ کا تعلق کیا ہے؟؟" سرمد کے چہرے سے بر ہمی کا رتی بھر تاثر نہ ملا۔ اُسی سرسری سے لہجے میں بولا: "شبیر اور میرے تعلق کی نوعیت آپ کے فہم وادراک سے ماورا ہے۔ جو آپ سوچ رہے ہیں وہ میرے مسلک میں ہی نہیں۔ ذہن پر زیادہ زور دے کر پریشان نہ ہوں......"

اتنے میں گھر کے پچھلے صحن سے یکے بعد دیگرے دونوں مینڈھے بڑی بھاری اور بھدی آواز میں بول پڑے۔ مجھے شرارت سوجھ گئی اور ماحول کی کشیدگی کو قدرے زائل کرنے کی غرض سے مولوی صاحب کو مخاطب کر کے کہا: "چلو جی! اب تو کھال والوں نے خود بھی انکار کر دیا ہے۔"

مولوی صاحب نے غالباً سوچ رکھا تھا کہ کھالوں کا عطیہ ملنے کے ساتھ ساتھ باتوں باتوں میں ہر ماہ گوشت حاصل کرنے کی راہ بھی ہموار کر لی جائے گی لیکن معاملہ یکسر اُلٹ گیا۔ میں صحیح طور پر سمجھ نہ پایا کہ مولوی کو اتنی زیادہ مایوسی کیوں ہوئی ہے۔ ممکن

بے تکی بھی محسوس کی ہو۔ راستے میں بولتے گئے: "راہ سے بھٹکا ہوا ایسا شخص جس آبادی میں رہے گا، وہاں اللہ کی رحمت بھی نازل نہیں ہوتی۔ پچھلی بقرعید پر اس شخص نے قربانی دی نہیں اور ویسے ہر مہینے بکرا ذبح کرتا ہے۔ اُلٹی کھوپڑی کا انسان اللہ کا باغی ہے۔ میں چیئرمین سے بات کروں گا کہ اگر خیر اور بھلائی چاہتے ہیں تو اس بندے سے نجات حاصل کرنے کا کوئی راستہ نکالیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح ہاؤسنگ اسکیم پر چھائی نحوست چھٹ جائے گی...... ظلم خدا کا، معصوم پرندے کو مغلظات سکھا رکھی ہیں۔ ایسی بیہودگی ہوتے کبھی نہ دیکھی تھی۔"

توتے کی گالیاں مجھے بُری نہیں لگتی تھیں۔ ایک روز سرمد سے پوچھ لیا تھا کہ ایسی نرالی صلاحیت اس پرندے میں کیسے پیدا ہوگئی۔ کیا بہت زیادہ محنت کرنا پڑی تھی؟ اُس نے بتایا کہ توتا ایک مرحوم دوست کی نشانی ہے۔ ایسا ہم دم کہ زمانے میں اُس کا نعم البدل نہ ملا۔ بیماری لاعلاج قرار دیے جانے پر سارا سارا دن اس سے باتیں کرتا یا میرے انتظار میں رہتا۔ میرے جانے پر ہم تین ہو جایا کرتے تھے۔ میری غیر موجودگی میں اِس واحد ہم نشین سے باتیں کرتا، گالیاں بکتا اور جواب میں گالیاں سن کر خوش ہوتا۔ بستر پر لیٹے ہوئے اس کو سینے پر بٹھائے رکھتا۔ آخری دنوں میں جب موت کی چاپ آس پاس سنائی دینے لگی اور بولنے کی زیادہ سکت نہ رہی، تب بھی توتا سینے پر یا دائیں بائیں جیٹھا رہتا۔ مرنے سے پہلے مجھے اس کا خیال رکھنے کی بار بار تاکید کی تھی۔ مجھے خود بھی بہت عزیز ہے۔ ہز ایکسی لینسی اور چاچا کے سوا میرے پاس اپنا ہے کون؟"

وہ واحد موقع تھا جب سرمد نے میرے ساتھ کوئی دل کی بات کی اور غمگین ہو گیا۔ چند لمحوں بعد بولا: "بے وفائی کے حوالے سے "توتا چشمی" کی مثل غلط گھڑی گئی ہے۔ دوست کی وفات کے بعد کئی دن تک چاچا اُداس رہا تھا۔ چونچ پروں میں چھپا کر چپ چاپ پڑا رہتا تھا۔ ہم دونوں گالی گلوچ کرکے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والے ہم

نفس کی یاد تازہ کر لیتے ہیں۔"

شروع میں رات کو کسی وقت سرمد ہاؤس سے آگے جنگل میں اچانک فائر کی آواز گونج اٹھتی۔ سیکیورٹی کا عملہ اُس کے گھر سے آگے جنگل میں جانے سے انکار کر دیتا۔ جنگلی جانوروں کے علاوہ حشرات الارض کا بھی خوف تھا۔ سرمد نے خود ہی بتا دیا کہ وہ رات کو ہزایکسی لینسی کے ہمراہ گھومنے نکلتا ہے اور جنگلی جانوروں کو بھگانے کے لیے صرف ہوائی فائر کرتا ہے۔ عجیب شخص تھا۔ ہماری سمجھ سے بالاتر۔ ایسی پُرخطر تفریح سے کوئی جنونی ہی لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

سرمد کی دعا قبول نہ ہوئی اور ہاؤسنگ اسکیم ترقی کرنے لگی۔ پچھلے حصے سے جنگل کی کٹائی شروع ہوگئی اور گلیاں سڑکیں پختہ ہونے لگیں۔ حسنِ اتفاق سے سرمد ہاؤس کے اڑوس پڑوس میں کسی الاٹی نے گھر بنانے میں دلچسپی نہ لی لیکن سڑک کے پار بالمقابل تین بڑے پلاٹوں پر تعمیراتی کام کا آغاز ہوگیا۔ آبادی میں اضافہ ہونے پر سرمد نے گزشتہ دو برسوں سے جانور ذبح کرنے کا سلسلہ ترک کر رکھا تھا۔ صرف پکی پکائی دیگ منگوا کر تقسیم کرا دیتا...... مسجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھ گئی۔ مولوی علی احمد کی حیثیت میں استحکام آ گیا لیکن شاید وہ کھالوں سے محرومی والا صدمہ بھولا نہیں تھا۔ موقع ملتے ہی سرمد کو ہدفِ تنقید بنا لیتا۔ مجھے بھی گوشت نہ ملنے پر ہلکا پھلکا رنج ضرور ہوا تھا لیکن سرمد کی شخصیت میں لازماً کوئی ایسی کشش تھی کہ یک طرفہ طور پر ہی تعلق بنا ہے چلا گیا۔ اُس کا رویہ بدستور وہی رہا۔ گرم جوشی نہ سرد مہری۔

ایک مرتبہ بہت پہلے، توتے کے حوالے سے مرحوم دوست کا تذکرہ چھڑنے پر سرمد نے کسی حد تک اپنا دُکھ بیان کر دیا تھا۔ لیکن دوست کا نام تک نہ بتایا اور ذاتی زندگی کے بارے میں بھی کچھ نہ بولا۔ اِن دنوں نہ جانے کیوں کُھلنے لگا اور پتا چل گیا کہ بہت امیر خاندان میں پیدا ہوا۔ باپ نے اِس کے دادا کی مرضی کے خلاف کراچی میں مقیم

انتہائی شمالی علاقے کے ایک گھرانے کی لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ ابھی یہ چار سال کا تھا کہ باپ حادثاتی موت مرگیا۔ دادا نے بہو کو قبول نہ کیا اور اُس کے والدین کو بلا کر بیٹی اُن کے حوالے کردی۔ معقول مالی مدد کے علاوہ ڈھیر ساری دھمکیاں بھی دیں۔ بیوہ نے مجسٹریٹ کے رُوبرُو اپنے بیان حلفی کی توثیق کردی کہ میں مسماۃ...... بغیر کسی بیرونی دباؤ کے بقائمی ہوش وحواس، اپنی رضا ورغبت سے بیٹے کو دادا کے حوالے کررہی ہوں تاکہ اس کی بہتر انداز میں کفالت اور تعلیم وتربیت کی جاسکے اور خود نئے سرے سے گھر بسا کر شرعی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرسکوں۔ مزید برآں آئندہ بھی کبھی بیٹے کی حوالگی کا مطالبہ نہیں کروں گی...... باپ اور بھائی نے بطور گواہان کے دستخط کر رکھے تھے لہٰذا کسی قسم کا قانونی سقم باقی نہ رہا۔

سرمد نے ہر وہ کام کیا جو دادا کو ناپسند تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں گھر سے موٹی رقم چُرا کر ماں کو تلاش کرنے کراچی بھاگ گیا۔ دادا نے گم شدگی کی رپورٹ درج کرادی اور اپنے کارندوں کے ذریعے خود بھی تلاش کرواتا رہا۔ سرمد پانچ چھ مہینے کراچی میں چھپتا پھرا۔ شمالی علاقہ جات کے رہنے والے مختلف لوگوں سے ملتے ملاتے بالآخر ماں کا پتا لگا لیا۔ وہ کسی خاصی بڑی ٹریول ایجنسی میں بطور receptionist ملازمت کررہی تھی۔ دفتر جانے کے لیے کمپنی کی گاڑی میں بیٹھنے لگی تھی۔ جدید تراش کی پتلون پہنے یورپی عورت کے رُوپ میں ماں کو دیکھ کر مایوسی ہوئی لیکن اَن جانی سی خوشی اور کسک بھی محسوس کی۔ گاڑی چلی گئی۔ پیشتر اس کے کہ نانا دروازہ بند کرلیتا، سرمد نے آگے بڑھ کر روک لیا۔ نواسے کے تعارف کرانے پر ایک بار تو بوڑھا شخص بُری طرح بوکھلا گیا۔ لمحہ بھر کو سوچا اور پھر اندر بلا کر دروازہ بند کرلیا۔

پولیس پارٹی کے آنے پر نانا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا: "بچہ! ہم بہت شریف لوگ ہیں۔ تمہارے دادا کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جب سے تم گھر سے بھاگے ہو،

ہم بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اپنے گھر جاؤ، ہمیں معاف کرو۔"

نصابی کتب کے علاوہ سرمد نے جو بھی لغویات کتابی شکل میں دستیاب ہوئیں، پڑھ ڈالیں۔ دادا کا شمار ملک کے بڑے ٹرانسپورٹرز میں ہوتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ پوتا زچ کرنے پر تلا ہوا ہے لیکن ہمت نہ ہاری اور بے دریغ پیسہ خرچ کرتا رہا۔ بوڑھے شخص کی مجبوری یہ بھی کہ واحد زندہ بچ رہنے والا بیٹا خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا، جس سے صرف تین بیٹیاں تھیں اور بیوہ بہو سے ماموں بھانجی کا سگا رشتہ تھا۔ پوتے کو راہِ راست پر لانے کی غرض سے نئی حکمتِ عملی اختیار کی اور فیصلہ کن انداز میں مخاطب ہوا: "تم یہ فضول خیال اپنے دماغ سے نکال دو کہ مجھے توڑ ڈالو گے۔ پورے پنجاب کی سڑکوں پر میری کروڑوں کی لاریاں چل رہی ہیں۔ اللہ نے جتنی دولت اور عزت دی، اس سے بڑا جگر عطا کیا ہے۔ بڑے سے بڑا صدمہ سہنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ بیس سال کے ہو گئے ہو، اب سنبھل جاؤ۔ شریعت کے مطابق یتیم پوتے کا اپنے دادا کی وراثت میں حصہ نہیں بنتا۔ لیکن میں تجھے سب کچھ دینا چاہتا ہوں۔ یہ میرا اختیار ہے۔ تمہاری ماں کے بارے میں میرا فیصلہ درست ثابت ہوا۔ وہ جس طرح کی زندگی گزار رہی ہے، ہم خاندانی لوگ برداشت ہی نہیں کر سکتے......"

نانا کے بقول، وہ شریف لوگ تھے اور دادا خاندانی۔ سرمد ذہنی طور پر اُلجھ گیا کہ وہ خود کون ہے۔ اُس نے ماں کے بیان حلفی میں یہ جملہ بھی پڑھا تھا کہ باقی کی زندگی شریعت کے مطابق گزارنا چاہتی ہے۔ دادا بھی شریعت کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن شنید ہے کہ دشمنی نکالتے ہوئے بندہ قتل کروانے میں ذرا رحم نہیں کھاتے۔ باقی بھی ہر سُو شریعت کا چرچا ہوتے دیکھتا اور سنتا ہوں۔ جب کہ معاشرے کی اصل تصویر اتنی بھیانک ہے کہ جنگل کا قانون نافذ کرنے کی صورت میں بہتری آنے کا گمان گزرے گا۔

نقد رقم کے علاوہ، مرحوم باپ کی پسندیدہ گاڑی شیورلیٹ امپالا لے کر سرمد

نے گھر چھوڑ دیا اور کراچی چلا گیا۔ جُوا کھیلنے میں ایسی مہارت حاصل ہوئی کہ کئی کئی دن جان بوجھ کر ہارتا اور جب جی چاہتا، سب کچھ سمیٹ کر چل دیتا۔ شاطر سے شاطر جواری بھی اِس کو دام میں پھنسانے سے عاجز آ گیا۔ اُلٹی پڑی تاش کو ایک نظر دیکھ کر بتا دیتا کہ چہرے والے پتے ہیں۔ ساتھی حیران ہو جاتے کہ چال چلنے سے پہلے مدِ مقابل کی آنکھوں میں سرسری نظر سے دیکھ کر پڑھ لیتا ہے اور ہاتھ میں آئے اچھے خاصے کارڈز ڈالنے میں ذرا دیر نہیں لگاتا۔ جب کہ خود تین یکے لیے ہوئے بھی پُرسکون بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ بعض اِس کو sharper سمجھتے۔ جب وہ shuffing کرتا تو دیکھنے والے پلک جھپکنا بھول جاتے۔ مگر کبھی پکڑا نہ گیا۔

مخصوص حلقوں میں سرمد اتنا ہر دل عزیز ہو گیا کہ ہارنے والے بھی بدمزہ نہ ہوتے۔ "جُوا کسی کا نہ ہوا" اور "جُوا بڑا بیوپار جو اس میں نہ ہوتی ہار" جیسی کوئی ضرب المثل سرمد پر صادق نہ آئی۔ اونچے طبقے کے مرد و خواتین میں برابر مقبول ہوا۔ بیگمات رَمی کھیلنے کے لیے شوق سے بُلاتیں۔ بے فکرے صاحب لوگ برج کھیلنا پسند کرتے اور عام زندہ دل دولت مندوں کے ساتھ فلاش کی بازی لگا کرتی۔

کراچی میں طویل قیام کے عرصے میں ماں سے اُس کے دفتر میں کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ اب ایگزیکٹو پوسٹ پر کام کر رہی تھی۔ پہلی ملاقات پر جب وہ بیٹے کو باہر رخصت کرنے آئی تو شیورلیٹ امپالا دیکھ کر رو پڑی اور ایک بار پھر سینے سے لگا لیا۔ دیوانہ وار چُومتے ہوئے بولی: "یہ گاڑی کبھی نہ بیچنا۔ خواہ نئی کتنی ہی قیمتی گاڑیاں کیوں نہ خرید لو...... تمہارا مرحوم باپ اسی گاڑی میں تھا، جب ٹکٹ لینے آیا اور میری اُس سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کی اس گاڑی کے ساتھ بڑی یادیں وابستہ ہیں۔" اس نے وعدہ کر لیا۔ کسی ملاقات میں ماں سے یہ سوال کرنے کا خیال بھی نہ آیا کہ اُس نے بیانِ حلفی کی تحریر پر عمل کرتے ہوئے شریعت کے مطابق زندگی بسر کیوں نہیں کی۔ وہ خود بھٹکا

ہوا تھا اور شرعی تقاضوں کو پس پشت ڈال کر شب و روز گزارتا رہا۔ رَمی صرف اسی مقصد کے لیے کھیلتا کہ دُہرا فائدہ ہو جاتا۔ ''آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔'' اونچے طبقے کی چند بیگمات کو رَمی کھیلنے کی ایسی بُری لت پڑی کہ دس پندرہ دن کا وقفہ آ جانے سے، سرمد کو بولائی ہوئی ڈھونڈتی پھرتیں۔ بہلا پھسلا اور چکار پچکار کر لے جاتیں۔

اس عرصہ میں دادا نے دو مرتبہ کراچی آ کر ملاقات کی۔ سرمد نے دیکھا کہ اس کا دادا واقعی بڑے مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ بوڑھا ہو کر بھی کمزور نہیں پڑا اور اصل عُمر سے کم و بیش پندرہ سال چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ بڑے صدمے سہہ کر بھی سینہ تان کے رکھتا ہے۔ پوتے کو واپس چل کر کاروبار سنبھالنے کی پیش کش کی۔ اس کے سینے میں پھانس گھسی ہوئی تھی۔ ماں کے حوالے سے دادا نے جو طعنہ دیا تھا، وہ اس کے نزدیک گالی تھی۔ بے رُخی برتی نہ پیش کش قبول کی۔

دوسری ملاقات میں دادا نے کہا: ''تم جس طرح کی واہیات زندگی جی رہے ہو، یہ ماں کے دودھ کا اثر ہے۔ آخری بار لینے آیا ہوں۔ ورنہ عُمر بھر پچھتاؤ گے......''

ایک اور پھانس دل میں گہری اُتر گئی۔ کہنے لگا: ''دادا جی! آج آپ نے پھر مجھے ماں کی گالی دی ہے۔ وہ ایسی نہیں، جیسی آپ سمجھتے ہیں۔ کراچی میں پیدا ہوئی اور یہیں تعلیم پائی۔ یہاں کی معاشرت مختلف ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر باپردہ عورت پاک دامن بھی ہو۔ اسی طرح ہر ماڈرن عورت بدچلن نہیں ہوتی۔ میری ماں بیوہ اور بے سہارہ ہو کر کیا کرتی؟ اُسی کمپنی میں دوبارہ ملازمت کر لی، جہاں سے چھوڑ کر گئی تھی۔ آپ میرے لیے فکرمند نہ ہوں، میں کبھی نہیں پچھتاؤں گا......''

دادا نے پھنکارتے ہوئے بے دھڑک الف ننگی گالی دے ڈالی اور اُٹھ کر چل دیا۔ سرمد کے دماغ میں بغاوت کا لاوا پھٹ پڑا اور ہر نوع کے ضابطۂ اخلاق سے اعتبار اُٹھ گیا۔

دس پندرہ روز تک سرمد گھر میں بند پڑا رہا۔ برج اور فلاش کے ساتھی پکارتے رہے لیکن ناسازئ طبع کا بہانہ گھڑ لیا۔ البتہ دل بہلانے کو چند ایک بار صرف رَمی کھیلی۔ ماں سے ملنے چلا گیا۔ اُس نے دفتر سے چھٹی کر لی۔ دونوں سمندر کے کنارے گھومتے رہے۔ اکٹھے کھانا کھایا اور فلم دیکھی۔ جدا ہوتے ہوئے چابی دے کر بولا: ''آپ گاڑی رکھ لیں۔ میں کراچی چھوڑ رہا ہوں۔''

وہ بیٹے سے لپٹ کر زاروقطار روئی اور بولی: ''نہیں، میں چاہتی ہوں، تم ہی اسے چلاؤ اور زندگی بھر اپنے پاس رکھو۔ رابطہ ضرور رکھنا۔ جب وقت ملے، ملنے آجایا کرنا۔ اسی طرح اپنے نانا سے چوری۔ وہ تمہارے خاندان سے بہت خوفزدہ ہیں۔''

مولوی علی احمد کو عجیب فکر کھائے جا رہی تھی۔ اکثر سوال کرتا کہ سرمد نام کا بندہ اصل میں ہے کون؟ اس کا مذہب کیا ہے؟ مسجد میں کبھی بھول کر بھی نہیں آیا۔ ہر مہینے کئی دن کہیں باہر گزارتا ہے۔ کمائی کا ذریعہ بھی کسی کو معلوم نہیں۔ لڑکے شبیر پر بڑا مہربان ہے۔ اگر مسلمان والدین کی اولاد ہے تو کم از کم جمعہ ہی پڑھ لیا کرے۔ تا کہ جنازہ حلال ہو جائے۔

معاشرے میں پروان چڑھتی انتہاپسندی اور عدم برداشت کے رجحان نے عام شریف اور امن پسند شہریوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ زیادہ تر لوگ شہر کے پرانے محلوں سے اسی لیے نئی کالونیوں کا رُخ کر رہے تھے کہ سکھ چین سے رہ سکیں۔ یہاں ہمارے ہاں کے بھی سبھی رہائشی کچھ اسی مزاج کے تھے کہ اپنے کام سے کام رکھتے اور بلاوجہ کی عیب جُوئی اور تفرقہ بازی کی باتوں پر کان نہ دھرتے۔ چند ایک نے صاف لفظوں میں مجھے اور مولوی صاحب سے کہہ دیا کہ بھائی چارے کی فضا کو قائم رکھا جائے۔ کسی نے سوسائٹی کے اعلیٰ حکام سے شکایت کر دی اور مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ میری خواہ مخواہ سرزنش ہوئی۔ تحریری طور پر سخت ہدایات موصول ہوئیں کہ کسی بھی رہائشی کے ذاتی

معاملات پر گفتگو نہ کی جائے اور کالونی کا ماحول خوشگوار بنانے کی غرض سے معزز رہائشیوں کی مشاورت سے عملی اقدامات کیے جائیں۔

مجھے فکر لاحق ہوئی کہ میری کارکردگی غیر تسلی بخش ہونے کی صورت میں اچھی بھلی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑ سکتے ہیں، جس کے ہولناک نتائج برآمد ہوں گے۔ چونکہ یہ رہائش چھن جائے گی اور گھر جانے کی صورت میں بیوی اور اُس کی جوان اولاد کی نفرت بھری نظروں کا نشانہ بننا پڑے گا۔ مجھے چونکہ میرے اللہ نے صرف پیسہ بنانے کی مشین کا کردار سونپ رکھا ہے، لہٰذا دل میں ملال لائے بغیر یہ فریضہ نبھاتا چلا جاؤں، تاوقتیکہ وہ مالک مجھے اپنا پیارا جان کر پاس بُلا لے۔ دوہری کمائی کرنے کے کئی کئی فائدے ہیں۔ سب سے بڑا یہ کہ عتاب سے محفوظ و مامون بڑے مزے سے یہاں رہ رہا ہوں۔ دوسرا بڑا فریب تاثر کہ گھر والے بڑے خوش ہیں۔ گاہے بگاہے فون کر کے مجھے اپنی صحت کا خیال رکھنے کی بار بار تاکید کرتے ہیں۔ گویا میں تندرست رہوں اور اُن کی نظروں سے دُور، مشین ٹھکا ٹھک چلتی رہے۔ زیرک بیوی اسی لیے باقاعدگی سے دیسی گھی بھیج دیتی ہے کہ اچھے موبل آئیل کے بغیر کل پُرزے رگڑ کھانے سے جلد گھس کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔

اِن سردیوں میں بیوی نے وہی پنجیری بنا کر مجھے بھیجی جو میری اَماں اُس کو بیٹا پیدا کرنے پر پورا دیگچہ بھر بنا کے کھلا دیا کرتیں اور بیٹی پیدا ہونے کی صورت میں سر ماتھا باندھ کر ہائے ہائے پکارتی لیٹ جایا کرتیں۔ پنجیری بنانا یکسر بھول جاتیں اور ناقابلِ فہم بیماری کی وضاحت کرنا بھی ضروری نہ سمجھتیں۔ دو تین دن بعد ہی زخم خوردہ آواز میں بہو سے کہتیں: ''چل اُٹھ کوے! ہمت کر اور گھر سنبھال۔''

پنجیری کھاتے ہوئے مجھے بڑا مزہ آیا اور خوشی ہوئی کہ اِس میں خشک میوہ جات، خصوصاً بادام کی مقدار کم و بیش اُتنی ہے، جتنی کہ بیٹوں کی زچگی کے مواقع پر وہ خود

ساس کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی پنجیری میں کھایا کرتی تھی۔ باقی کے تمام اجزا کا تناسب درست ہونے پر پنجیری کا ذائقہ بھی خوب رہا۔ مجھے کبھی کبھی لذت کام ودہن سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہی محبت محسوس ہونے لگتی جو شادی سے پہلے اور کچھ عرصہ بعد تک بیوی کے ناز وانداز سے جھلکا کرتی تھی۔ تاہم میں جلد ہی اس خود فریبی سے نکل آتا اور پس پردہ اس حقیقت کو صحیح تناظر میں سمجھ لیتا کہ ہوشیار اور مستعد کاریگر اپنی مشین کی مناسب آئیلنگ گریسنگ اور اوور ہالنگ سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔

سرمد کے ساتھ میرا دل کا معاملہ بنتا جارہا تھا اور مولوی سے دوستی تھی۔ میں نے اُس کو سامنے بٹھا کر کہا: "یار مولوی! ہم دونوں اب بے تکلف دوست ہیں۔ مسئلہ بڑا سنجیدہ اور غور طلب ہے۔ تیرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کہیں بھی اس سے بہتر کسی علاقے کی مسجد میں امامت کے منصب پر فائز ہو جاؤ گے۔ اِس عمر میں مجھے کہیں نوکری ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... اور میں فارغ ہو کر گھر چلا گیا تو میری مٹی پلید ہو جائے گی۔ سوسائٹی کے کرتا دھرتا، سرمد کو اتنی اہمیت دیتے ہیں، جیسے یہ اُن کا پیر ومرشد ہو۔ میں اور تم پیری مریدی کو نہیں مانتے لیکن اس اصول کی افادیت کو تسلیم کرتے ہیں کہ مطلب کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ میں اور شیخ قاسم نے ایک ساتھ سرکاری ملازمت شروع کی۔ وہ اکیسویں گریڈ میں ریٹائر ہوا اور میں روپیٹ کے آخری دنوں میں اٹھارویں تک پہنچا۔ جب تبلیغی جماعت کا سرگرم رُکن ہمارا ہیڈ بن کر آیا تو قاسم نے فوراً رُوپ بدل لیا۔ سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح۔ جماعت کھڑی ہوتے ہی دوڑ کر باس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کے کھڑا ہو جاتا۔ شام کو آفیسرز کالونی اور ان کے سرونٹ کوارٹرز میں تبلیغ کی غرض سے شانہ بہ شانہ چل پڑتا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تبلیغی سرگرمیوں کی تفصیل بتانے لگا کہ اُن گھروں کی اطلاعی گھنٹی بجا کر میں خود آگے بڑھ کے کھڑا ہو جاتا، جن کے بارے میں معلوم تھا کہ خاتونِ خانہ

خوبصورت ہے اور صاحب خانہ سُستی کا مارا ہوا۔ بیگم کے آ جانے پر میں بدستور ہاتھ باندھے اور نظریں جھکائے شرافت کا مجسمہ بنا رہتا لیکن میری مخاطب تاڑ جاتی کہ اس خاکسار کی آنکھیں کس زاویے سے اُس کے آر پار ہو رہی ہیں......"

مولوی علی احمد ہنسنے لگ گیا اور توبہ استغفار کا کلمہ پڑھ کر بولا: "اب اصل موضوع کی طرف آئیں۔" میں نے کہا: "آ رہا ہوں۔ بات پوری کرلوں...... ادارے کا سربراہ بدل گیا اور اُس کی جگہ بڑے رنگین مزاج شخص نے چارج سنبھال لیا۔ قاسم اپنی اصلیت کی طرف لوٹ آیا۔ ہفتہ وار چھٹی کی پہلی رات کو بوتل لے کر صاحب کے پاس پہنچ جاتا۔ مہینے میں ایک آدھ بار گانے بجانے کا اہتمام بھی ضرور ہوتا...... صرف گانے کا نہیں، میرا مطلب سمجھ رہے ہو ناں!...... مولوی صاحب! یعنی گانا اور بجانا......"

اس مرتبہ ہم دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ مولوی نے بآوازِ بلند "استغفر اللہ" کہا اور بولا: "اتنی لمبی تمہید نہ باندھیں۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ سے زیادہ مجھے فکر لگ گئی ہے۔ یہاں اتنی محنت کی۔ یاد کریں...... آپ اور تلاوت خان، دو مقتدی ہوتے تھے اور میں پیش امام۔ اللہ اکبر۔ اب اچھا وقت آیا ہے۔ میں کوئی پاگل تو نہیں۔ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ یہاں سے چھوڑ کر جاتے ہی کوئی مسجد سنبھال لوں گا۔ یوں ہی خالی پڑی نہیں مل جایا کرتیں۔ امامت کے جھگڑوں پر سر پھٹول ہو جاتی ہے۔ بلکہ کئی جگہوں پر جانیں ضائع ہو گئیں۔ سرکاری کالونیوں اور ہاؤسنگ سکیموں میں پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں۔ اتنے سکھ آرام والی مسجد کون چھوڑتا ہے۔ میں ابھی جاؤں تو پتا چلے کہ مغرب تک میری جگہ لینے کوئی اور پہنچ بھی گیا ہے۔ آپ ہر طرح کی تسلی رکھیں۔ سرمد صاحب جانیں اور اُن کا اللہ، میری طرف سے آئندہ شکایت نہیں آئے گی۔"

اتوار کا دن تھا۔ صبح صبح کیمونٹی میں پہلی موت ہو گئی۔ پانچ مرلے کے ایک تہائی پلاٹ آباد ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک رہائشی کے ضعیف والد نے سحری کو

ہسپتال میں دم توڑا اور فجر کے وقت ایمبولینس میں میت آ گئی۔ ظہر کی نماز کے فوراً بعد نماز جنازہ ادا کرنے کا اعلان ہو گیا۔ مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ بے انتہا خوشی بھی ہوئی کہ فوتگی والے گھر کے باہر پڑوسیوں کے ساتھ سرمد بھی کھڑا ہے۔ اُس نے نماز جنازہ ادا کی اور شبیر کے ذریعے سوزوکی وین پر پکی پکائی دیگ منگوا کر ماتم والے گھر پہنچانے خود ساتھ گیا۔ میرے نزدیک یہ ایک خوشگوار انقلابی تبدیلی تھی۔ دل گواہی دیا کرتا کہ سرمد اپنی اصلیت میں ایسا ہے نہیں جیسا خود کو ظاہر کرتا ہے۔ میرا یہ گمان ہے کہ کسی بھی انسان کی شخصیت ایسے ہی پُرکشش نہیں ہوا کرتی۔

چاچا بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر قدرے نحیف اور بیزاری آواز میں بولا: ''کون اوا اوئے!'' وہ سرمد کی کرسی کے بازو پر بیٹھا ہوا تھا۔ سرمد نے سہلا کر پچکارا اور کہا: ''چاچا جی! مہمان آئے ہیں۔'' اُس نے مہمل سی آواز نکالی اور پنجوں پر بیٹھ کر سینے کے اُبھرے ہوئے پروں میں چونچ دبالی۔ میں نے براہِ راست بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے کہا: ''ہماری ہاؤسنگ میں پہلی قبر بھی بن گئی۔ اِس سے پہلے جن چند رہائشیوں کے عزیزوں کی ہسپتال میں اموات ہوئیں، وہ میتیں وہاں سے سیدھی اپنے آبائی علاقوں میں لے گئے۔ آپ نے ایک طرح سے محلے داری کا حق ادا کیا ہے۔ بڑا اچھا لگا۔ سب تعریف کر رہے ہیں۔ بندہ بھی بے چارہ سفید پوش ہے۔ باپ کی لمبی بیماری نے زیرِ بار کر دیا۔

سرمد نے کہا: ''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، جس پر لوگ معترف ہوں......'' وہ ہنس پڑا اور میں نے دیکھا کہ اُس کے وجیہ چہرے پر عجیب سی شرارت آمیز خوشی کی لہر آ کر چند ساعتوں کے مختصر دورانیے میں معدوم ہوتی چلی گئی ہے۔ کہنے لگا: ''اس gesture کے پیچھے بھی دراصل میری اپنی غرض پوشیدہ ہے۔ وہ میں پھر کسی وقت بتاؤں گا۔ ویسے مولوی صاحب کو کھالیں نہ دے کر بعد میں مجھے افسوس ہوا تھا۔ لیکن وہ اور

آپ نہیں جانتے کہ میں نے ناجائز ذریعے سے کمائی ہوئی رقم بچت کی سکیموں میں لگا رکھی ہے، جن پر سُود لیتا ہوں۔ یعنی حرام جمع حرام...... مذہبی قانون کی رُو سے۔ مجھے ذاتی طور پر اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ البتہ آپ جیسے صوم وصلوٰۃ کے پابند باعمل مسلمان کو کھلانا اخلاقاً غلط سمجھتا ہوں......"

مجھے شرارت سوجھ گئی۔ سنجیدہ ہو کر سرمد کو ٹوک دیا: "ہمیں بھلا کیا پڑی تھی کہ آپ کے ذرائع آمدن پوچھتے پھرتے۔ اتنا اچھا بکرے کا گوشت، بندہ بھون بھان کے منہ دھیان کھا لیتا ہے......" سرمد کو میں نے پہلی بار ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا تو بڑا اچھا لگا۔ کہنے لگا: "غریبوں کو کھلاتے ہوئے کبھی پرواہ نہیں کی۔ اس لیے کہ مجبوری میں حرام کھانے کی اجازت ہے۔ اب آپ لوگوں کو بھی کھلا دیا کروں گا۔ دادا جی نے اپنی زندگی میں ہی ٹرانسپورٹ بزنس ڈسپوز آف کر دیا تھا۔ عمر بہت زیادہ ہو گئی تھی اور پھر بیماری...... مگر دبدبہ وہی رہا۔ جب بھی عیادت کے لیے گیا، مجھ سے کلام نہیں کیا۔ اُن کی وفات کے بعد میری سوچ میں بڑی تبدیلی آئی۔ بڑے سے بڑے دانا انسان سے بھی غلط فیصلے ہو سکتے ہیں۔ لیکن انسانی رشتوں پر بلاوجہ اعتبار نہیں گنوانا چاہیے۔ اِن رشتوں کے پسِ پردہ حقیقی اور بے لوث محبت کے جذبے بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ زبانی یہی کہتے رہے کہ میں نافرمان ہوں...... جواری اور جرائم پیشہ، اس لیے وراثت سے کچھ نہیں ملے گا۔ میں ہر بار کہتا: دادا جی! مجھے ایک روپیہ بھی نہیں چاہیے۔ اُن سے ایک ہی گلہ تھا کہ میری ماں کو قبول نہ کیا، ناانصافی کی اور دشنام طرازی کرتے ہوئے مجھ پر ذرا رحم نہ کھایا۔ لیکن اتنے سخت گیر دادا کے اصل جذبات کیا تھے؟ وہ مجھے کچھ ہی عرصہ پہلے پتا چلا۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ڈال گئے کہ لاکھوں کا میرا ذاتی حرام مال اس میں مل کر بالکل ہی dilute ہو چکا ہوگا۔"

میں نے اپنے اوپر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا: "پھر دیر کس بات

کی؟ کب بکرے ذبح کر کے ہمارے حصے کا غبن شدہ گوشت کھلا رہے ہیں؟ بکرعید بھی نزدیک ہے۔ میرا خیال ہے، اس مرتبہ گھر بھی نہ جاؤں......" اُس نے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا: "نہ جائیں...... میں خود چند دنوں کے لیے کہیں جا رہا ہوں۔ واپس آ کر تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ شبیر کو کل نئی بائیک خرید کر دینی ہے۔ میری ذاتی غرض ہے۔ کوئی احسان نہیں۔ کہہ رہا تھا، اُس کے گاؤں تک وقت اور کرایہ بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے......"

بڑی عید قریب آنے پر تعمیراتی کام بند ہو گئے۔ لیبر اور کچھ رہائشی بھی آبائی علاقوں کو چلے گئے۔ میرا گھر جانے کو جی نہ مانا۔ بیوی نے فون پر اپنائیت کا اظہار کرنے کی بڑی بھونڈی کوشش کی اور دعویٰ جتاتے ہوئے بولی: "دو تین دن کے لیے ہی آ جاؤ، ہم تمہیں کھا نہیں جائیں گے......" میں نے کہا: "دو بکروں کی قربانی دے کر بھی مجھے کھانے کی حاجت رہ جائے گی؟...... بیگم صاحبہ! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ دراصل بوڑھا ہو گیا ہوں اور طبیعت بھی ملول ہے۔ ویسے بھی بڑے صاحب کی خواہش تھی کہ عید کی چھٹیوں میں نہ جاؤں۔ فراغت کے دنوں میں لوگوں کو پلاٹ دیکھنے کا موقع ملتا ہے، لہٰذا سائیٹ منیجر کا خود موجود ہونا بہتر ہو گا......" وہ برہم ہو کر بولی: "اچھا، نہ آؤ۔ بیٹھو وہاں پلاٹ بیچو۔ بڑا صاحب تجھے سونے کا تمغہ دے گا...... تمہارا پہلے کب بھی دل لگا ہے گھر میں۔ یہ میں ہی ہوں، جس نے نباہ کر لیا......"

بیگم نے ٹھک سے فون بند کیا اور میں نے مسکرا کر سکھ کا سانس لیا۔ سرمد کی قدرے طویل غیر حاضری سے میں اُداس ہو گیا۔ اُس کی غیر موجودگی میں شبیر اپنی والدہ اور بہن کو لے آیا تھا۔ ماں بیٹی بڑی محنت سے گھر کی صفائی ستھرائی کرتی رہیں۔ صبح صبح منہ اندھیرے اور دفتر سے چھٹی کے بعد شبیر بڑی باقاعدگی سے دیر تک ایکسی لینسی کو گھمایا پھرایا کرتا۔ صرف سینٹری کا عملہ ڈیوٹی پر رہا اور تقریباً نصف سیکورٹی اسٹاف چھٹی پر چلا

گیا۔ دفتری عملے میں سے ماسوائے ایک اسسٹنٹ اور دو درجہ چہارم کے ملازمین، باقی سب عید منانے گھروں کو چلے گئے۔

عید سے دو دن پہلے سرمد اپنی والدہ کے ہمراہ پہنچ گیا۔ ایسی خوبصورت اور باوقار عمر رسیدہ عورت شاید ہی پہلے کبھی میری نظروں سے گزری ہو۔ اُس کے جدید لباس، آن بان اور رکھ رکھاؤ سے گمان گزرتا کہ کسی چھوٹی موٹی مغربی ریاست کی سبکدوش ملکہ ہے۔ میرے دل نے کہا؛ سرمد کے دادا کے تحفظات اپنی جگہ، لیکن پنجاب کا نوجوان رئیس زادہ، نگاہیں ملتے ہی دل ہار دینے میں حق بجانب تھا۔ اُس کے حُسنِ انتخاب کی داد نہ دینا بخیلی ہو گی۔ ماں بیٹا ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلتے تو انھیں دیکھتے رہنے کو جی چاہتا۔ بزا ایکسی لینسی اُن کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ اللہ نے توبہ کا دروازہ کبھی بند نہیں کیا لیکن معاف کر دینے والی صفت اپنے بندوں کو وافر عطا کیوں نہ کی۔ ایسے حسین و جمیل انسان سے اگر کوئی خطا سرزد ہوئی بھی ہو تو اہلِ دل کو صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنے عالی ظرف ہونے کی گواہی دینی چاہیے۔

نمازِ عید اپنی مسجد میں ہی پڑھانے سے متعلق چیدہ چیدہ رہائشیوں کی مشاورت سے وقت طے ہونے کے بعد محفل برخواست ہو گئی۔ میں اور مولوی اکیلے رہ گئے۔ اُس کی آنکھوں سے تشویش اور حیرت کی ملی جلی کیفیت چھلک رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ کچھ کہنے کو بے تاب ہے۔ میں نے بھنویں اُچکائیں اور سر کو ہلکی سی جنبش دے کر کہا:
"میرے یار مولوی کو اپھارہ مار ڈالے گا۔ جلدی سے کہہ ڈالو اور مہلک حملے سے بچو......"

وہ کھل کے ہنسا اور اگلے ہی لمحے سنجیدہ ہو کر بول پڑا: "بالکل ہی اصلی فرنگی عورت۔ سڑک پر جھک کے کتے سے پیار کرنے لگ گئی!!!...... اور نجس جانور نے منہ چوم لیا۔ لاحول ولا...... ماں بیٹا دونوں ہنسنے لگے۔ حد ہو گئی بھئی!...... ایک اور ڈراما شروع ہو گیا۔ شبیر اپنی جوان حسین بہن کو لے آیا ہے۔ آپ یہاں کے منتظم ہیں۔ احمق

لڑکے کو سمجھائیں کہ ماں کو رہنے دے لیکن اُس جوان لڑکی کو گھر چھوڑ آئے۔ شرفا کی لوکیلٹی کا ماحول خراب ہونے سے بچائیں۔"

میری رگِ ظرافت پھڑکنے لگی۔ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا: "میرے یار مولوی علی احمد! عورتوں کو اتنی گہری نظر سے دیکھ کر اُن کے اندر تک نہ جھانکا کرو۔ میرا دھیان اس طرف نہیں گیا...... اور شبیر کی والدہ بھی ابھی جوان ہی ہو گی۔ تم زمانے بھر کے غم نہ پالو میرے یار! بیمار ہو جاؤ گے۔ لوگوں کے گھروں میں جھانکنا ہمارا کام نہیں اور نہ ان کے باہمی تعلقات کی حقیقت کو پرکھنا ہمارا اختیار ہے...... باقی یہ کہ فرنگی عورت نے اپنے مفاد میں منہ دھولیا ہو گا۔ کتا اُن کا، منہ اُن کا اپنا۔ ہمیں پاگل کتے نے نہیں کاٹا کہ خواہ مخواہ پنگا لیں......"

ذرا توقف کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور بول پڑا: "مولوی ہو۔ اپنے اعلیٰ سماجی مذہبی مرتبے کا خیال رکھو۔ صنفِ نازک کی طرف زیادہ توجہ نہ دیا کرو......" اُس کے بھینچے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ منہ کھول کے ہنس دیا اور کہنے لگا: "مولوی بھی انسان ہوتا ہے اور پھر مرد......" میں نے جھٹ لقمہ دے ڈالا: "بلکہ کچھ زیادہ ہی مرد...... بڑا دبنگ، تیر تفنگ جبر جنگ......"

سرمد نے شبیر کے ساتھ نہ صرف عید کی نماز ادا کی بلکہ اس سے پہلے بڑے انہماک سے مولوی کی تقریر دلپذیر بھی سنی۔ قربانی کے فضائل بیان کیے گئے۔ گوشت کی تقسیم کے مستحسن اصول بتائے۔ ترنگ میں آ کر بول دیا: مساکین واقربا کو حصہ نہ دیں اور سارا ہی خود کھا جائیں، تب بھی اللہ سبحانہٗ قربانی قبول فرمالے گا، اس لیے کہ خون بہاتے ہی قربانی ہو جاتی ہے...... سرمد پر بار بار نظر ٹھہر جاتی۔ طبع رواں ہوتی گئی۔ قربانی کے جانور کی کھال عطیہ کرنے کے حوالے سے تقریر بڑی لمبی تاہم دلچسپ ہو گئی۔ خوش گوار لہجے میں کہا: آخری بات...... قصائی یا کسی خادم ملازم کو کھال معاوضے میں دینے

سے قربانی ضائع ہو جاتی ہے۔ ویسے اگر مولوی سے مخاصمت نہ ہو، خصوصاً ایسا مولوی، جو حلال کی تنخواہ پر گزارہ کرے، آپ کے بچوں کو دینی تعلیم دیتا ہو، تو اُس کو کھال عطیہ کرنے کا زیادہ ثواب ہوگا...... سرمد پر ایک نگاہ ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا: بشرطیکہ کھال حلال جانور کی ہو...... میں اُن مولویوں کی بات نہیں کر رہا جو بڑے بڑے ادارے چلا رہے ہیں، لینڈ کروزروں کے مالک، جن کے پیچھے ڈبل کیبنوں میں کلاشن کوف بردار محافظ سفر کرتے ہیں۔ اُن کی بجائے ہم جیسے سفید پوش مولویوں کا خیال رکھا کریں......''

عید کے اگلے روز سرمد نے بلا لیا۔ اُس کے گھر بہت سے گھروں کے بچے جمع تھے۔ اونٹ کو ذبح کرنے کی غرض سے آٹھ بندوں کی ٹیم تیاری کر رہی تھی۔ دھان پان سی نازک کول بوڑھی خاتون نے خاص طور پر بچوں کی تواضع مٹھائی سے کی۔ خوش دلی سے پیش آئی۔ بیٹے سے بھی زیادہ سچی کھری اور بے ریا ثابت ہوئی۔ دل کش آنکھوں میں ہلکی نمی تیر گئی۔ کہنے لگی: ''ہمارے فادر پارٹیشن سے بہت پہلے کراچی میں آباد ہو گئے تھے۔ تمام زندگی ایک ایرانی کیفے کے منیجر رہے۔ اپنی کمائی سے ذاتی گھر بھی نہ بنا سکے۔ ہم نے کبھی بکرے کی قربانی بھی نہیں کی۔ صرف اپنے ہز ہنڈ کے گھر میں چاروں عیدوں پر بکرے اور بیل ذبح ہوتے دیکھے تھے۔ ہمیں بہت شوق تھا۔ بیٹے سے بکرا دنبہ لانے کو کہا، یہ ہمارے نام پر اونٹ قربان کرنے کے لیے لے آیا۔ اللہ کا بہت شکر ہے......''

خاتون اُٹھ گئیں۔ شبیر ہی قصائیوں کے ساتھ معاونت کر رہا تھا۔ اُس کی والدہ اور بہن کچن میں مصروف تھیں۔ ہم دونوں چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میں نے سرمد کو اتنا شاندار جانور لانے کی مبارک باد دی۔ وہ بغیر لگی لپٹی کے بولنے لگا: ''قربانی کے فلسفے کو میں نے کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ہو سکتا ہے، اس کی وہی فضیلت ہو، جو مذہب میں بیان کی جاتی ہے۔ آخرت میں اس کے اجر کا بھی نہیں سوچا۔ مجھے اسی زندگی میں اس عمل کی اتنی خوشی مل گئی ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔

میری ماں بہت خوش ہیں، مجھے اور کیا چاہیے۔ دنیا میں ہی بے پناہ فائدہ اٹھالیا اور وہ بھی نقد، اُسی وقت...... آپ سوچ نہیں سکتے کہ میری والدہ محترمہ کتنی عظیم ہیں۔ انھوں نے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں۔ باپ کی زندگی میں اُن کی حکم عدولی نہیں کی۔ مرحوم کچھ زیادہ ہی شریف اور نرم مزاج انسان تھے۔ میرے دادا کی وفات کے بعد بھی ہمارے خاندان سے خائف رہے اور بیٹی کو ہم سے دور رہنے کی بار بار تاکید کرتے رہتے تھے۔ ہم ماں بیٹا اُن سے چوری چوری ملا کرتے تھے۔ میری اماں اپنے باپ اور بیٹے کی محبت میں پس کر رہ گئیں لیکن کبھی اُف نہ کہا۔ میری نانی کی وفات کے بعد نانا زیادہ حساس اور وہمی ہو گئے تھے......"

گفتگو کا سلسلہ طویل ہوتا گیا۔ پُرتکلف کھانا آنے سے گھر کے ساتھ وابستہ بڑی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ شبیر کی بہن کو میں نے قریب سے دیکھا۔ چادر میں لپٹی سمٹی ہوئی بھرپور جوان لڑکی نے میرا دھیان مولوی علی احمد کی طرف لوٹا دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے زیرِلب مسکرا کر سرمد کو دیکھا اور کہا: "اب تو آپ مسجد بھی جانے لگ گئے ہیں۔ آج مولوی کو بھی بلا لیا ہوتا...... چاچا سامنے نہیں آیا، کہاں ہے؟"

سرمد نے ہنس کر کہا: "زیادہ لوگ آ جانے سے چاچا آپے سے باہر ہونے لگ گیا تو اماں اُس کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئیں۔ وہ اس سے بہت پیار کرنے لگی ہیں۔ اور مولوی صاحب کو بلایا نہیں لیکن شبیر سے کہا ہے کہ سب سے پہلے اُن کے ہاں گوشت دے کر آئے اور ساتھ ہی کھال بھی......"

ہم دونوں ہنسنے لگ گئے اور کھانے میں تعطل آ گیا۔ سرمد کہنے لگا: "پہلے طعام پھر کلام۔ فارغ ہو لیں، پھر بتاتا ہوں کہ مسجد جانے کا اصل مقصد کیا ہے۔" باہر سے ٹوکا چلنے کی پے در پے آوازیں سنائی دینے سے میں سمجھ گیا کہ کم از کم تین بندے گوشت بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔

لڑکی برتن اٹھا کر لے گئی۔میں نے سرمد کو استفسار طلب نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بولنے لگا: ''آپ کو پہلی ملاقات کا دن یاد ہوگا۔میں نے قبرستان دیکھنے کی بات کی تھی......دراصل میں دادا جان کی سخت گیری سے تنگ آیا ہوا تھا۔انسانی رشتوں کے حوالے سے بُری طرح کنفیوزڈ تھا۔یہی سوچا کرتا کہ میری اماں صرف مجھے بہلانے کے لیے ہر ملاقات پر آنسو بہاتی ہیں۔اگر مجھ سے محبت ہوتی تو ساتھ کیوں نہ چل دیتیں...... اور سچی بات ہے کہ میں دادا جی کو سخت صدمہ پہنچانے کا سوچ رہا تھا۔دل سے طے کرلیا کہ یہاں جنگل میں گھر بناؤں، کچھ عرصہ صرف اپنے ساتھ رہوں اور پھر خودکشی کرلوں۔یعنی یہاں قبر بھی پہلے میری ہی بنے......''

ایسی غیر متوقع بات سن کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور اُس کو ایک ٹک دیکھے گیا۔وہ بولے جا رہا تھا: ''حالات نے ثابت کیا کہ میں غلطی پر ہوں۔سارے رشتے کچے نہیں ہوتے۔دادا جی کی مجھ سے کون سی غرض پوری ہوئی تھی۔محض سوچ میں فرق ہونے پر میں بدظن ہوگیا۔ماں کے بارے میں بھی یہی ہوا۔وقت نے ثابت کر دیا کہ بعض رشتوں کی رُوحیں آپس میں جُڑی ہوتی ہیں۔یہی قدرت کا کرشمہ ہے، جس سے نظامِ حیات رواں دواں ہے۔ماں زمین پر اللہ کا سایہ ہے، پرتو کہہ لیں۔تخلیق کے حوالے سے وہ میرے نزدیک الوہی رُوپ ہے......''

سرمد کے چہرے سے روشنی پھوٹنے لگی۔وہ بولتا رہا: ''اللہ تعالیٰ، اماں جی کی عمر دراز کرے، جیسے ان کے بزرگ طویل العمر ہوئے ہیں......کم از کم سو سال جئیں۔میری محرومیوں کا ازالہ ہو۔میں نے عید کی نماز اپنی ذات کے لیے نہیں پڑھی......'' وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر لمحہ بھر کو خاموش ہوگیا اور پھر خود ہی بول پڑا: ''بلکہ کل جمعہ کی نماز ادا کرنے بھی جاؤں گا......موت اٹل حقیقت ہے۔کوئی ذی شعور اس سے انکار نہیں کرسکتا۔نانا جی کی وفات کے بعد جب میری اماں نے اپنے بھائی اور بہن کو ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر

میرے پاس آنے کا فیصلہ سنا دیا تو اطلاع ملتے ہی میری سوچ بدل گئی......"

بولتے بولتے وہ یوں چپ ہو گیا، گویا گلے میں پھندہ لگا ہو۔ کچھ سوچ کر بولا:

"بڑی مشکل ہے لیکن آپ سے کہہ دینے میں ذہنی سکون محسوس کروں گا...... وہ یہ کہ میں شاید اب تادیر زندہ رہوں...... کیونکہ محبت انسانوں کو یوں ہی مرنے نہیں دیا کرتی......

نماز کے بارے میں میرا خیال ہے کہ اللہ ہمارے سجدوں سے بے نیاز ہے۔ میں یہ اہتمام اپنی ماں کے لیے کر رہا ہوں تاکہ جب وہ طبعی عمر پوری کر چکیں تو اُن کے سفرِ آخرت کے موقع پر آپ لوگ میرے ساتھ ہوں۔"

ooo

ضدی

ممی ڈیڈی برانڈ کی منڈلی میں شامل زیادہ تر لڑکے لڑکیاں، ماسوائے سعود عُرف سعُودی، اعلیٰ سول عہدوں پر فائز افسروں کی اولادیں تھیں۔ مہنگے ترین تعلیمی اداروں نے بھی اِن کا کچھ نہ سنوارا۔ سائنسی ایجادات کے ثمرات سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے ان سے وابستہ آلائشیں سمیٹنے میں یوں بازی لے گئیں کہ کُل اقوامِ عالم کی نئی نسل کو پچھاڑ ڈالا۔ پیزے برگر کھاتے ہوئے گاڑیاں دوڑاتے، ہاؤہُو کرتے، رنگ رلیاں مناتے، ناچتے گاتے، نشے میں دُھت ہر طرح کے تجربے سے گزر جاتے۔ رات بھر جاگتے اور دن کو سوئے رہتے۔

سعود کی اس ماڈرن ٹولی میں شمولیت مشترکہ مفادات کی بنیاد پر ہوئی۔ شروع میں ایسے ہی لگا، گویا ہنسوں میں انوکھی نایاب نسل کا سفید کوا، پَر پھڑپھڑاتے یکسر مختلف اور منفرد آواز میں کائیں کائیں کر رہا ہو۔ اس کو ساتھیوں کی طرح انگریزی آتی تھی نہ ہی انگلش موسیقی پر تھرکنا، سیٹیاں بجانا اور ناچنا گانا آتا تھا۔ ثقافتی پسِ منظر کے حوالے سے بھی یکسر مختلف، جس کے ہاں، پیڑوں والی لسی، حلوہ پوری، نہاری، سری پائے، مٹن کڑاہی، لیگ روسٹ، دیسی مرغ اور انڈے یا پھر دودھ دہی مکھن کا وافر استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے بھرے پیٹ کو آسودگی مہیا کرنے کی غرض سے کھلا آرام دہ لباس پہنا جاتا

ہے۔ان تمام تضادات کے باوجود وہ، جینز اور سلیو لیس ٹی شرٹ پہنے، بالوں کو جھٹکتی اور مٹکتی لڑکیوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا شوقین تھا۔شہر کے اہم تجارتی مراکز میں قیمتی جائیداد چھوڑ کر مرنے والے خاندانی رئیس کے اکلوتے بیٹے کی کمزوری کو بھانپتے ہوئے ماڈرن ٹولی نے کھلے بازوؤں سے استقبال کیا۔پارٹی کی ملک چنک کرتی لڑکی نے مسکرا کر ماتھے سے بال جھٹکے اور "ہائے" کہتے ہوئے اُس کے مکھن کے پیڑے جیسے ہاتھ میں اپنا سوکھا سڑا ہاتھ دے دیا۔سعود کے جسم میں توانا برقی رو دوڑ گئی۔لڑکی کے نین نقش واجبی سے اور رنگت پھیکی، جلد روکھی اور جسمانی ساخت کچھ ایسی، گویا عرصے سے دن رات کے دورانیے میں ایک دو فاقے ہو رہے ہوں۔عمر کا صحیح پتا نہ چلا کہ سولہ سترہ کی ہے یا پچیس تیس کی۔پٹ سن کے ریشوں جیسے، لاابالی پن سے بے ترتیب ہوئے پڑے بال، جن سے کئی شیڈ جھلک رہے تھے۔اُس نے نیلی جینز پہن کر اوپر والے دھڑ کو جس شوخ سُرخ پہناوے میں پھنسا رکھا تھا، وہ بغیر بازوؤں کی بنیان سے زیادہ مختصر تھا۔کندھوں کے ساتھ بغلیں بھی عیاں اور گلا اتنا فراخ کہ وہ سب کچھ اُچھل کر باہر آنے کو بے تاب، جنھیں چھپانے کا حکم الم نشرح ہے۔ایسی جسمانی کسمپرسی پر بھی تنومند سعود پھولا نہ سمایا اور چربیلے بدن میں گدگدیاں ہونے لگ گئیں۔

ماڈرن ٹولی نے سعود کو سیٹھ کہنا شروع کر دیا۔مشورے ہونے لگ گئے کہ ملک میں لوٹ مچی ہوئی ہے، لہٰذا کچھ کیا جائے۔یہی موقع ہے۔باپ اور انکل بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔نائب قاصد سے، وزیرِ اعلیٰ، وزیرِ اعظم اور صدر تک ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق رات دن اندھا دھند مال بنا رہا ہے۔اندھیر نگری چوپٹ راج۔ایسا سُنہری دور جانے پھر کے نصیب ہو۔

ڈی ایم جی گروپ کے دو ڈیڈی اور تین انکل اپنی اولاد کے مستقبل کی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔باہمی صلاح مشورے سے پیراڈائز ہاؤسنگ کے نائٹل سے بہت

بڑی کمپنی کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ مینجنگ ڈائریکٹر، سیٹھ مسعود کو بنایا، جس نے فراخ دلی سے سرمایہ لگا دیا۔ پٹواری سے تحصیل دار، محکمۂ مال مستعدی سے تعاون کرنے لگا۔ ممی ڈیڈی گروپ کے اصل نمائندہ تین لڑکوں اور دو لڑکیوں کو ذہن نشین کرا دیا گیا کہ خود پسِ پردہ رہنا ہے۔ بہانہ بڑا معقول تھا کہ وہ چونکہ اعلیٰ حکام کی اولاد ہیں، لہٰذا اُن کا سامنے آنا کمپنی کے مفاد میں نہیں۔ اصل مقصد مال بنانا ہے۔ تاہم ایم ڈی کے ساتھ دو لاوارث نوجوانوں کو شامل کر دیا تا کہ کاغذی کارروائی قاعدے کے مطابق ہو سکے۔

ایم ڈی اور دونوں ڈائریکٹر اسی زعم میں مبتلا رہے کہ وہ قانونی اعتبار سے جائز کاروبار کر رہے ہیں۔ جب کہ حقیقی اسکیم مختلف تھی۔ انکلوں اور ڈیڈیوں نے اپنی اولاد دلور و اَثاث کو پلان سمجھا دیا کہ زیادہ سے زیادہ ایک سال کی مہلت ہے۔ کم از کم دس ارب روپیہ اکٹھا ہو گا۔ نصف جس کا نیچے سے بہت اوپر کی سطح تک تقسیم ہونا ہے۔ باقی کا نئی جنریشن آپس میں مل بیٹھ کے سمجھ داری سے بانٹ لے۔ چھ ماہ کے بعد کمپنی کے خلاف سرکاری طور پر ہلکی پھلکی چھان بین شروع ہو جائے گی تا کہ فائل کھل جائے اور اس کا پیٹ آہستہ آہستہ بھرتا رہے۔ متعلقہ محکمے حالات کی نزاکت کے مطابق پیش رفت کریں گے اور کمپنی کے پسِ پردہ رہنے والے نوجوانوں کو جوں ہی سگنل ملے، وہ مال سمیٹ کر لاتعلق ہی نہ ہوں بلکہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے بیرونِ ملک پرواز کر جائیں۔ وہاں سکون سے اپنا مستقبل بنائیں اور حالات سازگار ہوتے ہی ملک وقوم کی خدمت کا بیڑہ اٹھانے کو واپس لوٹ آئیں۔

ڈیڈیوں اور انکلوں نے جو کہا، ہو بہو سچ ثابت ہوا۔ شہر کے مضافات میں اصل منصوبے کا سوواں حصہ زمین بھی نہ خریدی گئی۔ البتہ سائٹ آفس بڑا شاندار تعمیر کیا گیا۔ نقشوں میں دیہہ شاملات اور سرکاری زمین کے سیکڑوں ایکڑ رقبے کو اسکیم کا حصہ دکھا کر عوام کو گمراہ کیا۔ اشتہاری مہم پر بے دریغ رقم خرچ کی۔ چھوٹے اور کم قیمت پلاٹوں

کی زیادہ تشہیر ہونے سے کمپنی کے ہیڈ آفس میں بے گھر سفید پوش طبقے نے بکنگ کروانے کی غرض سے دھاوا بول دیا۔شرائط ہی اتنی آسان تھیں کہ ہر کوئی اپنے ذاتی گھر میں رہنے کے خواب دیکھنے لگا۔ ہر ذریعۂ ابلاغ سے کمپنی کے منفرد نعرے کو ڈھول پیٹ پیٹ کر مشتہر کیا گیا: ''ہمارا عزم، اب کوئی بھی ہم وطن اپنے گھر سے محروم نہ رہے۔''

انکلوں کی ہدایت کے مطابق چھ ماہ بعد تشہیری مہم بند کر دی گئی اور بتا دیا کہ احتیاطاً انکوائری کی فائل کھل گئی ہے۔ اگلے دو تین مہینوں تک جمع ہونے والی ساڑھے دس ارب روپے کی کل رقم مرحلہ وار طے شدہ منصوبے کے مطابق تقسیم ہو چکی تھی۔ ممی ڈیڈی گروپ اپنا حصہ لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بیرونِ ملک روانہ ہو گیا۔ سیٹھ صاحب کے ساتھ بطور سیکرٹری، گولڈی رہ گئی، جس نے پہلے روز تعارف ہونے پر ''ہائے'' کہہ کر سوکھے ہاتھ سے مصافحہ کیا تھا۔ یا دونوں ڈائریکٹر ساتھ تھے، شاہد عرف شہدی اور زاہد عرف زاہدی۔ یہ تینوں بظاہر تو ممی ڈیڈی طبقے کے افراد تھے لیکن والدین کی مالی حالت زیادہ مستحکم کبھی نہ رہی تھی۔ تاہم فیشن میں کسی سے پیچھے نہ رہتے اور ظاہری شان و شوکت قائم رکھنے کے لیے اِن کی مائیں بھی نجی اداروں میں جاب کرتی تھیں۔ کمپنی کے ذریعے عوام سے جو اربوں روپے کی جمع پونجی لوٹی گئی، اُس میں سے ایم ڈی کی ذاتی سرمایہ کاری سے قطع نظر صرف اکیس کروڑ کی رقم وصول ہوئی۔ باقی کی افسر شاہی اور اُن کی اولاد نے ہتھیالی اور چپت ہو گئی۔ حکومت کی طرف سے عوام کو انتباہ کر دیا گیا کہ پیراڈائز ہاؤسنگ کے معاملات کی چھان بین ہو رہی ہے لہٰذا اس میں پلاٹ خریدنے والے ہوشیار رہیں۔

گولڈی کو ماہانہ تنخواہ کے علاوہ صرف پانچ لاکھ ملے۔ ڈائریکٹروں نے نئی گاڑیاں خرید لیں اور حیلے بہانے تقریباً، ایک ایک کروڑ روپیہ ویسے بھی نکال لیا۔ کمپنی کے ماہانہ اخراجات کروڑوں میں تھے۔ ترقیاتی کام جاری رکھنا ممکن نہ رہا۔ ادھر سرکاری

انتظامی مشینری نے اپنی کھال بچانے کی غرض سے ایک مرتبہ پھر عوام الناس کو خبردار کر دیا۔ تحت ضابطہ کمپنی کو انضباتی کارروائی کا سخت نوٹس دینے کے علاوہ صرف دو قومی اخبارات میں تقریباً چار بائی پانچ انچ کا اشتہار شائع کروا دیا جس میں عوام الناس کو ان کے اپنے مفاد میں کمپنی ہذا کے ساتھ لین دین کرنے سے منع کر دیا۔ فرض شناس حکام نے اشتہار کی پیشانی پر نمایاں اور جلی حروف میں لکھوایا: ''ہوشیار ہوشیار ہوشیار۔''

سیٹھ سعود کا دل ''می ڈیڈی سٹائل'' کی سرگرمیوں سے بہت پہلے ہی بھر گیا تھا۔ تاہم وضع دار خاندانی پس منظر کے حامل اس نوجوان نے مروتاً بہت بڑی مصیبت مول لے لی۔ گولڈی سے کوئی دلچسپی نہ رہی لیکن ساتھ نباہتا رہا۔ البتہ شہدی اور زاہدی کو اس دل کے بھلے شخص سے واقعی لگاؤ ہوتا گیا اور انھوں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ الاٹیوں میں بے چینی پھیل گئی اور آئے روز ہیڈ آفس کا گھیراؤ ہونے لگا۔ عملے کے بیشتر ارکان بھاگ گئے اور گولڈی بھی روپوش ہو گئی۔ شہدی اور زاہدی کو افسوس ہونے لگا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ سیٹھ کو اس لڑکی سے محبت ہوئی تھی۔ اُنھوں نے پتا چلا لیا کہ وہ اِن دنوں دبئی میں ہے۔ شہدی نے کہا: ''سعود بھائی! آپ نے دل پر نہیں لینا۔ ایسی بہت سی گولڈیاں مل جائیں گی۔ وہ ویسے بھی کوئی ایسی خاص نہیں تھی۔ آپ سے محبت کا ڈراما کرتی رہی......''

ہر وقت خوش رہنے والے سیٹھ سعود کا گول مٹول سفید چہرہ گزشتہ کئی ہفتوں سے مرجھایا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔ ساتھیوں کی بات سن کر ہشاش بشاش ہو گیا اور بول اٹھا: ''کیا بات کر دی دوستو! آج سچ بول ہی دوں۔ یہ تمہارے برانڈ کی لڑکیاں مجھے دور سے بڑی اچھی لگا کرتی تھیں۔ کیا کروں، عورت اور شراب میری مجبوری ہے۔ لیکن ان کے قریب ہونے پر معلوم ہوا کہ بڑی بے سوادی ہیں۔ گولڈی بھی ایسی ہی تھی۔ سُوکھی کڑک لکڑی کی ٹانگیں اور باڈی سڑی بُسی ڈبل روٹی کے پیس کی کترن۔ اب منہ میں

آیا ہوا نوالہ تھوکتے ہوئے بندہ اچھا بھی نہیں لگتا۔ آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے......"

تینوں نے ہی قہقہے اُگل دیے۔ سعود کہنے لگا: "میں اصل میں پرانے شہر کا بندہ ہوں۔ وہاں کی بات ہی اور ہے۔ برقعوں اور چادروں میں لپٹی ہوئی بھی ہوں، ایمان سے نقاب ذرا سا سرکاؤ، اور پھر کھولتے چلے جاؤ، اندر سے کھیر کھوئے ملائیاں...... ویسے اور چٹ پٹے کھٹ مٹھے چٹخارے بھی ہیں۔ کم بختی گھیر گھار کر مجھے لے آئی اور انکلوں نے پھنسا لیا۔ اللہ ہی جانے اب ہمارا کیا بنے گا۔ ہو سکتا ہے، بہت بُرا حشر ہو جائے۔ سوچتا ہوں، اس سے پہلے پہلے من کی مرضی پوری کر لوں۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ دراصل میں اپنی اصل کی طرف لوٹ گیا ہوں۔ وہی کھوئے ملائیاں، ربڑی کھیر اور سارے کھاجے۔ تم بُرا نہ مانا، سچی بات ہے، تمہارے یہ پیزے برگر، دل کو نہیں بھائے...... ویسے ہی ماڈرن بننے کے شوق میں کھائے اور مُرلی بجائی۔"

دونوں ساتھی افسردہ تھے۔ ذرا کھسیانے سے ہو کر مسکرا دیے۔ زاہدی بول پڑا: "سوری یار سعود بھائی! ہم ٹریپ ہو گئے۔ یہ ساری کارستانی بوبی کے ڈیڈی کی ہے۔ جب ہاتھ دکھا گئے تو سمجھ آئی۔ اب وہ ٹاپ کے حکومتی ایوان میں بڑی بھب پوسٹ پر جا بیٹھا ہے۔ میرے پاپا کہہ رہے تھے: ہماری بیوروکریسی ایک فیملی ہے۔ United with eachother very firmly بڑے افسر شکار مار کر بڑا حصہ خود رکھ لیتے ہیں اور باقی کا ساتھی افسروں کو...... یہ جو تفتیشی ایجنسیوں کے افسر فائلیں بغل میں دبائے ہم سے میٹنگیں کرنے آ جاتے ہیں، اُنھوں نے ہی بھجوائے ہوں گے......"

"دیگ خالی کر گئے، صرف کھرچن رہ گئی۔" شہدی نے لقمہ دیا۔ ذرا دیر کو کچھ سوچا اور دوبارہ بول پڑا: "ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اکٹھے مریں جئیں گے۔ میری رائے ہے کہ آپ کے پاس جو مال بچا رہ گیا ہے، کہیں سنبھال دیں۔ زیادہ سے زیادہ کتنی سزا ہو گی...... میرے خیال میں چار پانچ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ بعد میں جل کے کوئی

ڈھنگ کا کاروبار کرلیں گے۔"

سعود نے سر مارتے ہوئے کہا: "مشکل ہے بھائی! مجھے ان لوگوں نے چارمنٹ سردی میں بٹھا کر پنکھا چلا دیا، اللہ کی قسم میں نے سب کچھ بک دینا ہے۔ مجھ سے کوئی سختی دو منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں ہوتی۔ سختی بڑے دور کی بات ہے۔ کوئی بندہ میرے سامنے خوبصورت لڑکی بٹھا دے اور جب میرے پینے کا وقت ہو، بوتل بھی رکھ دے۔ بس اتنا کہہ دے: خبردار! اگر لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا...... یا بوتل کو ہاتھ بھی لگایا۔ تم سمجھ لو کہ تمہارے بھائی کا دل بند ہونا شروع ہو جائے گا......"

سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں کو دو تین بار باہم جوڑتے اور کھولتے ہوئے سعود نے کہا: "یوں، جیسے بلب جھپکیاں مارتا ہے، میرے دل کی یہی حالت ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے جو بھی اہل کار تفتیش کرنے آتا ہے، چائے پانی کے بغیر نہیں جانے دیتا۔ ظالموں کی چائے کا ایک پیالہ ایک لاکھ روپے سے کم کا نہیں ہوتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ الاٹیوں میں کچھ لوگوں نے ہماری بات کو غور سے سنا اور سمجھا۔ انھوں نے باقی متاثرین کو صبر کرنے کا کہا ہے۔ آج تم دونوں سائیٹ پر گئے ہوئے تھے۔ متاثرین پیراڈائز نے اتفاق رائے سے ایاز احمد اور سعید احمد کو اپنا نمائندہ چن لیا ہے۔ میں نے دونوں کو یقین دلایا کہ آبائی جائیداد بیچ کر بھی سب الاٹیوں کا ایک ایک روپیہ ادا کروں گا۔ اربوں کے اثاثے ہیں، جلد بازی میں اونے پونے بک جائیں گے۔ ذرا صبر کرو۔ مصیبت یہ ہے کہ کئی تفتیشی اداروں کے افسر ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ خوف ناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے: اندر ہی اندر ہمارے ساتھ بارگین کرو۔ ہم کلیئر کر دیں گے۔ چار دن کہیں روپوش ہو جاؤ۔ عوام رو پیٹ کے صبر کرلیں گے۔ عوام نے پہلے کسی کا کیا بگاڑ لیا ہے۔ اُن کے ساتھ شروع دن سے یہی ہوتا آرہا ہے......"

شہدی نے گہری لمبی سانس بھری اور بولا: "بوبی سے آج پھر بات کی تھی۔ یہ سوچ کر کہ بارہ گھنٹے کا فرق ہے، ابھی وہاں سونے کا وقت نہیں ہوا ہوگا۔ یہی کہا کہ ڈیڈی سے کہہ کر کسی طرح سرکاری بھیڑیوں کو رکوائے جو ہماری بوٹیاں نوچنے کو جبڑے کھولے گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ ذلیل شے نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا؛ شہدی! بار بار تنگ نہ کرو۔ ڈیڈی کو کہہ دیا تھا ناں یار! بڑی sensitive پوسٹ پر ہیں۔ سوچ سمجھ کر ہی step لیں گے...... تم تینوں خود کیوں نہیں پراپر لی ڈیل کرتے ...... Every thing is possible in our country yaaar....

زاہدی بول پڑا: "بڑی ذلیل پارٹی تھی ہماری...... پاپا نے مجھے سمجھایا کہ بارگین کا یہی مطلب ہے۔ میجر پورشن خود ہڑپ کریں گے۔ باقی تھوڑے بہت اثاثے ڈکلیئر کر کے فائل کلوز کر دیں گے۔ دراصل یہ ادارے، پولیس سمیت ہمیں بلیک میل کر رہے ہیں۔ میرے اور شہدی کے گھر بھی کئی چکر لگائے۔ پاپا نے صاف کہہ دیا: بیٹے نے سارے پیسے یہ گھر کی اوپر والی سٹوری بنانے اور فل ڈیکوریٹ کرنے پر خرچ کر دیئے۔ تم لوگ نیا بنا ہوا پورشن اکھاڑ کر لے جاؤ اور گھر کا سارا سامان بھی اُٹھا لو۔ باقی مکان میرے نام ہے...... شہدی کی ممی نے بھی تنگ آ کر snub کر دیا اور کہا؛ بینک لون adjust کروا دیا تھا۔ پروف دیکھ لو۔ اگر بینک والے واپس کرتے ہیں تو لے لو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں...... ساتھ ہی آنٹی نے لیٹر لکھ کر کئی اداروں کو پوسٹ کر دیا کہ ہمیں خواہ مخواہ harass کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد ہمارے گھروں میں کوئی بندہ نہیں آیا۔ اب ہم دونوں ہتھ کڑیاں لگوانے کو تیار بیٹھے ہیں......"

"اوخوخو...... ایسی منحوس بات نہ کرو......" سعود نے زاہدی کو ٹوک دیا۔ شہدی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور کہا: "لاؤ اب ساغر و مینا میرے آگے...... بدن پکارنے لگا ہے...... یہ غالب فیض اور فراز جیسے عظیم لوگ مجھے اسی لیے پسند ہیں کہ پینے پلانے کی

باتیں کرتے ہیں۔کوئی کھپ زولا نہیں۔ایک آمنہ سرفراز کی تڑپ چین نہیں لینے دیتی۔آفت لڑکی کسی قیمت پر نہیں مانتی اور میں مرجاؤں گا حسرت ویاس کی موت......اب دل سے فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنا 'پلی بارگین' ہونے سے پہلے پہلے اُس کے ساتھ بارگین کرلوں......یہ بات اتنی سستی نہیں کہ روکھے سوکھے منہ سے سنانا شروع کردوں...... لاؤ ایک ڈبل پیگ۔کیف وسرور میں سناؤں گا۔میں اُس کو آمنہ سرفراز کی بجائے مینا ساغر کہا کرتا ہوں۔آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لینے سے ہی پوری بوتل کا نشہ ہو جاتا ہے......"

شہدی نے ساقی گری کرتے ہوئے پُراشتیاق نظروں سے دیکھا اور زاہدی نے بول دیا: "سنائیں ناں! سعود بھائی! ساتھ ساتھ بولتے جائیں......" سعود نے بڑے سے سر کو دائیں بائیں جھٹک کر کہا: "ناں میری جان! حسین لوگوں کی باتیں پھوکے پن سے کرنا حُسن کی بے قدری ہے۔عاشق پیشہ لوگ گناہِ بے لذت نہیں کیا کرتے۔آج نہیں تو کل مرجانا ہے۔پُرسش ہو سکتی ہے کہ ایسی بدذوقی کا مظاہرہ کیوں کیا، جب غالب فیض کو مرشد مان رکھا تھا تو اُنھی کی طریقت پر چلتے۔"

سُرور میں آکر سعود بولنے لگا: "مینا ساغر کا آبائی گھر ہماری پرانے شہر والی حویلی کے قریب ہے......گلی میں داخل ہوتے ہی اُلٹے ہاتھ دوسرا مکان...... تین منزلہ اچھا پرانے زمانے کا بنا ہوا۔گلی کے آخر میں ہماری حویلی کا ہاتھی دروازہ ہے، گلی کی چوڑائی کے برابر۔آگے دائیں بائیں ہمارا احاطہ۔پچھواڑے دوسرا محلّہ ہے، کمان گروں کا......چاچا سرفراز ڈھلیا جس دن کسی سے لڑائی نہ کرے، اُس دن بیمار پڑ جاتا ہے۔پوری گلی میں ہر کسی سے کبھی نہ کبھی کوئی بہانہ بنا کر لڑ چکا ہے۔ابا جی سے پکی دشمنی تھی۔جوانی میں اُن سے مہینے دوسرے ایک آدھ بار ضرور پھٹ جایا کرتا تھا۔فوت ہونے سے ایک ہفتہ پہلے ابا جی نے پولیس کے ذریعے خوب چھینٹی لگوائی۔گلی میں

دو طرفہ نالیاں ہیں۔کوئی چیز بہہ کر اس کے دروازے کے سامنے رُکی پڑی ہو تو انکوائری شروع کر دے گا اور جب تک گالی گلوچ ہاتھا پائی نہ ہو جائے، چاچا ڈٹا رہتا ہے......"

"کاروبار کیا کرتا ہے؟" شہدی نے پوچھ لیا۔ سعود نے چھوٹا سا گھونٹ لیا اور نمکو کا دانہ منہ میں ڈال کر بولا: "کباڑی بازار میں اپنا کارخانہ ہے، جس میں ڈھلائی کی خاصی بڑی بھٹی لگا رکھی ہے۔ دیگی لوہے کے ڈھکنوں کی ڈھلائی کرتا ہے...... جو مین ہولوں پر رکھتے ہیں۔ وہاں بھی کسی نہ کسی سے جنگ چھڑ جاتی ہے۔ مزدور کاریگر روز ہی بھاگے ہوتے ہیں۔ کام بند ہو جاتا ہے۔ چاچی رشیدہ، اس کی بیوی بہت اچھی عورت ہے۔ بے چاری کو بالکونی سے دھکا دے کر نیچے صحن میں گرا دیا تھا۔ وہ دن اور یہ، بستر پر ہے۔ اپاہج کر دیا۔ بڑی دونوں بیٹیاں شادی شدہ ہیں۔ داماد ناراض ہیں۔ بیوی بچوں کو آنے ہی نہیں دیتے......"

زاہدی بول پڑا: "میرے خیال میں ڈھلائی کی بھٹی کے سینک نے چاچے کو اتنا سڑیل بنا دیا ہے......" شہدی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "کوئی نسل ہی سڑی ہو گی۔ سیکڑوں چھوٹی بڑی بھٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ سارے مالک ایسے تو نہیں ہوں گے......" سعود بولا: "چاچے کے آباؤاجداد توپوں کی ڈھلائی کرتے تھے۔ کہتا ہے مغل ہیں، بابر کی فوج کے ساتھ آئے تھے...... خیر، وہ خود جو بھی ہو، اُس کی بیٹی مینا ساغر کے مغل شہزادی ہونے میں کوئی کافر ہی شک کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ تاریخ میں جتنی شہزادیاں ہو گزری ہیں، اس کے مقابلے میں ایسی ہی ہوں گی کہ اس کی کنیزیں بننے کے لائق۔ چاچے کی اولاد نرینہ نہیں ہوئی۔"

سعود نے لحظہ بھر کو توقف کیا اور بولنے لگا۔ "ایک بات معمہ بنی ہوئی ہے کہ بیٹی کے ساتھ سختی نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حسن کا اپنا دبدبہ ہوتا ہے اور سخت گیر انسان بھی اس کے رعب میں آ جاتا ہے۔ ناراض ہونے پر بول چال بند کر دے گا لیکن ہاتھ

نہیں اٹھاتا۔ معذور ماں کی وجہ سے بیٹا ساغر شادی نہیں کرتی۔ کوئی ملازمہ چاچے کے گھر دو دن نہیں ٹھہرتی۔ اکتیس سال کی ہوگئی ہے۔ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹی۔ میں تب سے اُس کا عاشق ہوں، جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ چاچی کے ساتھ میری چھوٹے ہوتے سے دوستی ہے۔ جب معذور ہوگئی، تب بھی چوری چھپے ملنے چلا جاتا تھا۔"

جُرعہ کشی کے دوران ایک دو لمحے کی خاموشی حائل ہوگئی۔ دونوں ساتھی تجسس آمیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ سعود بول پڑا: "ایک تو اس شخص کو کاروبار میں گھاٹے بہت پڑتے ہیں۔ دور دور شہروں کے دکانداروں کو مال بھیجتا ہے۔ جب بھی وصولیوں پہ جائے گا، کسی نہ کسی سے پھڈا ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی کبھی ٹرک اڈے والوں سے لڑائی...... وہ مال اٹھانا بند کر دیتے ہیں۔ لوکل پھیرا لگانے کو سوزوکی والا نہیں مانتا۔ یہ بندہ اپنی ذات کے لیے بھی مصیبت بنا ہوا ہے۔ مالی حالات بہت زیادہ خراب ہونے پر بینک سے قرض لیا۔ مکان گروی رکھا۔ وہ ادا نہ ہو سکا۔ آخر قرقی ہوئی۔ شکر اللہ پاک کا، اُس نے میری فریاد سن لی۔ عاشق دیوانے کی۔ ہمارے آفس والے پلازے کی پچھلی سڑک سے نکلنے والی چوڑی گلی میں آٹھ مرلے کے مکان کے نچلے پورشن میں شہزادی بیٹی اور ملکہ بیوی کے ساتھ اُٹھ آیا ہے......"

ساغر دوسری بار بھی چل چکا تھا۔ سعود نے خمار آلود نگاہوں سے شہدی کو دیکھ کر گلاس آگے سرکایا۔ اُس نے ہچکچاتے ہوئے تھوڑی سی انڈیل دی۔ سعود نے لہر میں آکر شعر سنایا: "پیوں گا آج ساقی سیر ہو کر + میسر پھر شراب آئے نہ آئے......" شہدی نے مسکرا کر پیگ پورا کر دیا اور بولا: "آگے سنائیں کیا ہوا۔ داستانِ عشق آج پوری سنیں گے۔ میسر پھر یہ رات آئے نہ آئے......"

"عشق یک طرفہ ہے دوستو! یہ ظلم کی داستان ہے۔ جب وہ گیارہ بارہ سال کی ہوئی، میری مَسیں بھیگ گئی تھیں۔ موقع پا کر اُس کے گھر چلا جاتا۔ ڈیوڑھی میں داخل

ہوتے ہی اُلٹے ہاتھ اوپر جانے والی سیڑھیاں ہیں۔داہنے ہاتھ بیٹھک...... سامنے صحن میں کھلنے والا دروازہ۔ چاچی دیکھ لیتی تو پہلے اُس کو ملتا اور فضول کی باتیں کر کے نکل آتا۔ ورنہ میں مینا ساغر کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھک میں لے جاتا۔ وہ گلاب کی طرح سرخ ہو جاتی...... ایک بار عجیب ہی بات ہوئی۔ اُس کو صوفے پر بٹھایا اور خود کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھ بھی بے انتہا نازک، ریشمی ریشمی سے اور pinkish ہیں۔ ایسی منہ زور خواہش دل میں جوش مارنے لگی، میں بتا نہیں سکتا۔ اُس سے کہا: تم اللہ رسولؐ کے واسطے مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ ایک بات کرنے لگا ہوں...... میں نے رُک کر جیب سے سو سو روپے کے ڈھیر سارے نوٹ نکال لیے۔ سو نوٹوں کی تھتھی کھلی ہوئی تھی۔ اُس کے دائیں ہاتھ صوفے پر رکھ دیے اور کہا: ''اللہ کے واسطے مجھے چُمّی لینے دو۔ ذرا تھوڑی سی زیادہ۔ ایک سے کام نہیں بنے گا۔ فی چُمّی سو روپیہ انعام۔ تم خود ہی گنتی جانا اور اُس حساب سے اپنا انعام رکھ لینا۔ باقی کے نوٹ میں بعد میں کسی وقت لے جاؤں گا......''

شہدی اور زاہدی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے ہی چلے جا رہے تھے۔ سعود بڑا سنجیدہ ہوا جرعہ جرعہ پینے لگا۔ زاہدی بول پڑا: ''سعود بھائی! مجھے اپنا بوسہ لینے کی اجازت دے دیں، اللہ کے نام پر......'' شہدی نے لقمہ دیا: ''اور مجھے بھی......'' سعود کے ہاتھوں میں ہلکی لرزش ہو رہی تھی اور آنکھیں خمار آلود تھیں۔ ساتھیوں کو دیکھے بغیر دونوں ہاتھ بلند کیے اور پہلی انگلیوں کی پوروں سے گالوں کو چُھو کر ڈوبی ہوئی آواز میں بولا: ''آؤ، یہاں آ کر چُوم لو...... صرف ایک ایک بار۔ بے ایمانی نہ کرنا۔ ابھی مجھے بات پوری سنانی ہے......''

دونوں اُٹھے اور میز کے دائیں بائیں پہلو سے اُس کے پاس گئے۔ جھک کر تقریباً ایک ساتھ ہی اُس کے گورے گداز بُھولے ہوئے گال چُوم لیے۔ تھینک یُو کہہ کر واپس اپنی نشستوں پر آ بیٹھے۔ سعود خود ہی بولنے لگا: ''میری بات سن کر مینا ساغر نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور بولی: بے شرم۔ میں نے عجلت میں اُس کے دونوں

ہاتھوں کی پشت پر دو دو بوسے دیے اور نوٹ وہاں ہی چھوڑ کر نکل آیا۔ اگلے روز چھٹی کے وقت وہ بھی میرے آگے آگے گلی میں داخل ہوئی۔ گھر کی دونوں سیڑھیاں چڑھ کر دہلیز کے اندر قدم رکھتے ہوئے گردن موڑ کر مجھے دیکھا۔ میں جب سامنے پہنچا تو وہ ڈیوڑھی میں کھڑی تھی۔ مجھے سر کے اشارے سے بلایا۔ میرے قریب جانے پر بستے سے سارے نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے اور بولی: یہ میں کہاں سنبھالوں گی۔ تم نے بے ایمانی کر لی۔ آئندہ نہ کرنا، ورنہ میں بول چال بند کر دوں گی۔ مجھے کوئی جواب نہ سوجھا اور اُداس ہو گیا۔ اُس نے میرے کوٹ کی جیب میں نوٹ ڈال دیے اور اندر چلی گئی۔''

چند لمحے خاموش رہ کر سعود نے گلاس میں بچے کھچے قطرے زبان پر ٹپکائے اور بول پڑا: ''چاچا کے دائیں پہلو سے جُڑے گھر میں ابا جی کے گہرے دوست اقبال یوسف رہتے تھے...... وہ اب بھی وہاں ہی رہتے ہیں۔ اُن کا بھی ذاتی گھر ہے۔ بڑے پڑھے لکھے، عالم فاضل شاعر اور بہت کچھ۔ ابا جی کا بھی یہی شوق تھا۔ کتابیں پڑھنا۔ اُن کی ہال نما لائبریری، کتابوں سے بھری ہوئی ہے۔ پورے پاکستان اور انڈیا سے بھی رسالے آیا کرتے تھے۔ دونوں دوست سارا وقت لائبریری میں بیٹھے، کتابوں رسالوں اور شاعروں ادیبوں کی باتیں کرتے۔ چاچا کی اُن کے ساتھ کئی لڑائیاں ہو چکی تھیں۔ تازہ لڑائی کمال کی تھی۔ چاچا نے اُن کے دروازے پر شور مچانا شروع کر دیا اور کہا کہ بیٹھک کے ساتھ والے اپنے مہمانوں کے لیے بنائے گئے باتھ روم میں پیشاب نہ کیا کرو۔ اس کی بدبُو ڈیوڑھی میں آتی ہے۔ چچا اقبال صاحب باہر آئے اور بولے: میں یہ پائپ جو غسل خانے سے نکاسی کے لیے لگا ہوا ہے، اس پر فلٹر لگوا دیتا ہوں۔ پانی بالکل صاف ہو کر نالی میں گرے گا۔ تم بے شک پی لیا کرنا......''

زاہدی اور شہدی نے بے اختیار قہقہے اُگل دیے۔ سعود پر کہانی سنانے کی دُھن سوار تھی۔ بولتا گیا: ''چاچا نے پہلے کب کبھی غصے پر قابو پایا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے اتنے

عزت دار شخص کے جبڑے پر مکا مار دیا۔ ہاتھ بھی شاید دیگی لوہے کا بنا ہوا ہے۔ چچا جی اقبال صاحب کے منہ سے خون نکل آیا۔ گلی کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ابا جی نے تھانے میں فون کر دیا۔ پولیس آئی اور چاچا کو لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔ چوتھے روز مینا ساغر ہمارے گھر آ گئی۔ اماں سے ملی۔ فطرتاً دلیر لڑکی ہے۔ میں نے شاید ہی کبھی اس کو روتے دیکھا ہو...... صرف چند ایک بار۔ وہ بھی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ روئی نہیں......"

شہدی نے سر دھنتے ہوئے کہا: "پھر تو اصلی مغل شہزادی ہوئی ناں!!......"

سعود نے اثبات میں سر ہلایا اور بات جاری رکھی: "اماں نے میرے ساتھ اُس کو لائبریری میں بھیج دیا۔ ابا جی اور چچا جی اقبال صاحب بیٹھے تھے۔ دونوں دوستوں نے اُسے قریب بُلایا اور سر پہ پیار پھیرا۔ وہ کہنے لگی: میری اماں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ کوئی رشتہ دار ہماری مدد کو نہیں آیا۔ ابا تھانے میں بند ہے۔ اُس کو چھڑوائیں یا ضمانت کروائیں۔ وکیل کی فیس کے پیسے گھر میں پڑے ہیں...... چچا جی اقبال نے ابا جی سے کہا: بھائی صاحب! ابھی فون ملائیں۔ میں راضی نامہ لکھ دیتا ہوں۔ گھر میں معذور عورت ہے اور بچی پریشان......"

سعود نے کرسی سے پوری طرح ٹیک لگائی اور ماتھا سہلاتے ہوئے بولا: "لمبی کہانی ہے۔ مختصر کرتا ہوں۔ اُس کے ساتھ کوئی بات کرنے، حیلے بہانے ملنے کی خاطر میں نے بڑی ذلتیں اٹھائیں۔ بڑا خوار ہوا۔ وہ اُنیس بیس سال کی ہو گئی۔ ایسا جوبن اُمنڈ کر آیا اس لڑکی پر، توبہ استغفار...... زیادہ بات نہ کروں۔ آگے چلوں۔ کوئی کفر نہ بک دوں...... گلی محلے اور گھر میں بھی پتا تھا کہ میں امینہ کا عاشق دیوانہ ہوں۔ ابا جی نے لاکھ سمجھایا، میں باز نہ آیا۔ ملنا بڑا مشکل ہو گیا مگر کوئی نہ کوئی طریقہ نکال ہی لیتا۔ ایک بار صاف کہہ دیا: میرے ساتھ شادی کر لو۔ تم ہاں کرو۔ میں آج ہی اماں اور ابا جی کو دو ٹوک فیصلہ سنا دیتا ہوں کہ امینہ سے میری شادی نہ ہوئی تو ساری زندگی کنوارہ بیٹھا رہوں

گا...... مطلب ہے منکوحہ بیوی کے بغیر۔ چل سو چل......"

سعود ہنس پڑا اور بولا: "یہ آخری بات میں نے امینہ سے کی تھی، والدین سے کرنے والی نہیں تھی۔ وہ بولی: تو کیا رنڈیوں کے پاس جاؤ گے؟ میں نے کہا: رنڈی بھی عورت ہی ہوتی ہے۔ لوگ اس کو الگ مخلوق کیوں سمجھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ عورت بازی میں حد سے نکل جاؤں گا۔ لوگ کانوں کو ہاتھ لگائیں گے...... شراب پینی میں نے پہلے ہی شروع کردی ہے...... تیرے ہجر و فراق میں۔ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اللہ نے تجھے بہت ہی زیادہ حسن دے دیا۔ حالانکہ اس سے آدھا حُسن دیتا، تب بھی پتا نہیں چلنا تھا کہ خوبصورتی میں کمی کی گئی ہے۔ ایک تو مجھے اللہ پاک کے کاموں کی ذرا سمجھ نہیں آئی۔ بندوں کو دوزخ کی آگ سے ڈرا ڈرا کر حکم دیتا ہے کہ ناپ تول پورا رکھو۔ خود اندھا دھند ہی بانٹنا شروع کر دیتا ہے۔ اپنی مثال ہی دیکھ لو۔ ایک تیری سامنے پرائمری سکول والی سہیلی ہے، ثمن۔ اُس کا کیا قصور تھا؟ اپنے ساتھ موازنہ کرو بے چاری کا......"

پہلو بدلتے ہوئے سعود آسودہ ہو کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا: "میں نے اُس سے کہا: میری اصل مشکل یہ ہے کہ تم خود بھی اپنے بارے میں اچھی طرح جان گئی ہو...... کہ بہت زیادہ خوبصورت ہو۔ وہ ہنس پڑی اور بولی: میرے گھر میں آئینہ ہے اور میں اندھی بھی نہیں۔ باہر بڑی مجبوری میں نکلتی ہوں، وہ بھی چہرہ اور جسم اچھی طرح چھپا کر۔ مرد سارے تیرے جیسے ہی ہوتے ہیں، اس لیے کسی سے نظریں ہی نہیں ملاتی۔ لیکن ہر عمر کی عورتوں سے ملنا ہی پڑتا ہے۔ اُن کی نگاہوں میں حسرت حیرت پڑھ لیتی ہوں۔ اُن کی باتیں اور سرگوشیاں بھی کان میں پڑ جاتی ہیں۔ بہری بھی نہیں۔ حُسن کی تقسیم پر اللہ سے شکوہ کر رہے ہو، ذرا شرم نہیں آئی۔ چٹا چیٹی گول مٹول باوا، عقل کا اندھا، کروڑوں اربوں کی دولت جائیداد کا مالک اور عقلوں والے روٹی کو ترس رہے ہیں۔ اللہ کی اس تقسیم پر کبھی غور کیوں نہیں کیا؟"

"ونڈرفل......" زاہدی نے بے ساختگی میں کہا اور شہدی بولا: "جواب نہیں۔ حُسن کی دیوی عینکس بھی ہے سعود بھائی!" تائید میں سر ہلاتے سعود کہنے لگا: "بے شک...... میں پہلے ہی سُرور میں تھا۔ اُس کی باتوں نے جادو جگایا اور نشہ سوایا ہو گیا۔ بے خودی طاری ہو گئی۔ کچھ نیت میں بھی فتور آیا ہو گا...... تم یوں سمجھ لو کہ اختیار اور بے اختیاری رل مل گئے۔ موقع سے فائدہ اٹھانے کی اُمنگ جاگ اٹھی۔ فوراً اُس کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ممکن ہے بوسہ زیادہ طویل ہو گیا ہو۔ اُس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ کھینچنے کی کوشش لیکن میں نے ہاتھوں کی گرفت مزید مضبوط کر لی۔ اُس نے دوسرا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ کر دھکیلا۔ میں نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میری آنکھیں، ہونٹ، چہرہ اور پورا بدن خمار سے بوجھل ہو گیا ہے۔ بے اختیاری میں میرے منہ سے 'سبحان اللہ، مرحبا' کے الفاظ ادا ہوئے۔ اُس کو مخاطب کر کے کہا: اب اللہ کی اِس حکمت کو سمجھ گیا۔ ہر کسی کو کچھ نہ کچھ بے حساب دے دیا۔ تاکہ اُس کے بندے آپس میں مل بانٹ کر حساب برابر کر لیں۔ تیرا حُسن اور عقل، میری دولت۔ یہ یک جا ہو جائے۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔"

سعود نے ہونٹ سکوڑ کر سیٹی کی آواز نکالی اور بولا: "مینا ساغر کا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو گیا اور وہ نظریں جھکائے ہاتھ کی پشت کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے بولی: یہ تم نے زیادتی کی ہے۔ اگر خود پر قابو نہیں رکھ سکتے تو مت آیا کرو۔ ابا کو پہلے ہی شک ہے۔ اُس نے مجھے سنانے کے لیے امی سے کہا تھا کہ بیٹی کو مارنے کا حوصلہ نہ ہوا تو خود مر جاؤں گا لیکن سُعودی کو قبول نہیں کروں گا۔ وہ دشمن کا بیٹا ہے۔ اُس کے باپ نے اپنی زندگی میں میرے ساتھ بڑے ظلم کیے۔ ویسے بھی ہمیں گھر داماد چاہیے۔ مل جائے گا...... ابا سے میں گھر کی ضروری بات کے سوا کوئی سوال جواب کرتی ہی نہیں۔ لیکن اپنے دل میں سوچ لیا ہے کہ شادی نہیں کروں گی۔ انسان اور کوئی

نیکی کرے نہ کرے، ماں کے لیے اتنی سی قربانی تو دے۔ بندہ شادی کے بغیر مر نہیں جاتا...... اور تمہارے جیسے رئیس زادے کا اعتبار بھی نہیں۔ چار دن میں شادی کا بھوت اُتر جائے۔ پھر وہی کرتوت، شراب اور عورت...... عقل تمہیں چھو کر بھی نہیں گزری......

اُس وقت تک نشہ پوری طرح میرے دماغ کو چڑھ گیا تھا۔ تمیز ہی نہ رہی کہ کون سی بات کرنے والی ہے، کون سی نہیں۔ اُس کے انکار نے بھی یقیناً کام کر دکھایا ہو گا۔ زیادہ ہی بہک گیا اور بول دیا: یہی فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔ دولت ہونے کے باوجود، مجھ میں رتی بھر غرور نہیں۔ تمہیں حُسن پر غرور ہے اور عقل پر بھی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ تمہاری بے رخی کی وجہ سے خراب ہوا ہوں۔ اب اور بھی زیادہ خراب ہو جاؤں گا۔ دیکھنا تم: ممی ڈیڈی کلاس کی لڑکیوں سے بھی دوستیاں لگاؤں گا...... پیسہ میرا ہو گا اور شوخیاں اُن کی...... یہی ابھی پچھلی رات کا تجربہ سن لو۔ تمہاری سابقہ دوست شمن کم ماڈرن نہیں۔ صرف ایک بار کہا۔ اللہ کی قسم اُس نے رتی بھر غرور نہیں کیا۔ سحری تک رات میرے پاس حویلی میں گزاری ہے......"

"یہ کیا ظلم کر دیا سعود بھائی! زاہدی نے پھڑک کر کہا اور شہدی دیکھتا ہی گیا۔ سعود بولا: "ارے ظلم نہیں بھائی! غضب ڈھا دیا۔ اُس کی قلم سی تراشیدہ ناک کے نتھنے ذرا سے پھڑ پھڑائے اور آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹیں، کہنے لگی: نکلو میرے گھر سے...... اس کا مطلب ہے، تم بدکاری کو انکساری کہتے ہو۔ جو فاحشہ تجھے جسم پیش کر دے، وہ عاجز مسکین اور باعصمت عورت مغرور...... مجھے پھر بھی عقل نہ آئی۔ شراب ساری معدے سے اُچھل کر دماغ پر چڑھ بیٹھی تھی۔ مزید شوخ ہو گیا اور کہہ دیا: "چلے جاتے ہیں۔ کوئی نشانی دے دو اپنے عاشق کو...... دو چار دس بیس سو چُمے...... اب تو تمہارے حسن و شباب کی تاب نہیں لائی جا رہی۔ صدقہ خیرات نہیں مانگ رہا۔ ایک لاکھ روپے کا ایک چُما۔ صرف سو چُمے...... تم مان جاؤ۔ ایک کروڑ روپیہ ابھی لا کے دیتا ہوں۔

الماری میں پڑے ہیں......"

شہدی کو اپنے جذبات پر قابو نہ رہا۔ اپنے زانو زور سے پیٹے۔ زاہدی نے منہ سے اُف اُف کی آوازیں نکالیں۔ سعود کہنے لگا: "مینا ساغر نے میرے سینے پر دونوں ہاتھوں سے دھپ مارتے ہوئے کہا: تم جیسے مدہوش شرابی کے منہ میں رنڈیاں پیشاب کیا کریں گی۔ دفع ہو جاؤ...... میں ہوا کے جس گھوڑے پر سوار تھا، اُس کے پر نکل آئے تھے۔ بے دھڑک بول گیا: "رنڈیاں مسکین مخلوق یہ جرأت نہیں کر سکتیں۔ ہاں! دل کی ملکہ کو نہیں روکوں گا۔ ویسے بھی نیٹ پینے کا ڈبل ٹربل نشہ ہوتا ہے۔ ابھی ڈائریکٹ بوتل سے ہی چڑھا کر آیا ہوں......"

زاہدی نے یک دم کرسی چھوڑی تو وہ پیچھے الٹ گئی۔ صوفے پر دھم سے گرا اور لیٹ کر ہنسنے لگا۔ شہدی ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ لیے ہنستے ہوئے سعود کو دیکھے جا رہا تھا۔ سعود نے ہچکی لی اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے آنکھیں مسلتے ہوئے بولا: "اُس نے سچ مچ ہی مجھے دھپے مارنے شروع کر دیے اور باہر والے دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ میں نے اُس پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ پیر و مرشد حضرت غالب یاد آ گئے۔ ملاوٹی شعر بولتے ہوئے باہر نکل گیا: دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں + ہم ہی سُعودی کر بیٹھے ہیں بدکلامی آج کے دن۔"

ہنسی کا دور اختتام پذیر ہوا۔ کمرے میں چند لمحے افسردہ خاموشی چھائی رہی۔ سعود نے شہدی سے کہا: "علی اصغر سے کہو، بیس منٹ تک کھانا لگا دے۔" شہدی فوراً اٹھا اور دروازہ کھول کر لاؤنج کی طرف چلا گیا۔ سعود اور زاہدی باری باری واش روم گئے۔ واپس آ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ شہدی آیا اور سعود کے ساتھ دائیں پہلو لگ کے بیٹھ گیا۔ بازو لمبا کر کے اُس کے کندھوں پر رکھ لیا۔

سعود کسی سوچ میں گم تھا۔ خود ہی بول پڑا: "بہت بُرا ہوا۔ میں نے اپنے آپ

کو تباہ کر لیا۔ نشہ اُترنے پر سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ ساری باتیں یاد آنے لگیں کہ کیا کیا بک دیا تھا۔ کئی دن صدمے میں رہا۔ ثمن نے بڑا سنبھالا دیا اور قائل کر لیا کہ اصل خوبصورتی عورت مرد کے اندر ہوتی ہے۔ عورت وہی اچھی دوست جو منافق نہ ہو اور ٹوٹ کر محبت کرے۔ اپنا سب کچھ نچھاور کر دے۔ اُس وقت مجھے اسی طرح کی باتوں نے سہارہ دیا۔ لیکن سچی بات ہے، مینا ساغر میرے دل دماغ سے بالکل بھی نہ نکلی۔ بلکہ جوں جوں وقت گزرتا گیا، وہ میرے حواس پر چھاتی گئی......"

لمحہ بھر کو سعود خاموش ہوا اور چہرے کو ہاتھ سے مسلا۔ آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ دائیں بائیں نظر دوڑا کر دونوں ساتھیوں کو دیکھا۔ بازو پھیلا کر اُن کے کندھوں پر رکھ دیے اور بولنے لگا: "وہ اکتیس دسمبر کی رات تھی۔ دوستوں نے نیو ایئر نائٹ منانے کے لیے دعوت دے رکھی تھی۔ میرا دل نہ مانا۔ ثمن کے اصرار پر بھی اُس کو آنے سے منع کر دیا۔ اپنے گھر میں رہا اور موبائل آف رکھا۔ کمرے میں بند ہو گیا۔ باہر رم جھم لگی ہوئی تھی۔ ہیٹنگ سسٹم نے پورے کمرے کی فضا کو ایسا کوزی کوزی کر دیا کہ جسم پر شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا لباس بھی ناگوار گزرنے لگا۔ پچھلے دو تین گھنٹوں سے جرعہ جرعہ پیے جا رہا تھا۔ نئے سال کا آغاز ہوئے تقریباً دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ شرٹ کے سارے بٹن کھول دیے۔ ناف کے اوپر تک چڑھا ہوا پاجامے کا نیفہ کھلنے لگا۔ اُس لمحے وہم ہوا کہ پیٹ مزید بڑھ جانے سے الاسٹک کھبنے لگا ہے۔ نیفے میں دونوں انگوٹھے ڈالے اور پاجامہ کولھوں کے جوڑ تک نیچے کھسکا دیا۔ بچے کھچے چند گھونٹ ایک ہی بار حلق سے اتار لیے۔ ساغر و مینا خالی ہو گئے۔ ان سے سروکار نہ رہا لیکن مینا ساغر دماغ پر سوار ہو گئی۔ جھونک پہ جھونک آنے لگی۔ اُس دن مجھے تجربہ ہوا کہ خیالی دنیا میں پرواز کیسے ہوا کرتی ہے...... وہ کیا کہتے ہیں، سوچنے کی صلاحیت...... نہیں نہیں۔ ہاں! قوتِ متخیلہ...... قوتِ متخیلہ کتنی تیز ہو جاتی ہے۔ میں نے تصور کر لیا کہ آج

مینا ساغر بھی میرے لیے اُداس ہے۔ یہ تصور لحہ بہ لحہ یقین میں بدلتا گیا کہ وہ بیٹھک میں کھڑکی کے ساتھ لگی بیٹھی ہے، میرے انتظار میں...... کہ میں جاؤں اور تجدیدِ محبت کروں...... گویا میں جاؤں گا اور کھڑکی پر ہلکی سی دستک دیتے ہی سرگوشی سنائی دے گی:
مجھے یقین تھا، تم آ ؤ گے۔ اور وہ دروازہ کھول دے گی۔ مجھے بانہوں میں بھر کر کہے گی:
محبت انمول جذبہ ہے پگلے! یہ روپے پیسے سے نہیں خریدی جاتی۔ ایسی بات کرنا محبت کی توہین ہے۔ ایک لاکھ تو درکنار، کوئی کروڑ روپے میں چُما مانگے، میں اُس کے منہ پر تھوک دوں...... میں تمہاری ہوں۔ جی بھر کے چُمے لے لو......

مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ کیا کرنے جارہا ہوں۔ گلی میں نکل آیا۔ رم جھم لگی ہوئی تھی اور ہُو کا عالم تھا۔ شرٹ کھلی ہونے سے بارش کے قطرے سینے اور پیٹ پر گرنے لگے۔ مزہ آ گیا۔ رُوح تک طراوت اُتر گئی۔ موج مستی کی ایسی لہر آئی کہ مینا ساغر کے گھر کی پہلی سیڑھی چڑھ کر دہلیز پر کھڑا ہوگیا اور باقاعدہ سُر لگا کر گانے لگ گیا:
رم جھم رم جھم پڑے پھوار، تیرا میرا اِت کا پیار...... یہی بول دوسری بار دہرائے تھے کہ اچانک دروازہ کھلا اور چاچا سامنے آ گیا۔ میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر زور سے دھکا دیا۔ میں پلک جھپکتے ہی پیٹھ کے بل نیچے آ رہا۔''

سعود نے ٹانگیں گھٹنوں سے موڑ کر پاؤں میز پر رکھے اور دونوں ہاتھوں سے buttock تھپتھپا کر بولا: ''یہ کُشن موٹے ویز نہ ہوتے تو کولھوں یا ریڑھ کی ہڈی گئی تھی۔ اُس رات موٹاپے نے جان بچائی۔ زمین پر پہلے کُشن لگے، پھر پیٹھ۔ سر بھی ٹکرایا مگر ہلکے سے۔ چاچا پاگل ہوگیا۔ آناً فاناً میرے پائنچے پکڑ کر کھینچ لیے۔ گرنے اور گھسٹنے سے پاجامہ پہلے ہی سُرین کے نیچے تک کھسک آیا تھا، لہٰذا بڑی آسانی سے چاچے کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اُٹھنے کی غرض سے میں نے کروٹ بدلی اور پیٹ کے بل ہو کر ہتھیلیاں زمین پر جمائی ہی تھیں کہ چاچا نے میری شرٹ کو ہاتھ ڈال لیے۔ وہ میرے

پیچھے تھا اور عجیب کھلبلی مچ گئی۔ میری جسمانی قوت بحال نہ ہوئی اور میں اُٹھنے کی کوشش میں قعدہ کی سی حالت میں آیا ہی تھا کہ چاچا نے شرٹ بھی اتار لی۔ ظالم انسان میرا شب خوابی کا پورا لباس لے کر اندر چلا گیا اور دروازہ بند کرلیا۔ البتہ سلیپر قریب ہی پڑے رہ گئے۔ مجھ سے اٹھا نہ گیا اور وہیں لیٹ گیا۔"

لہر میں آ کر سعود سر دُھننے لگا اور بولا۔ "اللہ جانے کیا کیفیت طاری ہوئی اور گانا شروع کردیا: دے گا نہ کوئی سہارہ، اِن بے درد فضاؤں میں، سوجا غم کی چھاؤں میں...... پھوار پڑنا رُک گئی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگ گئے۔ مجھ پر آمد ہونے لگی اور اضافے کے ساتھ یوں گانے لگا: دے گا نہ کوئی سہارہ، اِن بے درد فضاؤں میں، سوجا غم کی چھاؤں میں، یخ سرد ہواؤں میں...... آخرِکار گلی کے لوگوں نے نرم گرم بستر چھوڑے اور باہر آنے لگے۔ ثمن سب سے پہلے دوڑی آئی اور مجھ پر کھیس ڈال کر بھاگ گئی۔ ابا جی کے دیرینہ دوست چچا اقبال اور اُن کے دونوں بیٹے نکل آئے۔ مجھے سہارہ دے کر کھڑا کیا۔ بڑی سے چادر کا تہبند باندھ دیا۔ سر کو گرم شال سے ڈھانپا، جسم کے گرد کھیس لپیٹا اور مجھے ہمراہ لے کر میرے گھر کی طرف چل دیے۔ تب تک گلی جاگ اٹھی تھی اور میرا نشہ بھی اترنے لگا تھا۔ حویلی کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم سنبھلنے لگ گئے۔ اطمینان محسوس ہونے لگا کہ میری اماں یا کوئی بھی ملازمہ ملازم نہیں جاگا۔ ہاتھی دروازے میں تین فٹ چوڑی اور ساڑھے چار فٹ اونچی کھڑکی، جو میں نے باہر آنے کے لیے کھولی تھی، نیم وا ہوئی نظر آئی۔ ساتھ آئے مددگاروں سے اتنا ہی کہہ پایا: میں جی! ٹھیک ہوں، بہت شکریہ۔"

وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ کھانا لگنے میں ابھی چھ سات منٹ کا وقت باقی تھا۔ سعود بول پڑا: "نئے سال کی سحری کے دوران وہ ساری واردات ہوئی تھی، یعنی قلبی واردات...... حادثہ، سانحہ، حماقت...... جو بھی کہہ لو۔ تین چار مہینے یوں ہی گزر گئے۔

بہار کی میٹھی رُت ختم ہونے والی تھی۔ تقریباً دس بجے، میرے موبائل پر چاچی رشیدہ کی کال آئی۔ بہت پہلے میں نے خود چاچی کے موبائل پر اپنا نمبر محفوظ کر کے کہا تھا کہ خدانخواستہ کوئی ایمرجنسی بن جائے یا جو بھی ضرورت پڑے، مجھے کال کر لینا۔ ذہنی حالت کچھ ایسی ہوئی، مطلب ہے شوق اور تجسس بھی۔ چوتھی رِنگ پر فون آن کیا اور کہا: خیریت ہے ناں چاچی جی!!!...... جواب میں اُس کی آواز سنائی دی: سُوہ دی پُتر! امینہ نے تیرا نمبر میرے فون سے غائب کر دیا تھا۔ وہ ابھی ابھی نکلی ہے، میری دوائیاں اور سودا لانے کے لیے۔ تم جلدی سے آ کر ایک بات سن جاؤ......

میں تین منٹ میں چاچی کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے بستر پر لیٹے ہوئے دونوں ہاتھ میری طرف بلند کیے۔ میں سمجھا پیار دینا چاہتی ہے، اس لیے سر جھکا دیا۔ چاچی نے ہتھیلیاں میرے گالوں پر جمائیں اور میرا چہرہ قریب کر لیا۔ ماتھے پر بوسہ دے کر دعائیں دیں اور بتانے لگی: بھلا ہو حسن کا، اُس نے تمہارا نمبر دیا۔ بڑے دنوں سے سوچ رہی تھی کہ کس سے کہوں......

کرسی، بیڈ کے قریب کھینچ کر میں یوں بیٹھ گیا کہ میرے گھٹنے پٹی سے دبنے لگے۔ گردن آگے کی طرف کر کے چاچی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا: آپ حکم کریں، میں حاضر ہوں...... چاچی نے میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور نم ناک آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی: تمہارے چاچے کا کاروبار تباہ ہو گیا ہے۔ اب اس گھر کے کاغذ بھی بینک میں رکھ دیے ہیں، قرضہ لینے کے لیے۔ مجھے اس کی فکر نہیں، جو مرضی ہے کرتا پھرے۔ ڈرتی ہوں، کسی دن اپنے جیسا کوئی مرد پکڑ لایا اور ساتھ مولوی بھی...... تو میں مجبور عورت کیا کر لوں گی، اُٹھ بھی نہیں سکتی......

اتنے میں ہم نے دیکھا کہ امینہ سر پر آن کھڑی ہوئی ہے۔ دوائی کی چھوٹی سی ڈبیا ماں کے تکیے پر پھینک کر بولی: یہ ختم ہوئی تھی، باقی کی پھر لے آؤں گی...... اور سودا

بھی......امی! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔یہی شک ہوا تھا،جس وجہ سے دور نہیں گئی۔اس بندے کو بلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔تجھے کتنی بار بتاؤں کہ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔اس سے نفرت کرتی ہوں۔ابا جو بھی جن بھوت لے آیا، وہ اس سے بہت بہتر انسان ہوگا......

میں خاموش رہا۔چاچی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔دونوں ہاتھ ہوا میں لہرانے لگی اور روتے ہوئے بول پڑی! تم جھوٹ بولتی ہو کہ یہ اچھا نہیں لگتا۔میں ماں ہوں، مجھے اتنی سمجھ ہے۔ابھی اس کے ساتھ کچہری چلی جاؤ اور بیان دے کے شادی کرلو...... مجھے کسی ادارے میں داخل کرا دینا، جہاں معذوروں کی فی سبیل اللہ مدد کی جاتی ہے۔اللہ کے واسطے فضول ضد چھوڑ دو۔اسی لیے مجھے موت بھی نہیں آرہی......

چاچی اونچی آواز میں رونے لگ گئی۔مینا ساغر نے آنکھیں پونچھتے ہوئے مجھے دیکھا اور کہا:تم کیوں آئے ہو؟...... میں نے جواب دیا: میں آیا نہیں، بلایا گیا ہوں۔ایک بات تم بھی پلے باندھ لو، کہ آج نہیں تو دس سال بعد وہی ہوگا، جو چاچی کی مرضی ہے۔میں نے اسی لیے پورے خاندان کا دباؤ قبول نہیں کیا۔شادی صرف تم سے کروں گا۔اب تو چاچی بھی میرے ساتھ ہے۔باقی جو میرے مولا کو منظور......

میں نے چاچی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا: کوئی فکر نہ کرو۔چاچا جو بھی جن بُھوت لے کر آیا، گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔میں نے آج تک اپنے بڑوں والا طریقہ نہیں آزمایا، اس لیے کہ دل کے سودے میں زور زبردستی نہیں چلتی......

چاچی کا ہاتھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا: ابھی اصطبل جا رہا ہوں۔جھانا چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی لگا دے گا۔جب بھی چاچے کے ساتھ کوئی اجنبی دیکھا، اُس کے ہاتھ پاؤں سلامت نہیں رہیں گے...... چاچی نے ہاتھ اٹھا کر میری صحت تندرستی لمبی عمر

اور عزت وقار دولت میں اضافے کی دعائیں دیں......

میرے قدم ڈیوڑھی کی طرف اٹھتے ہی مینا ساغر ساتھ چل پڑی اور بولتی گئی:
آخر تم اپنی خاندانی اصلیت دکھانے پر آ ہی گئے، رئیسوں والی......کیا کر لو گے؟ کب تک انتظار کرو گے؟؟...... میں صحن کے وسط میں رُک گیا۔اُس کی طرف رُخ کر کے دھیمی آواز میں بولا: دس سال بیس سال تیس سال۔جب چاچی سو سال کی ہو جائے گی،تب تک......تم پچاس سال کی عمر میں بھی میرے لیے وہی مینا ساغر رہو گی، جو شروع سے ہو......اور آج بھی۔انتظار تمہارا مسئلہ ہے، میں گزارہ چلا رہا ہوں......

اُس کے چہرے سے جھلکتی خفگی کی لہر جھینپ میں بدل گئی۔خدا جانے کیا سوچ کر بول گئی: اپنا جسم تو دیکھو،خاک گزارہ چلا رہے ہو گے......تم جیسی فاحشائیں مال بنا رہی ہوں گی......وہ اچانک ٹھٹھک گئی۔گویا خیال آیا ہو کہ یہ کیا بک دیا۔فوراً پینترا بدل کر کہا: میری بلا سے، جو مرضی ہے کرو...... ذرا ٹھہرو، اپنا سلیپنگ سُوٹ لیتے جاؤ......

میں نے اُس کو کلائی سے پکڑ کر روک لیا اور کہا: خدا جب حُسن دیتا ہے،نزاکت آ ہی جاتی ہے۔exactly......یعنی کہ اسی طرح......خدا جب موٹاپا دیتا ہے تو طریقہ آ ہی جاتا ہے......مارے شرم کے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔کلائی چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی: میرا یہ مطلب نہیں تھا،جو تم سمجھے ہو......

میں نے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا: بھلا میں کیا سمجھا ہوں؟ بوجھو تو جانوں......وہ مزید کھسیانی ہو کر کلائی چھڑانے کے لیے زور لگانے لگی۔میں نے ہاتھ کی گرفت کھول دی اور کہا: مال ضائع ہونے کا غم ہے تو ماں کی بات مان لو۔وہ مال تیرا ہے یا تیری اولاد کا۔جتنی دیر کرو گی،نقصان ہوتا چلا جائے گا......

ایک قدم پیچھے ہٹ کر اُس نے میرے پیٹ پر مُکا مار دیا اور غصے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے غرائی: خواب ہی دیکھتے رہو گے۔کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے تم سے نفرت

ہے...... میں نے جھٹ بول دیا: ابھی چاچی نے کیا کہا تھا؟...... کہ تم جھوٹ بولتی ہو...... وہ بولی: اماں نہ ہوئی ولی اللہ ہو گئی جو دلوں کے حال جاننے لگی ہے۔ میں نے تُرت جواب دیا: اولاد کے معاملے میں ماں سے بڑی ولیہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ میرا سارے خاندان نے گھیراؤ کر کے شادی پر مجبور کرنا شروع کر دیا تو اماں کچھ دیر تک غور سے میرا چہرہ پڑھتی رہیں۔ ماموں جان سے بولیں: بھائی جان! چھوڑیں اسے، نہ سر کھپائیں اپنا۔ کبھی نہیں مانے گا۔ اس کو اپنی مرضی کر لینے دیں...... آپ کو پتا بھی ہے اس کی ضدی طبیعت کا......

اُس نے ہاتھ جھٹک کر کہا: فضول باتیں نہ کرو۔ رکو، میں تمہارا سلیپنگ سُوٹ لے آؤں...... شرم تو نہ آئی ہو گی۔ اتنے بڑے خاندان کا بیٹا، گلی میں ننگ دھڑنگ پڑا رہا۔ کوئی غیرت والا جوان ہوتا تو شہر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا جاتا۔ میں نے فوراً بول دیا: سچے عاشق کا شیوہ نہیں کہ غیرت کے نام پر ہار مان جائے۔ جب عشق کیا تو غیرت گیا۔ وہ تو گھپ اندھیری رات تھی، کبھی دن دیہاڑے بھی ننگ دھڑنگ ہونا پڑا تو پھر کیا...... تم ہمیشہ اپنے عاشق صادق کو ثابت قدم پاؤ گی، میری مینا ساغر!

مینا ساغر نے مٹھیاں بھینچ لیں اور دانت کچکچاتے ہوئے بولی: ''کس مصیبت سے پالا پڑ گیا۔ مجھے سُوٹ لانے دو اور جاؤ...... میں نے بڑے دھیمے سے، اپنائیت بھرے لہجے میں کہا: اُس کو دھو کر استری کر کے سنبھال دو۔ چاچا سے جہیز میں ایک پائی کی چیز مجھ پر حرام ہے۔ تم باپ کے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے صرف وہی کپڑے ساتھ رکھ لینا۔ میں شب خوابی کے اُسی لباس میں اپنی دُلھن کے ساتھ ہم خواب ہونے کی تمنا رکھتا ہوں...... اُس نے آنکھیں میچ لیں اور اُنہی قدموں پر گھوم کر چل دی۔''

کھانے کے لیے تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ زاہدی بول پڑا: ''سعود بھائی! اصطبل بھی ابھی تک رکھا ہوا ہے...... کہاں پر؟...... سعود کہنے لگا: ''بھئی نام کا ہی اصطبل

ہے۔گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی سیدھے ہاتھ پر احاطہ ہے۔کبھی بڑا وسیع ہوا کرتا تھا،اب پورا سا رہ گیا ہے۔صرف اپنی گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔شیڈ اور ملازموں کے کمرے ہیں۔کسی زمانے میں گھوڑے ہوا کرتے تھے اور تانگہ بگھی وغیرہ......"

o

پیراڈائز ہاؤسنگ لمیٹڈ کے ہیڈ آفس میں متاثرین کا پانچ رکنی وفد، ایاز احمد اور سعید کی سربراہی میں مذاکرات کی غرض سے آیا بیٹھا تھا۔ایم ڈی،سعود نے دونوں ڈائریکٹروں،شاہد اور زاہد کے ہمراہ استقبالیہ میں آ کر خیر مقدمی کلمات ادا کیے اور سب کو لے کر میٹنگ روم میں جا بیٹھے۔سعود کی فطری بے تکلفی اور سادہ مزاجی رنگ جمانے لگی۔ایاز اور سعید کے علاوہ باقی تینوں ارکان پہلی بار پیراڈائز انتظامیہ سے براہِ راست ہونے والی بات چیت میں شریک ہوئے تھے۔شروع میں کھچے کھچے سے بیٹھے رہے۔اُن کے ذہن میں گردش کرتے خدشات،کشیدگی کی صورت میں چہروں سے عیاں تھے۔لیکن سعود کے بغیر کسی لگی لپٹی کھلی ڈھلی گفتگو کرنے سے ماحول خوش گوار ہو گیا۔ وفد کے تمام ارکان یوں محسوس کرنے لگے جیسے سعود سے پرانی شناسائی ہے۔

بجائے اِس کے کہ متاثرین،ملک میں پائی جانے والی عدم اعتماد کی فضا کا حوالہ دے کر عوام کے ساتھ آئے روز ہونے والے نئے سے نئے فراڈ کا ذکر چھیڑتے، سعود نے خود ہی اِس موضوع پر بات شروع کر دی۔کہنے لگا:"تمام ممبران،جنہوں نے اپنی چھت کا خواب پورا کرنے کی غرض سے زندگی بھر کی جمع پونجی داؤ پر لگائی،لیکن اُمیدیں خاک میں مل گئیں،وہ اگر یہ کہتے ہیں کہ اُن کے ساتھ فراڈ ہوا ہے تو بات غلط بھی نہیں۔اِس لیے کہ ہمارے ملک میں روزِ اوّل سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔سڑک کے کنارے مداری کا تماشا بھی علاقے کی پولیس کو پیشگی نذرانہ دیے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔مردانہ قوت کی جعلی دوائیاں بیچنے والا تخمینے کے مطابق متوقع کمائی کا نصف

سرکاری اہلکاروں کو ادا کر کے مجمع لگاتا ہے۔ جن ریاستوں میں روٹی سے مجبور عورت اپنی جسم فروشی کی کمائی سے بھی حکومتی تنخواہ داروں کو بھتہ دینے پر مجبور ہو، وہاں کوئی بڑا فراڈ اعلیٰ حکام کی سرپرستی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ پیراڈائز ہاؤسنگ صرف اس لیے بنائی گئی تھی کہ صفِ اول کے کچھ افسروں کو اولاد کی بیرونِ ملک تعلیم اور عیاشیوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پانچ چھ ارب روپے کی خطیر رقم درکار تھی۔ سیدھی بات کرتا ہوں، وہ یہ کہ آپ لوگوں کی کمائی لوٹنے کی غرض سے......"

وفد میں آنے والے تینوں نئے ارکان کے رنگ فق ہو گئے۔ ایاز نے سعود کی بات قطع کر دی۔ اس کا اپنا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بول پڑا: "ڈرائیں نہیں سر! سعید صاحب اور مجھ پر پہلے ہی کھلے لفظوں میں عدم اعتماد کا اظہار کیا جانے لگا ہے کہ ہم دونوں آپ سے مالِ غنیمت میں حصہ بٹور کر ساتھی متاثرین کے مفادات کا سودا کر لیں گے۔ کوئی ٹھوس لائحہ عمل وضع کریں۔ ہمیں اعتماد میں لیں تاکہ سب کی تشفی ہو سکے اور وہ صبر سے انتظار کریں۔"

سعید احمد بول پڑا: "ہم نے اپنی اوقات سے زیادہ بوجھ اٹھا لیا ہے۔ جو صورتِ حال آپ نے بیان کی ہے، اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ جہاں حکمران ہی کرپٹ ہوں وہاں خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ بیوروکریسی اور سیاسی قیادتوں کا گٹھ جوڑ ہے۔ میں نے تیس سال سرکاری ملازمت کی ہے۔ سب جانتا ہوں۔ ہر کوئی یہاں سے مال سمیٹ کر غیر ملکوں میں اثاثے بنا رہا ہے۔ یہ ملک صرف ان لٹیروں کی شکارگاہ ہے۔ یہاں اگر دو سو ارب کا کوئی عوامی منصوبہ بنتا ہے تو صرف اس لیے کہ متعلقہ حکمران کو کسی دوسرے ملک میں اپنے ذاتی منصوبے کی تکمیل کے لیے سو ارب کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں عوام کی جان و مال اور مفادات کے تحفظ اور فلاح و بہبود کے عزم سے حکومتیں بنتی ہیں۔ یہاں اُلٹ حساب ہے۔ جو ادارہ جس مقصد کے لیے قائم کیا

جاتا ہے، وہ اُلٹا اس مقصد کو سبوتاژ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ صرف ایک مثال سن لیں۔ میرا قریبی عزیز، جنگلی حیات کی بقا کے لیے قائم ادارے میں ذمہ دار پوسٹ پر تعینات ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ سرکاری جیپ اور وسائل کو استعمال میں لا کر دوستوں اور اہلِ ثروت شکاریوں کو اپنی نگرانی میں شکار کرواتا ہے......''

''اصل بات کی طرف آتا ہوں، خواہ مخواہ کی تمہید باندھی......'' سعود نے ٹوک دیا اور کہا: ''کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں اُنکلوں کے فریب میں آ گیا۔ سیدھا سادھا بندہ ہوں۔ اربوں کی آبائی جائیداد ہے اور لاکھوں کی ماہانہ آمدنی۔ مجھے فراڈ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر یہ کہ میرا سب کچھ اسی مُلک میں ہے۔ بال بچہ ہے ہی نہیں۔ والدہ محترمہ کو اپنے والد مرحوم کے ترکہ سے معقول حصہ ملا ہوا ہے۔ میرا ایک ہی مسئلہ ہے کہ میں بائی نیچر ضدی انسان ہوں۔ جو کام کرنے کی ٹھان لوں، اس سے پیچھے ہٹنا میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے چین ہی نہیں آتا۔ یہ میں نے اپنی اَنا اور ضد کا مسئلہ بنالیا ہے کہ مجھے جس فراڈ میں آلۂ کار بنایا گیا، میں اس منصوبے کو حقیقت میں بدل کر دم لوں گا۔ بندے کی نیت نیک ہو تو قدرت بھی مہربان ہو جاتی ہے۔ جب سے کچھ منظم اداروں نے کھوکھلے ریاستی ڈھانچے کو بکھرنے سے بچانے کا بیڑا اٹھایا ہے، حالات بہتر ہونے لگے ہیں۔ تفتیش کی آڑ میں ہماری بوٹیاں نوچنے کا عمل رُک گیا ہے۔ جن انکلوں نے ٹھگی کی، وہی اب پیغام بھیج رہے ہیں کہ مناسب نرخوں پر مزید رقبہ خریدنے میں اپنا پورا اثر ورسوخ استعمال کریں گے۔ مجھے اُن کے تعاون کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ میرے ذاتی خاندانی مراسم ہیں۔ علاقے کا پٹوار خانہ پوری تندہی سے کام کر رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو مہینوں میں منصوبے کے مطابق زمین کی خریداری مکمل ہوتے ہی ترقیاتی کام شروع ہو جائے گا۔''

وفد کے ارکان نے اطمینان کا سانس لیا۔ سعود نے اپنے دونوں ساتھیوں کی

طرف اشارہ کر کے کہا: ''کمپنی کے ڈائریکٹر صاحبان آپ دوستوں سے رابطے میں رہیں گے۔ اگلے مہینے کے آخری اتوار کے روز سائیٹ پر تمام ممبران کو اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ جن کے پاس اپنی سواری نہیں، انھیں لے جانا اور واپس لانا ہمارے ذمے۔ وہاں تمام خواتین و حضرات کو اُس وقت تک کی مکمل پیش رفت سے آگاہ کیا جائے گا، دستاویزی ثبوت کے ساتھ۔ عصرانہ دیں گے۔ اس کے باوجود جتنے ممبران ذاتی وجوہات کی بنا پر ریفنڈ لینا چاہیں، انھیں تین یا زیادہ سے زیادہ پانچ ماہ کے post dated چیک جاری کر دیے جائیں گے...... موقع پر نہیں، چونکہ یہ کام وقت طلب ہے، لہٰذا ہیڈ آفس میں مرحلہ وار کیا جائے گا۔''

مہمانوں کے دل اطمینان سے بھر گئے اور رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ سعود اٹھ کھڑا ہوا۔ سب نے تقلید کی۔ اُس نے ایک عام ڈیرے دار یار باش کی طرح پانچوں کو باری باری گلے لگایا اور بولا: ''جاتے جاتے ایک اور بات...... وہ یہ کہ میں ضدی ہی نہیں، عاشق بھی ہوں۔ یہ ہاؤسنگ پراجیکٹ میری ضد کے ساتھ ساتھ میرا عشق بھی بن گیا ہے......'' مسکرا کر ذرا توقف سے بولا: ''لیکن یہ عشق نمبر ٹو ہے...... بہرحال عشق کا نمبر کوئی بھی ہو، عشق ہی ہوتا ہے۔''

o

نو سال، تین چار ماہ کا عرصہ ہونے کو آیا، جب چاچی رشیدہ کی فون کال سن کر سعود اُس کے گھر گیا تھا۔ اسی دوران وہ زیادہ بے راہ روی کا شکار ہوا اور ممی ڈیڈی کلاس سے روابط قائم ہونے پر بُرے تجربے سے گزرا۔ کمپنی بنی، پبلک سے فراڈ ہوا۔ مصائب کے انبار کھڑے ہوئے اور رفتہ رفتہ حالات کو سنبھالا دینے میں کامیاب ہو گیا۔ چاچی سے دوبارہ رابطہ کرنا محال ہو گیا۔ اس نے جب بھی فون کیا، آگے سے بند کر دیا گیا۔ ایک دن چاچی کی بجائے مینا ساغر نے جواب میں اتنا ہی کہا: کیوں ہلکان ہوتے

ہو۔میں نے اُسی روز ای کا موبائل تبدیل کر دیا تھا۔تم اپنے مشاغل جاری رکھو۔ہمیں پریشان نہ کرو۔آئندہ تمہاری کال نہیں سنوں گی۔

سعود نے بولنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ مینا ساغر نے فون بند کر دیا۔اس نے ایس ایم ایس کے ذریعے بوسوں کی برسات کر دی۔زیادہ دیر تک صبر نہ کر سکا اور دوبارہ کال ملائی لیکن جواب ملا: اس نمبر پر بات نہیں ہو سکتی۔نئی کلاس سے دوستیوں کے نتیجے میں لمبے بکھیڑے گلے پڑ گئے۔اس کی مصروفیات اور مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا لیکن گھبرایا نہیں۔معاملات کو اپنے انداز سے سلجھانے میں لگا رہا۔اس کے ساتھ ساتھ جب بھی موقع ہاتھ آیا، چاچی رشیدہ کو ضرور ملا۔شروع کی ملاقاتوں میں وہ جذباتی ہو جاتی اور کہہ دیتی: ''اس لڑکی کو اٹھا کر لے جاؤ اور نکاح پڑھا لو۔تمہارا کوئی کیا بگاڑ لے گا؟'' مینا ساغر سامنے آنے کی بجائے کسی کونے میں چھپ جاتی۔گویا اُس نے قطع تعلق کر رکھا تھا۔وہ اپنی ماں سے بھی نہ اُلجھتی۔رفتہ رفتہ بوڑھی معذور عورت نے حالات سے سمجھوتا کر لیا اور سعود سے اپنا مطالبہ بھی نہ دہراتی۔وہ خاموش ہو گئی۔اس کے جانے پر یہی کہہ کر چپ ہو جاتی: ''ہم سب تقدیر کے لکھے ہوئے کو بھگت رہے ہیں۔''

سرفراز نے کاروبار کو وسعت دینے کی غرض سے قرض لیا لیکن اس دلدل میں ایسا اُترا کہ نکل نہ پایا اور آخر کار آبائی جائیداد سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔یہ حسنِ اتفاق تھا یا بقول رشیدہ کے واقعی تقدیر کا لکھا ہوا کہ متلون مزاج شخص کرائے کے جس مکان میں اٹھ آیا، وہ اُسی کمرشل کی عقبی آبادی میں تھا، جس کے ایک پلازے کے پورے فلور پر پیراڈائز ہاؤسنگ کا ہیڈ آفس قائم تھا۔

○

ریاست بظاہر استحکام پذیر ہوتی دکھائی پڑنے لگی۔سرکاری اداروں میں گرم، کرپشن کا بازار بھی ٹھنڈا پڑتا نظر آنے لگا اور دکھاوے کے لیے ہی سہی، تھوڑے

بہت کام میرٹ پر ہونے لگے۔دیدہ دلیری سے کھلے عام لوٹ مار کا سلسلہ رُک گیا،جیسے چھوٹے بڑے حکومتی کارپرداز وقتی طور پر محتاط ہو گئے ہوں۔ریاست کے مستقبل سے مایوس عوام کی اُمیدیں بندھ گئیں اور وہ پُر اعتماد ہو گئے۔

بوبی نے وطن واپسی پر شہدی سے علیحدگی میں ملاقات کر کے کہا:"جو ہوا،سو ہوا۔لیکن اب ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ایک بات تم اور تمہارا سعود بھائی پلّے باندھ لے کہ ملکی سطح کی بڑی سے بڑی شخصیت پر بھی کرپشن اور غبن کے الزامات لگتے رہتے ہیں......محض الزام،مگر ثبوت کسی کے پاس نہیں ہوتا،اس لیے کہ پسِ پردہ لین دین کی رسید جاری نہیں کی جاتی۔" اُس نے ہنس کر کہا:"اِس ملک میں وکیل قانونی طور پر مقدمہ کی پیروی کرتے ہوئے بھی فیس کی رسید نہیں دیتا......ویسے بھی ادنیٰ سے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز اہل کار یا افسر کی رشوت،وکیل کی فیس اور کسبی کی خرچی رسید کا مطالبہ کیے بغیر پیشگی ادا کرنا پڑتی ہے۔یہی دستور ہے......کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فضول پراپیگنڈہ کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور اُلٹا تعاون سے بھی محروم رہو گے۔"

شہدی کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور بوبی کو چلتا کرتے ہوئے کہہ دیا کہ ڈیڈی یا کسی بھی انکل کے تعاون کی محتاجی نہیں رہی۔سعود بھائی کا خاندانی اثر ورسوخ کام آیا ہے اور وہ بڑے احسن طریقے سے معاملات کو سلجھا رہے ہیں۔نہ ہی اُن کا ارادہ ہے کہ کسی کے کالے کرتوتوں کو منظرِ عام پر لایا جائے۔

بوبی کے علاوہ سوئو بھی چھٹیاں گزارنے وطن واپس آئی ہوئی تھی۔اُس کے پاپا نے بھی لمبا ہاتھ مارا تھا۔وہ براہِ راست سعود سے ملنے آ گئی۔شہدی اور زاہدی پہلے سے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔سوئو ان دونوں کو کئی دوسری ساتھی لڑکیوں کی تقلید میں شیڈی اور زیڈی کے ناموں سے پکارا کرتی تھی۔خوب چہک کر ان کو بھی"ہائے" کہا اور ہاتھ ملایا لیکن انھوں نے سردمہری کا رویہ اختیار کیے رکھا۔

سونو نے بتایا کہ اس کے پاپا اِن دنوں کچھ پریشان ہیں۔ اس موقع پر ذرا سی بات اُن کو مصیبت میں ڈال سکتی ہے۔ سونو اور بوبی کو ایک ہی انداز میں "یار" کا لفظ خوب لمبا کھینچ کر بولنے کی عادت تھی۔ بڑی بے تکلف ہو کر سعود سے مخاطب ہوئی:
"ٹیک کیئر یااار! آفٹر آل ووئی آر ویری کلوز فرینڈز اینڈ انجوائیڈ سو مچ...... ریممبر دوز مومنٹس یااار...... ووئی آر اولڈ فرینڈز...... ڈونٹ فارگیٹ۔" شہدی اور زاہدی کی طرف ایک نظر دیکھ کر کہا: ہم سب برابر کے دوست ہیں یااار!!!"

سعود کے پاس اوقاتِ کار میں کرنے اور دیکھنے کو بہت زیادہ کام ہوا کرتا تھا۔ دونوں ساتھیوں اور متعلقہ عملے کے ہمراہ بہت دیر تک دفتر میں بیٹھنا پڑتا۔ سونو کی تقریر لمبی ہوتی گئی اور اس نے بڑے بھونڈے انداز میں کئی بار ماضی کی مشترکہ enjoyment کا حوالہ دے ڈالا۔ فطرتاً بامروت انسان ہوتے ہوئے بھی سعود کو سونو کی جانب سے بار بار گزشتہ دور کی enjoyment کا تذکرہ کرنا اچھا نہ لگا۔ اور وہ رعونت آمیز رویہ یاد آ گیا، جو مطلب نکلنے کے بعد سونو اور اس کے پاپا نے روا رکھا تھا۔ آخر کار سونو سے مخاطب ہو کر بول پڑا: "تم نے انجوائے کیا تھا تو ٹھیک ہے، اچھا ہو گیا۔ میں نے نہیں...... اب اس قصے کو چھوڑ دو۔ میری طرف سے اطمینان رکھو۔ اگر تمہارے پاپا خود ہی مکافات کو پہنچ گئے تو مجھ سے تمہارا گلہ شکوہ کرنا بلا جواز ہوگا......"

زاہدی اور شہدی لاتعلق سے ہوئے ناک بھوں چڑھائے بیٹھے تھے۔ سعود کے جواب پر اُن کے چہرے کھل اٹھے۔ وہ اب عرصہ سے سعود کے ساتھ دلی لگاؤ ہونے کے باوجود اسی طرح برتاؤ کرتے جیسے کمپنی کے ڈائریکٹروں کا رویہ اپنے ایم ڈی سے ہونا چاہیے۔ پروٹوکول کے مروجہ اصولوں کا بھی خیال رکھتے۔ اس موقع پر زاہدی اپنے جذبات قابو میں نہ رکھ سکا اور بول پڑا: "اُف! فائیو ہنڈرڈ ملین میں ون سائیڈڈ انجوائے منٹ......" شہدی نے جھٹ لقمہ دے ڈالا: "ہاریبل!!!"

سونو برہمی سے قدرے بلند آواز میں چلائی: ''شٹ اَپ یُو بوتھ، شیڈی اینڈ زیڈی!'' شہدی نے نتھنے پُھلاتے ہوئے سرد لہجے میں کہا: ''بگٹ لاسٹ۔'' سعود نے ہاتھ کے ہلکے اشارے سے ساتھیوں کو خاموش کر دیا۔ سونو اٹھ کھڑی ہوئی۔ شہدی زاہدی کو یکسر نظرانداز کر دیا۔ سعود کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: ''تھینکس اے لاٹ فار یور کومٹ منٹ۔'' اور وہ آفس سے نکل گئی۔

o

زمین کی خریداری مکمل ہوتے ہی ترقیاتی کام زور شور سے ہونے لگا۔ چند مہینوں میں معاملات اپنے ڈھب پر آ گئے۔ فیز ون میں چند مکانات کی تعمیر بھی شروع ہو گئی۔ جس منصوبے نے عوام کے ساتھ ہونے والے بہت بڑے فراڈ کے طور پر شہرت پائی اور سعود کی بدنامی کا باعث بنا، وہ حقیقت میں بدل گیا۔ سعود کے کندھوں سے بہت بڑا بوجھ اُتر جانے سے وہ خوش رہنے لگا۔ اُس نے تمام تر مصروفیات کے باوجود مینا ساغر کے بارے میں خبر رکھی ہوئی تھی۔

سرفراز کے مسائل کم ہونے کی بجائے مزید پیچیدہ ہوتے گئے۔ اُس شخص نے مجموعی طور پر خوش حالی کی زندگی بسر کی تھی اور اچھے آرام دہ ذاتی گھر میں رہنے کا عادی تھا۔ کرائے کی رہائش میں سو طرح کی قباحتیں درپیش آنے سے مزاج میں زیادہ تلخی بھر گئی۔ مالک مکان کے اہل وعیال رات کو دیر تک جاگتے اور اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے۔ اوپر کوئی نہ کوئی کھٹکا ہوتا ہی رہتا۔ کاروباری اور گھریلو پریشانیوں سے عاجز آئے ہوئے شخص کے مزاج کی برہمی دن بدن بڑھنے لگی۔ شروع میں مالک مکان خالد احمد سے کئی بار بڑی نرمی سے شکایت کی کہ اوپر رات کے اوقات میں بار بار دروازے کھلنے، زور سے بند ہونے اور بھاری سامان کو اِدھر اُدھر گھسیٹنے سے نیند پوری نہیں ہوتی اور بیمار بیوی کے آرام میں بھی خلل آتا ہے۔

خالد کا رویہ عموماً طور پر دوستانہ رہا۔ وہ انکساری سے وضاحت کرنے لگتا کہ بڑی بیٹیاں یونیورسٹی کی طالبات ہیں، لہٰذا رات کو دیر تک پڑھائی کرنا اُن کی مجبوری ہے۔ تاہم جہاں تک ممکن ہو سکا، آئندہ احتیاط کریں گی۔

مکان میں پائپ لائنوں کی تنصیب کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ اوپر کے غسل خانے استعمال ہونے پر نیچے کی دیوار میں گڑگڑاہٹ ہونے لگتی۔ سرفراز کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی اور بات گِلہ گزاری سے تلخ کلامی تک جا پہنچی۔ خالد نے عذر پیش کیا کہ اُس نے بیٹیوں کی شادی کی غرض سے مکان فروخت کرنا ہے، اس لیے جلد سے جلد رہائش کا کہیں اور بندوبست کرلیں۔ اپنے سر نئی سے نئی آفت لینے میں اس منفرد شخص نے کب دریغ کیا ہوگا۔ خم ٹھونک کر مقابلے پر اتر آیا اور کہا! مکان کرائے پر دینے سے پہلے سوچنا تھا کہ بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں۔

خالد، فطرتاً صلح دوست ہوتے ہوئے بھی ضبط نہ کر پایا اور بولا: ''آپ اپنی فکر کریں، مجھے تو پھر بھی وقت پر خیال آ گیا۔'' سرفراز نے کبھی نہ سوچا کہ وہ ساٹھ سال کا بوڑھا ہے۔ بے خطر بھڑ جایا کرتا۔ خصوصاً مالک مکان نے اس کی دُکھتی رگ کو چھیڑا تھا۔ انجام کی پرواہ نہ کی اور اُس کے گلے پڑ گیا۔ خالد نے دوڑ کر جان بچائی۔

سعود کے ایما پر شہدی نے بڑی ہوشیاری سے خالد احمد کے ساتھ واقفیت پیدا کررکھی تھی۔ وہ چند ماہ بعد سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے والا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت اُس کو ریٹائرمنٹ کے بعد کمپنی میں مناسب تنخواہ پر سروس کی پیشکش کردی، جو اس عیال دار شخص کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ کام کی نوعیت کو سمجھنے کی غرض سے ہر روز ہیڈ آفس آ جایا کرتا۔ قبل از ریٹائرمنٹ چھٹیاں شروع ہونے پر رضاکارانہ زیادہ وقت دفتر میں گزارنے لگا۔ ایم ڈی کے ساتھ مصلحتاً اُس کی ملاقات نہ کرائی گئی۔ شہدی نے باتوں باتوں میں اُس سے کافی معلومات حاصل کرلیں۔ وہ تینوں

بیٹیوں کی ایک ساتھ شادی کرنے کا پروگرام بنائے ہوئے تھا۔ کہنے لگا: ''ہم میاں بیوی نے صلاح مشورے سے طے کرلیا ہے کہ ہمارا مکان چونکہ بہتر لوکیشن پر ہے لہٰذا ستر اور اسی لاکھ کے درمیان آسانی سے بک جائے گا۔ اسی لوکیلٹی میں ذرا ہٹ کر قدرے چھوٹا مکان پچاس لاکھ روپے میں خرید لیں گے۔ کچھ رقم ریٹائرمنٹ پر ملی ہے۔ بیٹیوں کے فرض سے فارغ ہونے پر بھی معقول رقم بچ رہے گی، جس سے دونوں بیٹوں کی اعلیٰ تعلیم کا خواب بآسانی پورا ہو جائے گا۔''

فراغت کے لمحات میں سعود اپنی نئی سفید لینڈ کروزر وی ٹو میں اکیلا نکل جایا کرتا۔ اُس کی کوشش ہوتی کہ چاچا اور مینا ساغر کی مصروفیات کے بارے میں کچھ جان پائے۔ خود مشاہدہ کرسکے لیکن سامنے نہ آئے۔ اِس کے علم میں تھا کہ شریف النفس انسان خالد احمد اپنے کرایہ دار کی ہٹ دھرمی پر سخت پریشان ہے۔ بقول اس کے، بیٹیوں کا باپ ہونے کے ناتے، خوب سوچ سمجھ کر اپنی دانست میں بہترین کرایہ دار کا انتخاب کیا تھا لیکن اُلٹی بلا گلے پڑ گئی۔ اب عالم یہ ہے کہ اپنے ہی گھر میں خوف زدہ ہوا رہتا ہوں۔ اپنے ملک کے تھانے کچہری سے اللہ ہر شریف انسان کو محفوظ رکھے۔ ایک ہی راستہ نظر آتا ہے کہ پانچ دس لاکھ روپے کا نقصان برداشت کرلوں اور کسی زورآور سے مکان کا سودا کر کے جان چھڑاؤں۔

سعود نے کئی روز کے گہرے غور و فکر کے بعد مینا ساغر سے ملنے کا منصوبہ بنالیا۔ آخرِکار مناسب موقع ہاتھ آ گیا۔ جوں ہی وہ میڈیکل اسٹور میں داخل ہوئی۔ اِس نے فاصلے پر چند منٹ تک گاڑی روکے رکھی اور پھر بڑے اعتماد سے آگے بڑھا کر عین دروازے کے سامنے کھڑی کردی۔ فوراً باہر نکلا اور تیزی سے دُکان کے اندر چلا گیا۔ وہ دوائیاں خرید کر بل کی ادائیگی سے ابھی فارغ ہوئی ہی تھی کہ سعود سر پر جا کھڑا ہوا اور قدرے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا: ''مجھے فون کر کے کیوں نہیں بتایا، جب پتا بھی

ہے کہ وقت پر دوا نہ ملنے سے اماں کی حالت خراب ہونے لگتی ہے......اب جلدی کرو......'' دوائیوں کا لفافہ خود کونٹر سے اٹھالیا اور کہا: ''آئندہ لاپرواہی نہ ہو۔''

امینہ بوکھلائی ہوئی ساتھ ساتھ چل دی۔ کچھ نہ سمجھ پائی کہ کیا ردِعمل اختیار کرے۔ سعود نے اُس کے لیے لینڈ کروزر کا اگلا دروازہ کھولا۔ وہ روبوٹ کی طرح فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سعود نے عجلت میں دروازہ بند کیا اور اسی پھرتی سے لپک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ مارکیٹ سے گاڑی نکالتے ہوئے تیزی دکھائی مگر سڑک پر آکر آہستہ ہوگیا۔ مسکرا کر اُس کو دیکھا اور بولا: ''بہت شکریہ۔ کوئی بدمزگی نہ ہوئی۔ تمہارا یہ احسان مجھ پر اُدھار رہا......'' وہ بدستور خاموش بیٹھی سکرین کے پار دیکھے گئی۔

گورنمنٹ ہائی اسکول میں چھٹی ہو جانے کے بعد چاردیواری کے ساتھ پارکنگ کے لیے مخصوص جگہ خالی پڑی دیکھ کر سعود نے گاڑی کھڑی کر دی اور مینا ساغر کی طرف رُخ کر کے بولا: ''میں تیری صورت دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ اس سے زیادہ جدائی برداشت کرنا میرے بس میں نہیں رہا۔ میں بہت ہی قابلِ عمل تجویز لے کر آیا ہوں۔ تم صرف توجہ سے سن لو۔ چند دن خوب غور کرو۔ اور......''

''میں نے کچھ نہیں سننا۔ آج تم نے ایک طرح سے مجھے اغوا کیا ہے۔ اگر میں نے عقل سے کام نہ لیا ہوتا تو مارکیٹ میں تماشا لگ جاتا۔ جس دکان سے مہینے میں ایک دوبار دوائیاں لینے پیدل جایا کرتی ہوں، وہاں اس طرح کی گاڑی والا بندہ مجھ پر دعویٰ جمانے لگ جائے...... تم کیا سمجھتے ہو، لوگ سارے پاگل ہوتے ہیں؟...... میں اب وہاں آئندہ جانے کا حوصلہ ہی نہیں کر پاؤں گی۔ تم نے مجھے سرِعام بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی......'' مینا ساغر نے یہ سب کہہ کر گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ کھلا۔

سعود نے کہا: ''دروازہ نہیں کھلے گا۔ مجھے تم پر فخر ہے کہ تم بہت سمجھدار ہو۔ باہر

سے گاڑی کے اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا اور سکرین کے سامنے دیوار ہے۔آواز بھی باہر نہیں جاتی۔جو بات کرنے آیا ہوں، وہ سن لو۔اور یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں بدنام کروں گا۔اماں کے بعد میرے لیے دنیا میں سب سے اہم اور محترم ہستی تم ہو۔میرے بچوں کی جنت تیرے قدموں تلے ہے۔اگر انسان پر اپنی ماں کی عزت کرنا فرض ہے تو اپنی اولاد کی ماں کے وقار کی حفاظت بھی واجب ہے......میں اللہ کے فضل سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔انشاءاللہ ہم دونوں کو اولاد کی نعمت سے ضرور نوازے گا۔"

مینا ساغر نے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا۔آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قدرے اُونچی آواز میں آہ وزاری کے سے انداز میں بولی: "میں کب تیرے بچوں کی ماں بن گئی؟ نہ ہی میرا ایسا کرنے کا ارادہ ہے۔خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔کون سی منحوس گھڑی تھی، جو تیرا میرا سامنا ہوگیا۔تجھے کوئی کمی بھی نہیں۔بگڑے ہوئے رئیس زادے نے پچھلے دس سالوں میں ہزاروں نہیں تو سیکڑوں عورتوں سے ہوس مٹائی ہو گی۔میں نے شادی نہ کرنے کا پکا فیصلہ کر رکھا ہے۔ابا نے ایک گھر داماد ڈھونڈ نکالا تھا۔میں نے صاف کہہ دیا! ابا! میں تیری بیٹی ہوں۔تیرے پاس غصے کے سوا کچھ باقی نہیں بچا۔کارخانے کا بچا کھچا سامان بیچ کر روٹی کھا رہے ہیں۔تمہاری وراثت سے مجھے سارا ہی غصہ مل گیا ہے۔جس کو داماد بنانے کے لیے دکھانے لائے ہو،یہ میرے ہاتھوں قتل نہ ہوا اور میں جیل نہ گئی تو یہی سمجھوں گی کہ میری ماں تجھے دھوکا دیتی رہی ہے۔تم نے اس کو عمر بھر کے لیے معذور کر کے اچھا کیا۔جس معاشرے میں بہو کے ساتھ آنے والے جہیز کو زیادہ اہمیت دی جائے،اس میں سرفراز ڈھلتیا بیٹی بیاہنے کے خواب نہ دیکھے۔تسلی رکھو، تجھے زندگی بھر کوئی میرے بارے میں طعنہ نہ دے گا......"

سعود بڑے تحمل سے ساری گفتگو سنتا رہا۔مینا ساغر کا موبائل فون اچانک بول پڑنے سے اُس کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔سکرین پر نگاہ ڈالتے ہوئے آزردہ لہجے

میں بولنے لگی: ''اسے دیکھو! چوبیس گھنٹوں میں چالیس بار کہے گی: اپنا گھر بسا لے گڈویے! میرے لیے اپنی زندگی برباد نہ کر۔ جس نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے، اُس کی ذمہ داری ہے کہ سنبھالے یا گلا دبا دے...... لو! تم بھی سن لو......''

موبائل فون کا سپیکر آن کر کے بول پڑی: ''اب کیا ہو گیا ہے امی! میں پچیس منٹ ہی اوپر ہوئے ہوں گے اور گھبرا گئی ہو۔ مجھے کسی نے اغوا کر لیا ہے......''

''ہائے میں مرگئی'' کی صدا بلند ہوئی اور اُسی لمحے سعود نے فون اُچک کر اپنے منہ کے قریب لاتے ہی اونچی آواز میں کہا: ''چاچی! میرے ساتھ ہے امینہ...... میں سعود بول رہا ہوں......''

جواب میں بھرائی ہوئی آواز سنائی دی: ''ہائے میں واری صدقے سُعودی پُتر! اللہ تجھے سلامت رکھے، تیری جھولی ہر خوشی سے بھر دے۔ اس کو لے جا کسی مولوی کے پاس اور کلمے پڑھا......''

مینا ساغر نے سعود کے ہاتھ سے فون جھپٹ لیا اور ماں سے کہا: ''امی! خدا کا خوف کر لو۔ کوئی ماں نہ ہوگی اس ملک میں تیرے جیسی، جو بیٹی کو کسی کے ساتھ بھگانے کا سوچتی بھی ہو۔ اپنے شوہر سے اُس کے ظلم کا بدلہ اس طرح نہ لو......''

ماں بلبلا کر رو پڑی اور اونچی آواز میں بے ربط جملے بولتی گئی: ''تم بھی اپنے باپ جیسی بے رحم ہو۔ کب کسی کے ساتھ بھاگنے کی بات کی ہے؟...... سُعودی سے نکاح کرنے کو کہتی ہوں۔ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم میں نے بُھلا دیے۔ مگر تیرے ساتھ ہونے والی ناانصافی برداشت نہیں ہو رہی۔''

آہ و زاری کرتے ہوئے بوڑھی عورت کی آواز لرزنے لگی۔ مضبوط ارادے اور اعصاب رکھنے والی بیٹی اپنی ماں کے یوں بلکنے پر دل گرفتہ ہو گئی اور قدرے شوخ ہو کر چاہت بھرے لہجے میں بول پڑی: ''امی! اب بین تو نہ کرو۔ روتی کیوں ہو؟ مجھے

جس کے پلے باندھنے کے خواب دیکھتی ہو، اُسی کے ساتھ ہوں۔ گاڑی میں نکاح نہیں ہوسکتا۔ رونا بند کرو۔ مجھے گھر آنے دو...... حوصلہ رکھو۔"

فون آف کرتے ہوئے مینا ساغر نے پہلی مرتبہ رُخ سعود کی طرف موڑا اور نظر بھر کے دیکھا۔ وہ ہشاش بشاش ہوا دیکھتا گیا اور شوخ لہجے میں بول اٹھا۔ "واہ بھئی واہ۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ساس کا احترام ماں سمجھ کر کرو۔ سبحان اللہ...... دیکھو، میری بات غور سے سنو...... چاچی کی خدمت کرنا میرا بھی فرض ہے۔ اڑھائی ایکڑ رقبے پر حویلی میں ڈیڑھ ایکڑ کا باغ ہے۔ ایک اور صرف ایک میری اماں، بے چاری کی نظریں بہو کے انتظار میں پتھرا گئی ہیں۔ مردوں کے علاوہ آٹھ خادمائیں...... ایمان سے کام ہے کوئی نہیں۔ کھا کھا کر پھٹ گئی ہیں۔ سو گز دور کوارٹروں سے اُن کی چاند ماری کی آواز مجھے اپنے رہائشی حصے میں اکثر سنائی دے جاتی ہے۔ فارغ بیٹھی گولے داغتی رہتی ہیں۔ غلام نبی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ عابدہ نے شکایت لگائی کہ جب سے رنڈوا ہوا ہے، حرامی کو بدمعاشی سوجھنے لگی ہے۔ میں جوں ہی رات کو کھانستی ہوں، یہ لفنگا بڈھا اپنے کوارٹر سے اُسی وقت کھانس کے جواب دیتا ہے۔ میرے پیٹ میں گیس بنتی ہے، مجبور ہوں۔ روکنے سے تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ پچھلی رات میں نے ڈر کے مارے ذرا زور سے خارج کردی۔ بدمعاش نے بھی اُسی وقت ہارن بجا دیا۔ غلام نبی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا! سرکار! میں بھی انسان ہوں۔ اکیلے پڑے رہنے سے نیند نہیں آتی۔ کھانسی مجھے بھی آجاتی ہے اور گیس بھی بنتی ہے۔"

مینا ساغر کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی اور قدرے جھینپ کر نظریں جھکا لیں۔ سعود کی نگاہوں سے ایسی شعاعیں پھوٹیں، گویا حسینۂ بے مثال کو پہلی نظر دیکھ کر مر مٹا ہو۔ وہ دم سادھے دیکھے جا رہا تھا۔ اُس کے خاموش ہو جانے پر مینا ساغر نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ پلک جھپکنا بھول گیا اور دیوانہ وار دیکھتا گیا۔

مینا ساغر کو گمان گزرا کہ کہیں آج بھی حد سے آگے نہ بڑھ جائے۔ اسی لیے ماضی کے وہ دونوں مناظر یاد آ گئے۔ بیس برس پہلے جب ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا اور اس نے ان کی پشت پر دو دو بوسے ثبت کر دیے تھے۔ اور دس سال بعد، جب دونوں بھرپور جوان ہو گئے، ایک بار پھر اُسی دیوانگی سے وہی عمل دہرایا تھا۔ اندر سے خائف ہونے کے باوجود بظاہر مضبوط بیٹھی نظر آئی۔ اُس کی توجہ ہٹانے کی خاطر بڑے اعتماد سے بولی: ''چپ کیوں ہو گئے؟...... بولتے جاؤ، جو تمہارے جی میں آئے، کہہ ڈالو۔ آج میں بالکل نہیں ٹوکوں گی...... ہاں! آخری جواب میرا ہوگا۔''

وہ اُسی شیفتگی فریفتگی سے دیکھتا گیا اور بولنے لگا: ''تم کہتی ہو، وہ کون سی منحوس گھڑی تھی، جب تیرا میرا سامنا ہوا...... میں بتاتا ہوں وہ سعد گھڑی کون سی تھی۔ یہ کہانی عالمِ ارواح میں شروع ہوئی۔ جب تیرے آباواجداد، ہندوستان پر حملہ آور ہونے والے لشکر کے ہمراہ آنے کے ارادے باندھ رہے تھے۔ میں نے تب اپنے بڑوں کو ہندومت ترک کر کے مشرف بہ اسلام ہونے کا کہہ دیا تھا۔ تا کہ صدیوں بعد جب تم چاچا سرفراز کے ہاں عدم سے وجود میں آؤ تو تیرے میرے ملاپ میں مذہب حائل نہ ہو......''

ذرا سا توقف کر کے بولا: ''پہلے میں چاچی کے حوالے سے بات مکمل کرلوں۔ وہ یہ کہ حویلی میں باغ کے عین سامنے تین کمروں کا الگ تھلگ مکان بنا ہوا ہے۔ کم از کم تین خادمائیں اُس کی نگہداشت کریں گی۔ تا کہ اُن کا کھایا پیا ہضم ہوتا رہے۔ وہیل چیئر پر چاچی خود بھی دن میں جتنی بار چاہے، سیر کر سکتی ہے۔ ہم دونوں اس عرصے میں ہنی مون منانے کے لیے بے فکر ہو کر ملک کے اندر اور باہر جا سکتے ہیں۔ اس طرح ہم نے ہجر کی صدیوں کا جو عذاب بھگتا ہے، اس کا ازالہ ہی نہیں، دل کھول کے کسریں پوری کریں گے......

اور ہاں! ایک اور بات، جو تم نے سیکڑوں عورتوں سے ہوس مٹانے والی کی

ہے، سراسر بہتان کے سوا کچھ نہیں۔موٹا موٹا حساب لگا سکا ہوں۔قسم نہیں دی جاسکتی۔میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ دو درجن ہوں گی.....لیکن وہ بھی عرصہ ہوا، جھک مارنا چھوڑ چکا ہوں۔تاکہ خود کو تیرے ساتھ شرعی رشتۂ ازدواج خوش اسلوبی سے نباہنے کے لیے یکسو رکھ سکوں.....البتہ مے نوشی جاری ہے،مگر اعتدال سے۔یہ خوش گوار تبدیلی اِس مثبت سوچ کے نتیجے میں آئی ہے کہ داماد کو اپنے سسر کے ہاتھوں کپڑے اتروانے کی ذلت اُٹھانے کی دوبارہ نوبت نہ آئے.....''

مینا ساغر اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکی، تاہم ٹوکا بھی نہیں اور بات جاری رکھنے کا اشارہ کردیا۔وہ کہنے لگا:''اب ذکر آ گیا، جہیز کا، جو تم نے اس معاشرتی لعنت کا حوالہ دیا تھا.....میرا اس سلسلے میں نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو مرد اپنی شریک حیات سے مال ومتاع کا لالچ کرتے ہیں،اُن پر کارخانۂ قدرت میں تیار شدہ لعنت کے کُل سٹاک کا کم از کم چالیس فی صد تھوپ دینا چاہیے۔باقی کی ساٹھ فی صد لعنت اُس پر، جو دنیا کی حسین ترین لڑکی سے عشق کرنے کے باوجود اُس کا ہاتھ مانگنے کے ساتھ جہیز بھی قبول کر لے..... میں حضرتِ سعود سیٹھ کی بات کر رہا ہوں۔یعنی میں اور تم.....تم اور میں.....

ایک اور بات تم نے کی تھی کہ بگڑے ہوئے رئیس زادے کو کیا کمی ہے؟.....میں بتاتا ہوں۔تیری بے رُخی مار ڈالتی تھی۔اپنے ادھورے پن کے دکھ درد کا مداوا جھک مار کے کرتا رہا۔تیرے مل جانے سے میری ذات کی تکمیل ہو جائے گی.....

اب ڈسکس کرتے ہیں،اس تجویز کو جو میں تمہارے ہمدردانہ غور اور فوری عمل درآمد کے لیے لے کر آیا ہوں۔مجھے چاچا کی پریشانیوں کا علم ہے۔تم اُن کے لیے فکرمند ہونا چھوڑ دو۔میں نے ایک مستند مفتی سے فتویٰ لیا ہے۔وہ یہ کہ دُلھن کا حق مہر دُولہا کی مالی حیثیت کے مطابق مقرر کیا جانا چاہیے۔اِس اصول کے تحت میری دُلھن مینا ساغر کا حق مہر کروڑوں کا بنتا ہے،لیکن دُولہا، مسمّی سعود عُرف سُعودی، اِن دنوں سارا

سرمایہ ایک ہاؤسنگ منصوبے میں جھونک چکا ہے، لہٰذا فوری طور پر ڈیڑھ دو کروڑ روپے سے زیادہ حق مہر شرعی ادا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ساتھ ہی اپنی دُلھن مینا ساغر پر کامل اعتماد کرتے ہوئے نکاح نامہ میں درج ایک شق کے مطابق اُس کو طلاق کا حق بھی بخوشی دے رہا ہے۔ تاکہ جب بھی وہ سمجھے کہ دُولہا راجا اُس کے اعتماد پر پورا نہیں اترا، وہ بغیر کسی رُکاوٹ کے علیحدگی اختیار کر سکے...... اور میری دُلھن رانی کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے حق مہر کی رقم جہاں چاہے، خرچ کر سکتی ہے۔ شرعاً کوئی ممانعت نہیں۔ چاہے وہ نوٹوں کی ٹُوں اپنے ابا کے بیگ میں ڈال دے...... علیٰ ہٰذا القیاس، میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ مینا ساغر کا اپنے عاشق صادق، بگڑے ہوئے رئیس زادے سے بدگمان ہونے کا جواز باقی نہیں رہا......''

مینا ساغر کی تیوری میں بل پڑتے دیکھ کر سعود نے سہم جانے کی اداکاری کی اور بولا: ''تیوری تم نے چڑھائی، میرا دم نکل گیا...... بڑے کمال کا شعر ہی بھلا دیا...... اب کیا غلط ہو گیا؟...... اے میری عشوہ گر!!!''

وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بول پڑی: ''تم نہیں سُدھر سکتے۔ تمہارے دماغ سے دولت کا خناس کب نکلے گا؟...... سو روپے کی مٹھی...... لاکھ روپے کا ٹھما...... اور اب بعوض حق مہر مبلغ ڈیڑھ یا دو کروڑ روپے سکہ رائج الوقت، عمر بھر کا جسمانی تسلط...... کبھی اپنے اندر جھانک کر غور کر لیا کرو...... میں پہروں اس مجاہدے میں غرق ہوئے رہنے کے تجربے سے کئی بار گزر رہی ہوں...... اس طرح دراصل تم میرے جسم کا سودا کر رہے ہو، جو مجھے قبول نہیں، بلکہ میری توہین ہے...... اور عشق کے جذبے کی بھی، جس کا تم دعویٰ کرتے ہو۔''

سعود نے سر پیٹ لیا اور بولا: ''تو پھر فی سبیل اللہ ہی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ مجھے تم مسلمان ہونے کا فائدہ بھی نہیں اٹھانے دے رہی۔ میں نے کس لیے

اپنے بڑھکوں کو دھرم چھوڑنے کا کہا؟ آخر میں کہاں جاؤں؟ تیرے بغیر اب نہیں رہ سکتا۔ روایتی رئیس زادہ بن کے تجھے اٹھوالوں؟"

وہ ایک ٹک سعود کو دیکھے جا رہی تھی۔ لمحے گزرے یا ہفتے مہینے سال...... اُس کے نازک لبوں میں جنبش ہوئی۔ جملہ سنائی دیا: "جس انداز میں حق مہر کی پیشکش کی ہے، اُس سے کہیں بہتر تھا کہ مجھے اٹھوا لیا ہوتا تو میں اپنے آپ کو بے وقار ہوتے محسوس نہ کرتی۔ یہی یقین میرے پندار کو مضبوط کرنے کے لیے کافی ہوتا کہ مجھے چاہنے والے کو مجھ سے اب اور کچھ عرصہ دور رہنے کا یارا نہ رہا...... خیر، چھوڑو اس قصے کو...... تم گاڑی واپس موڑو۔ میں کسی مناسب جگہ سے رکشہ لوں اور گھر جاؤں......"

o

صبح صبح ہی مزدا ٹرک آ کر مکان کے ساتھ لگ کے کھڑا ہو گیا۔ مزدور اوپر ٹیرس سے سامان نیچے ٹرک میں کھڑے مزدوروں کو تھماتے گئے۔ کئی دنوں سے اوپر والے پورشن میں مالک مکان اور اُس کے اہل و عیال معمول سے ہٹ کر مختلف سرگرمیوں میں مصروف معلوم پڑتے رہے۔ سرفراز ڈھلیا نے بڑے چھوٹے گتے کے کارٹن بھی اوپر لے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کو کچھ سمجھ نہ آئی۔ مگر آج حقیقت کھل گئی کہ خالد احمد اپنا ذاتی مکان چھوڑ کر جا رہا ہے۔ تشویش ہوئی یا تجسس، سرفراز کے ظاہری تاثرات سے اُس کے حقیقی جذبات اور احساسات کو سمجھنا ہمیشہ ہی مشکل اَمر رہا۔ کسی وقت غصے میں نہ بھی ہوتا، چہرہ سپاٹ ہی نظر آتا۔ خالد کو روک لیا اور پوچھا کہ وہ اپنا مکان چھوڑ کر کیوں جا رہا ہے۔ مزید یہ کہ اوپر والے پورشن میں کس طرح کے لوگ آ رہے ہیں۔

خالد احمد نے اپنی فطری خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا: "اوپر کوئی بھی نہیں آ رہا۔ چابیاں آپ کے پاس رہیں گی......" وہ خیر سگالی کی فضا قائم کرنے

کی غرض سے ہنس دیا اور بولا: ''میں نے سوچا، سرفراز بھائی جان کو ہمارے اوپر رہنے سے بار بار شکایت پیدا ہوتی ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ لہٰذا ہم جا رہے ہیں تاکہ آپ سکھ آرام سکون سے رہ سکیں......''

سرفراز کو مالک کی ہنسی، خوش اخلاقی اور تجاہلِ عارفانہ ذرا نہ بھایا، تاہم برہمی کو ضبط کرتے ہوئے بولا: ''یہاں کوئی کسی کا بھائی نہیں اور نہ ہی اتنا بخی کہ کرایہ دار کے آرام کی خاطر ذاتی مکان خالی کردے۔ سیدھی بات کریں، کون آ رہا ہے؟ کوئی بدمعاش ہوگا۔ میرا تجربہ ہے کہ تم جیسے میٹھی میٹھی باتیں کرنے والے چھپ کے وار کرتے ہیں۔ میرے خیال میں تم نے مکان بیچ دیا ہے۔ اور مجھے تنگ کرنے کی نیت سے یقیناً کسی غنڈے کو بیچا ہوگا۔ اسی لیے زیادہ خوش نظر آ رہے ہو...... خیر ہے، مجھے غنڈوں سے نپٹنے کا بڑا تجربہ ہے۔ تم زیادتی کر گئے ہو۔ مجھ سے چوری چوری، مالک مکان تبدیل کردیا۔ اُس سے میری ملاقات کراؤ۔ یہ نہ ہو کہ میرے ساتھ پھڈا ڈال دے۔''

''نہیں ڈالے گا پھڈا بھائی صاحب!'' خالد نے لجاجت آمیز لہجے میں ٹوک دیا اور مزید کہا: ''بڑا سلجھا ہوا تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ آپ سے مل لے۔ کہنے لگا: مل لوں گا۔ جب آپ نے بتا دیا کہ اچھے لوگ ہیں، تو بس مسئلہ ہی ختم ہوا۔ مجھے فی الحال مکان کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ آرام سے رہتے رہیں...... بلکہ مجھے یہ بھی کہا کہ آپ کو تسلی دلا دوں، کرائے وغیرہ کی فکر نہ کریں......''

''کیوں بھئی! خدا واسطے والا سمجھ رکھا ہے مجھے؟...... بھکاری ہوں؟ کرائے کی فکر نہ کروں۔ کوئی فرشتہ آسمان سے اتر آیا ہے۔ اور تو اس دیس میں ایسے لوگ دیکھے نہیں...... خواہ مخواہ مجھے بیوقوف بنا رہے ہو......'' سرفراز یک دم بھڑک کر بول اٹھا اور چند لمحے خالد کو گھورتا رہا۔ کچھ سوچ کر بول اٹھا: ''تم جاؤ، اپنا کام کرو۔ مزدور تمہارا کوئی نقصان نہ کردیں۔ میں دیکھ لوں گا، جو بھی فرشتہ ہوا۔''

ایک مہینا گزر گیا، پھر دوسرا اور تیسرا بھی۔ لیکن نیا مالک مکان نہ آیا۔ اوپر والا پورشن کھلا پڑا رہا۔ خالی، بھائیں بھائیں کرتا۔ خالد اس کی چابیاں سرفراز کے حوالے کر گیا تھا۔ اس کی تشویش بڑھتی گئی۔ آخر ہے کون؟ جس نے لگ بھگ پونے کروڑ روپے کا مکان خریدا اور اتنا لاپرواہ کہ ایک نظر دیکھنے بھی نہیں آیا۔ اُس کو کیسے ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ خالد سے پوچھا ہی نہیں کہ وہ شہر کے کس علاقے میں شفٹ ہوا ہے...... خیر، دیکھا جائے گا، جو بھی ہوا۔

مینا ساغر سمجھ گئی کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ دھیان سعود کی طرف چلا گیا۔ یاد آیا کہ وہ اِن کے بارے میں خبر رکھتا ہے۔ باپ جُوں ہی گھر سے نکلا، اوپر والے پورشن میں آ گئی اور سعود کا فون ملایا۔ دوسری رنگ پر وہ بول پڑا: ''عاشق صادق حاضر ہے۔ اے میرے دل کی ملکہ! حکم ہو......''

اس نے بغیر تمہید باندھے براہِ راست اصل سوال کر دیا: ''عاشق صادق جھوٹ نہ بولے اور سچ سچ بتا دے کہ جس مکان میں اُس کے دل کی ملکہ کرائے پر رہ رہی ہے، وہ کب اور کتنے کا خریدا ہے؟''

سعود نے فوراً بول دیا: ''اکہتر لاکھ کا، تین ماہ پہلے اپنے ایک ساتھی کے نام...... تاکہ چاچا کے سامنے وہی جائے اگر جانا پڑے...... شاہد نام ہے، میری اس کمپنی کا ڈائریکٹر ہے...... کیا کروں؟ کوئی بس نہیں چل رہا۔ میرے دل کی ملکہ سونے کے محل میں رہنے کے لائق، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی آٹھ مرلے کے مکان میں رہ رہی ہے۔ دو کروڑ کی ذاتی گاڑی سے اُتر کر رکشے میں بیٹھ جاتی ہے۔ چاچی سچ کہتی ہے: ہم سب قسمت کا لکھا بھگت رہے ہیں۔ جب سے تم نے مجھے اپنے اندر جھانکنے کا مشورہ دیا ہے۔ اللہ کی قسم آدھی رات کو پورے سکون یکسوئی سے اپنی ذات کے نہاں خانے میں گھنٹوں جھانکا ہے۔ جو بات تم نے کی تھی، اس پر بہت غور کیا۔ واقعی بہت گہری

ہے۔ جہاں دلوں کے سودے ازل سے ہوئے ہوں، وہاں جان مال، ہر شے دونوں کی سانجھی ہو جاتی ہے...... سکہ رائج الوقت کی شرط رکھنا عامیانہ پن کی علامت بن جایا کرتی ہے اور دو دلوں کے بیچ پھانس بنی چبھتی رہتی ہے۔ باہم اِک سار ہو کے ملنے نہیں دیتی......"

"اچھا ٹھیک ہے۔ یہی پوچھنا تھا۔ ابا ہر وقت بیٹھا پیچ و تاب کھاتا نظر آتا ہے۔ اُس نے تصور کر لیا ہے کہ مکان کسی زور آور غنڈے نے خریدا ہوگا۔ خالد نے تلخ کلامی کا بدلہ چکانے کی نیت سے لازماً کوئی بُرا خریدار ڈھونڈ لیا ہوگا۔ ابا نئے مالک مکان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے آستانیں چڑھائے پھرتا ہے۔ تمہارا شکریہ۔ تم نے میرے ساتھ سچ بولا اور مکان خرید کر بھی اچھا کیا۔ خالد احمد واقعی شریف انسان تھے لیکن اگر وہ کسی ٹیڑھے مزاج کے شخص کو مکان بیچ ڈالتے تو میں نے یتیم ہو جانا تھا یا نئے مالک مکان کی اولاد نے...... اور جو تم نے دوسری باتیں کیں، اپنی ذات میں جھانکنے کی، اس سے حقیقی خوشی ہوئی۔ خدا حافظ......"

سرفراز کو چین نہ آیا اور کوشش بسیار سے تحصیل آفس میں نذرانہ دے کر مکان کے نئے مالک کے نام ہونے والی رجسٹری سے نف اُس کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی حاصل کر لی۔ سیدھا اُس کے گھر جا پہنچا۔ باپ اور ماں سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے علم میں تھا کہ کمپنی کے اصل مالک اور ایم ڈی، مسعود صاحب کے حکم پر مکان خریدا گیا ہے، تاکہ اُس میں پہلے سے رہائش پذیر اُن کے قریبی عزیز رشتہ دار بغیر کسی غیر کی مداخلت کے رہتے رہیں۔

مہمان پر اصل صورتِ حال ظاہر کر دی اور مزید کہا: "بیٹے شاہد کو مسعود صاحب نے کرایہ لینے یا آپ سے ملنے کو کہا ہی نہیں تو وہ کیسے چلا جاتا۔ لہٰذا آپ اطمینان سے رہتے رہیں۔ ممکن ہے، صاحب آپ کو خود سرپرائز دینا چاہتے ہوں۔"

میاں بیوی نے گھر آئے مہمان کو بہت اہم جانتے ہوئے، چائے اور لوازمات سے خاطر مدارت کی اور بڑے اخلاق سے پیش آئے۔اُن کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس طرح سے کوئی شخص بنفسِ نفیس آ جائے گا اور اُس سے ہر بات کھول کھول کر بیان نہیں کرنی۔شہدی نے والدین کو اِس نوعیت کی صورتِ حال پیش آنے پر رازداری رکھنے کی ہدایت ہی نہیں کی تھی،لہٰذا جو ہونا تھا، ہوگیا۔سرفراز اپنے میزبانوں کے حسنِ سلوک اور غیر معمولی پذیرائی کرنے پر خود کو زیر بار محسوس کرنے لگا، اس لیے تہذیب کا دامن تھامے رکھا۔ بصد اصرار تین مہینے کا سابقہ مع دو ماہ کا پیشگی،کل پانچ مہینوں کا کرایہ میز پر رکھ کر نکل آیا۔

سرفراز ڈھلیا اپنے اصل روپ میں آ گیا تھا۔ایسی غیر متوقع صورتِ حال پیش آنے کا سوچ سوچ کر دماغ اُلٹ گیا۔دشمن کے بیٹے کا وار چل گیا اور پتا ہی نہ چلا۔وہ احسان کے بوجھ تلے دبا کر میری ہزیمت کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔گویا میری بیٹی کا پیچھا نہیں چھوڑا۔کہیں ایسا تو نہیں کہ میری بیٹی بھی اُس سے رابطے میں ہو۔وہی بیٹی، جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔اُس پر اعتبار کرتا رہا۔میرے سامنے چٹان کی طرح مضبوط رہی اور یقین دلایا کہ اُس پر کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا۔گویا دنیا میں کوئی کسی کا سگا نہیں۔جب بس چلا، چوٹ کر گیا۔ہر کوئی اپنے مفاد کا بندہ ہے۔کچھ بھی ہو جائے، میں دشمن کے بیٹے کو داماد بنا کر اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دوں گا۔یہ ٹھیک ہے کہ بیوی کے ساتھ مجھ سے زیادتی ہوگئی۔معمولی غلطی کی بھاری سزا دے ڈالی۔یہ محض حادثہ تھا۔اُس کو نیچے گرانے کی نیت ہی نہ تھی۔وہ ڈر گئی اور اُچھل کر پیچھے ہٹی۔جنگلے کے ساتھ ٹکراتے ہی اُلٹ کر نیچے جا گری۔اُس کے معذور ہو جانے سے میں نے بہت بڑی سزا بھگتی ہے اور بُھگتے چلا جا رہا ہوں۔بیٹی نے ماں کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ایسی مثال شاید ہی کہیں ملے۔مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ میرے سب سے

بڑے دشمن کے بیٹے سے تعلقات قائم کر لے۔ وہ سفید ریچھ چھوٹے ہوتے سے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ اُس کا یک طرفہ جنون ہے۔ مگر معاملہ گڑبڑ ہے۔ اسی لیے بیٹی نے شادی کے معاملے میں میری ہر تجویز رد کر دی۔ ایسا غضب ہوا جو میری قوتِ برداشت سے باہر ہے۔ میں یہ کسی صورت میں نہ ہونے دوں گا، خواہ اس کی کتنی ہی بھاری قیمت چکانی پڑے......

تین دن میں سرفراز نے اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے کے سلسلے میں تمام ابتدائی اقدامات کر لیے تھے۔ صبح آٹھ بجے کے قریب فلاحی ادارے کی ایمبولینس آ گئی۔ شروع میں بیٹی کو یقین دہانی کرانے کی کوشش کی کہ علاج کی غرض سے اُس کی ماں کو لے جایا جا رہا ہے۔ لیکن وہ دل سے مطمئن نہ ہوئی۔ ایک وین میں سات اجنبی لوگ بھی ہمراہ آئے تھے، جن میں تین خواتین تھیں۔ ایک بوڑھی، دوسری ادھیڑ عمر اور تیسری جوان۔ وہ غیر معمولی اپنائیت کا اظہار کرنے لگیں اور مینا ساغر نے محسوس کیا کہ تینوں اس کو دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں قربان ہوئی جا رہی ہیں۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اور گہرا غور و خوض کرنے لگی کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ باپ سے کہا کہ وہ ماں کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ اس کو اکیلے نہیں چھوڑے گی۔ اُس نے بیٹی کو درشت لہجے میں کہا کہ وہ آرام سے گھر میں رہے۔ اُس کی ماں کی دیکھ بھال کے لیے بہت اچھے انتظامات ہیں۔ اِسی میں مریضہ کی بہتری ہے بلکہ تمام گھر والوں کی۔

ایمبولینس میں مریضہ کے علاوہ سرفراز خود اور دو مہمان بھی ہمراہ گئے۔ وین بھی ایمبولینس کے پیچھے چل دی، جس میں صرف ڈرائیور تھا۔ مینا ساغر کو غیر مردوں کے سامنے بے پردہ آنے کی عادت نہ تھی اور پھر باپ نے بھی اِسی عذر کی بنا پر بیٹی کو اندر اپنے کمرے میں رہنے کی سختی سے ہدایت کر دی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہوئی ماں کی آہ و فغاں سنتی رہی مگر جلد ہی آواز دب سی گئی تھی، جیسے منہ پر بھاری کپڑا وغیرہ ڈال دیا

گیا ہو۔ باپ کی غیر معمولی سخت کلامی، اجنبی مہمانوں کی آمد اور ماں کو اچانک منظر سے ہٹا دینے پر مینا ساغر کو شک ہونے لگا کہ یقیناً کوئی اَن ہونی ہونے کو ہے۔ بغیر گھر میں مشورہ کیے میری ماں کو کہاں ڈال دیا۔ کوئی غیر آخر کس حد تک تحمل سے لاچار مریض کا خیال رکھ سکتا ہے۔

مہمان عورتیں ڈرائنگ روم میں بیٹھی خوب چہک رہی تھیں۔ مرد دونوں پورچ میں لان چیئرز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بوڑھی خاتون کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اگر اُس کو سمجھایا بھی گیا تھا تو بے پایاں خوشی میں حواس پر پوری طرح قابو نہ رکھ سکی اور دروازے پر دستک دے کر پُر جوش آواز میں بولی: ''اینہ سوہنیے! چن ورگا مکھڑا کیوں لُکا لیا؟ ذرا منہ دھو کے اچھے اچھے کپڑے پہن کر سامنے تو آ......'' اُسی لمحے ادھیڑ عمر عورت نے ڈانٹ دیا: ''چپ کر بھابھی! تیری مت ماری گئی ہے۔ لڑکی کو آرام کرنے دے۔''

ایک جھماکے سے مینا ساغر پر عقدہ کھل گیا۔ اُس نے چادر سے منہ سر لپیٹا، موبائل لیا اور باپ کے کمرے سے اوپر والے پورشن کی چابیوں کا گچھا اٹھا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ہلکا سا کھٹکا کیے بغیر دروازہ کھولا اور اندر سے اچھی طرح بند کر کے پورچ میں کھلنے والے دروازے پر نگاہ ڈالی۔ اس کے کنڈے چٹخنیوں کو دیکھا۔ وہ پہلے سے بند تھے۔ دبے پاؤں اوپر چلی گئی۔ ٹیرس پر کھلنے والے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ فرنٹ روم میں آ کر مسعود کو فون ملایا۔ اُس نے پہلی رنگ پر جواب میں والہانہ پن سے کہا: ''جی کرے عاشق صادق...... حکم ہو، اے میرے دل کی ملکہ!''

مینا ساغر کے آنسو اندر ہی اندر گرنے سے گلا پامال ہونے لگا۔ اُس نے بھرپور قوت ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے لہجے کو مضبوط کرنے کی کوشش کی، تاہم اتنا ہی کہہ پائی: ''کہاں ہو؟'' وہ ترت بول گیا: ''تیرے بہت قریب۔ اپنے دل میں جھانک کے دیکھو......'' وہ جھنجھلا گئی اور لرزتی آواز میں بول پڑی: ''مذاق نہ

کرو۔ جلدی آؤ اور مجھے عدالت لے چلو، ابھی اسی وقت......" وہ رو پڑی۔

سعود کی آواز سنائی دی: "میں حاضر ہوں جانِ من! تجھ سے غافل کبھی نہیں رہا۔ اسی غم میں میرا موٹاپا کچھ کم ہوا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہ سمجھنا کہ ہر موٹے بندے کا دماغ بھی موٹا ہوتا ہے۔ بالکل نہ گھبراؤ۔ بے دھڑک ہو کر ٹیرس پر آؤ اور گلی میں جھانکو۔ چار گاڑیاں کھڑی ہیں، ان میں ایک تیری اپنی، جس پر تھوک کر تم رکشے میں جا بیٹھی تھی......"

مینا ساغر پر رقت طاری ہوگئی۔ ڈرتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولا اور ٹیرس پر آئی۔ جنگلے سے لگ کے جھانکا۔ دائیں ہاتھ ذرا دور پولیس وین کھڑی دیکھی اور پیچھے دو کاریں۔ بائیں ہاتھ نظر پڑتے ہی سفید لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی کا شیشہ نیچے سرک گیا۔ سعود نے سر باہر نکالا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ مینا ساغر نے چادر کے پلو سے آنکھیں ڈھانپ لیں اور داہنے ہاتھ کی ہتھیلی سے چہرہ تھپتھپانے لگی۔ بائیں میں پکڑے ہوئے موبائل کی گھنٹی بجتے ہی اس نے فرش پر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ قریب ہی گتے کا دبا ہوا کارٹن نظر آیا۔ پاؤں سے کھسکا کر کمرے کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ فون آن کر کے بیٹھ گئی اور دیوار سے ٹیک لگالی۔

سعود بول پڑا: "فون بند نہ کرنا۔ خدا جانے کتنا انتظار کرنا پڑے۔ اتنی دیر باتیں کرتے ہیں......" اس نے مختصر جواب میں کہا: "نہیں کرتی، تم پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کیسے پہنچے؟" وہ بولا: "جس دن چاچا، شاہد کے گھر مکان کا کرایہ دے کر آیا اور اس کے والد صاحب نے فون پر بیٹے کو آگاہ کر دیا تو میں چوکنا ہوگیا۔ کمپنی کے لیگل ایڈوائزر سے مشورہ کیا۔ علاقہ ایس ایچ او کو اعتماد میں لیا۔ چاچے کی نگرانی پر کمپنی سٹاف کے دو بڑے سمارٹ نوجوان مامور کر دیے۔ چاچا جہاں جہاں ان تین دنوں میں گیا اور جو کچھ کیا، لڑکے بائیک پر پیچھا کرتے رہے۔ جس نام نہاد فلاحی ادارے میں چاچی کو داخل کروا کے بیس منٹ پہلے نکلا ہے، وہاں گزشتہ روز صبح نو بجے معاملات طے کرنے گیا

تھا۔دس بجے میں نے خود جا کر وہاں کی حالت دیکھی۔ٹوٹل فراڈ این جی او ہے۔لواحقین کے علاوہ ہر ذریعے سے مال بٹورنے والی......

خیر، جب چاچا مختلف مولویوں سے ملا اور آخر میں حلقے کے نکاح رجسٹرار سے،تو میرے دل نے پکار کر مجھے کہا:سعود صاحب! تمہاری ملکہ اب گھر کو لوٹ آئے گی۔تم تیاری پکڑو۔میرے ڈائریکٹر زاہدی نے نادرا سے تمہارے شناختی کارڈ کی نقل حاصل کی۔ہمارے کمپنی کے وکیل نے تمہاری اور میری طرف سے عدالت میں داخل کرائے جانے والے بیان حلفی تیار کر رکھے ہیں۔صرف تم نے اب گھر سے نکلتے ہوئے اصل آئی ڈی کارڈ ضرور لانا ہے۔ہم دونوں نے اپنے اپنے بیان حلفی پر نشان انگوٹھا اور دستخط ثبت کرنے ہیں۔عدالت میں دیر نہیں لگے گی۔جج نے صرف تم سے تمہارے بیان حلفی کی زبانی تصدیق کروانی ہے۔جس میں لکھا ہے کہ بلا جبر و اکراہ، بارضا و رغبت، فی سبیل اللہ اُس شخص سے نکاح کر رہی ہوں،جس سے عالم ارواح میں عہد و پیمان ہوئے تھے......"

سعود نے گفتگو میں چند سیکنڈ کا وقفہ کیا اور بول پڑا: "اچھا! پہلے تازہ بتازہ رننگ کمنٹری سن لو...... چاچا نے ایک مولوی کو گھیر لیا ہے۔دونوں وین میں بیٹھ رہے ہیں۔ڈولہا بننے کے شوقین بھائی صاحب بھی ساتھ ساتھ ہیں۔نان سینس کو یہ نہیں پتا کہ ہر لمحہ" آن کال ڈولہا" پچھلے بیس سال سے ہمہ وقت آس پاس منڈلا رہا ہے،تا کہ کال ملتے ہی زیادہ سے زیادہ ایک منٹ میں ایجاب وقبول کی تقریب میں جا پہنچے۔زانو تہ کر کے بیٹھ جائے اور دل کی گہرائیوں سے آواز نکالے: جی! قبول ہے...... جی! ہر شرط پر قبول ہے...... ہاں جی! دل وجان سے قبول ہے......"

موبائل پر دو تین سیکنڈ کی خاموشی طاری رہنے کے بعد آواز سنائی دی:

"ہوشیار، خبردار! نکاح رجسٹرار بغل میں بگ سائز رجسٹر دبائے،دائیں ہاتھ سے داڑھی سنوارتے، خوشی خوشی وین کی طرف بڑھا ہے...... ہاں جی! میرے دل کی ملکہ سن رہی

ہے، یا میں ایسے ہی ہوا میں بول رہا ہوں؟''...... مینا ساغر کے لبوں پر نیم مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ فوراً بولی: ''سن رہی ہوں۔''

اُس نے مرحبا، جزاک اللہ اور الحمدللہ کے کلمات ادا کیے اور بولا: ''میں اپنے وطن کی پاک سرزمین پر قربان جاؤں۔ یہ جنت ہے۔ بندے کی جیب میں مال ہو، ہر کام ایسے ہوتا چلا جاتا ہے، کچھ نہ پوچھو...... کھل جا سم سم کی ایسی تیسی پھر جاتی ہے۔ وہ کام بھی پلک جھپکنے میں ہو جاتے ہیں، جو یو ایس اے کا صدر اوباما اپنے ہی ملک میں کروانا چاہے تو قسم اللہ کی، منہ کی کھائے...... اچھا ایک بات پہلے سن لو، یہ نہ ہو کہ وین پہنچتے ہی گھمسان کا رن پڑے۔ چاچا پیدائشی جنگ جُو ہے۔ میں نے تھانے میں ہی ساتھ آنے والی پولیس پارٹی کو ہدایت کر دی تھی کہ سُسر کی عزت بھی اس طرح کرنی چاہیے، جیسے سگے باپ کی۔ ہاں! وہ بات یہ ہے کہ چاچی کو میرے بندوں نے ایک پرائیویٹ کلینک میں پہنچا دیا ہے۔ آرتھوپیڈک سرجن ریٹائرڈ بریگیڈئر ہے۔ بہت ماہر۔ چند ہفتوں کے بعد حویلی چلی جائے گی۔ ساتھ دو عورتوں کی ڈیوٹی لگائی ہے۔ سرجن کا کہنا ہے کہ سو فی صدی ریکوری نہیں ہو سکتی، لیکن کافی بہتری آ جائے گی...... لو جی! اللہ خیر کرے، وین گلی میں داخل ہو گئی ہے......''

وین گیٹ کے عین سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ سرفراز نے پہلے دائیں طرف نگاہ ڈالی۔ پولیس وین اور اس کے پیچھے دو گاڑیاں تین گھر چھوڑ کے کھڑی تھیں۔ بائیں ہاتھ سفید لینڈ کروزر ساتھ والے گھر کے آگے کھڑی تھی۔ شیشے کے پار کچھ دکھائی نہ دیا۔ سرفراز سینہ تانے صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ سمجھ نہ پایا کہ معاملہ کیا ہے۔ اُس کے ساتھ آئے مولوی صاحب، نکاح رجسٹرار اور مہمان سہم گئے۔ اندر سے گیٹ کھول کر جو مہمان باہر آئے، ان کے چہرے بھی مرجھائے ہوئے تھے۔ ادھیڑ عمر اے ایس آئی کی معیت میں دو مرد اور دو خواتین اہلکاروں پر مشتمل پولیس پارٹی گیٹ پر آ گئی۔ اتنے میں

شہدی اور آٹھ سیکیورٹی گارڈ بھی پولیس پارٹی کے پیچھے آن کھڑے ہوئے۔

سرفراز کا پیمانۂ صبر چھلک گیا۔آنکھوں سے شعلے لپکے اور نتھنے پھڑکنے لگے۔پورے قد سے تن کے کھڑا تھا۔اے ایس آئی کو مخاطب کر کے بولا: ''یہ کیا ظلم ہے؟ تھانیدار صاحب! میرے گھر میں میری بیٹی کے نکاح کی تقریب ہے۔مہمان آئے بیٹھے ہیں۔ایسے موقع پر آپ کا کیا کام؟...... اور یہ جو پیچھے لوگ کھڑے ہیں،گھیرا ڈالے......کس خوشی میں؟......اپنے ہی ملک میں ایسی زیادتی!!!''

اے ایس آئی نے تحمل سے کہا: ''ہم ڈیوٹی پر آئے ہیں۔ظلم زیادتی روکنے کی خاطر۔یہی ہمارا کام ہے۔پولیس کو اطلاع ملی ہے کہ لڑکی کی رضامندی کے بغیر زورزبردستی سے اُس کا نکاح کیا جارہا ہے، جو قانوناً جرم ہے۔افسرانِ بالا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں معزز گواہوں کی موجودگی میں لڑکی کی مرضی معلوم کروں۔اگر آپ قانون کے راستے میں آئے تو ہمیں مجبوراً آپ کو حراست میں لے کر لڑکی کو عدالت میں پیش کرنا ہوگا۔لڑکی نے خود بھی کہہ دیا کہ وہ اپنا بیان عدالت میں دینا چاہتی ہے،تب بھی ہمیں اُس کی دادرسی کرنے کا حکم ہے......''

نکاح رجسٹرار اور مولوی صاحب گھبرا گئے اور وہ کھسکنے لگے تو اے ایس آئی نے اُنھیں روک لیا اور کہا: آپ نہیں جاسکتے۔موقع کے گواہ ہیں۔پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔اس لیے کہ لڑکی کا جائز ولی خود آپ دونوں کو لے کر آیا ہے۔

سرفراز بچھنا کر بولا: ''ولی کی کیا حیثیت رہ گئی۔عجب دھاندلی ہے۔میری بیٹی باپردہ ہے اور غیروں کے سامنے کیوں آئے؟......''

اُسی لمحے لینڈ کروزر سے سعود باہر آیا اور اُس کے ساتھ سرفراز کی دونوں بڑی بیٹیاں اپنے شوہروں کے ہمراہ نکل آئیں۔سعود کے قریب آنے پر سرفراز آگ بگولا ہوگیا۔اُس کی طرف جھپٹنا اور چنگھاڑتے ہوئے بولا: ''اچھا!!! تو یہ تم ہو سفید ریچھ۔میں

تمہاری بدمعاشی نکالتا ہوں۔ بھول گئے ہو، جب تجھے ننگا کیا تھا......"

دونوں کانسٹیبلوں نے سرفراز کو بانہوں میں جکڑ لیا۔ سعود نے مشتعل ہوئے بغیر کہا: "چاچا! تم میرے لیے باپ برابر ہو۔ ایک بار پھر ننگا کرلو، میں ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ لیکن اب تو انصاف کرلو۔ تمہاری بیوی، یہ دونوں بیٹیاں اور سب سے بڑھ کر جس بیٹی کا زبردستی نکاح پڑھوا رہے ہو، وہ خود راضی نہیں۔ اگر تم ضد پر اَڑے رہے تو قضیہ آج ہی کورٹ کچہری میں چکا دیا جائے گا......"

دونوں بیٹیاں رو پڑیں۔ بڑی بیٹی بولی: "ابّا! آپ نے ہم سب پر بڑے ظلم کیے۔ بیوی کو ناحق اپاہج کردیا۔ امینہ جیسی بیٹی دنیا میں کسی باپ کو نہ ملی ہوگی۔ تیس سال سے اپنی ماں کی خدمت کررہی ہے۔ اُس کے ساتھ سراسر ظلم کررہے ہو، جس پر اللہ بھی راضی ہوگا۔" وہ زاروقطار رونے لگ گئی۔

اے ایس آئی نے خواتین پولیس اہلکاروں کو حکم دیا: "سرفراز صاحب کی بیٹیوں کو ساتھ لے جاؤ اور لڑکی کو باہر لے آؤ۔ یہ کام اب عدالت کا ہے۔" سرفراز نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹیوں اور پولیس اہلکاروں کو روکا۔ اے ایس آئی سے مخاطب ہوا: "آپ سب لوگ اندر آ ئیں۔ مجھے چند منٹ سوچنے کی مہلت دیں۔ میرا دماغ پھٹ رہا ہے۔ شاید کوئی بہتر حل نکل آئے۔"

سعود نے کہا: "چاچا! آپ ذرا لیٹ جائیں۔" سرفراز نے ایک نگاہ سعود پر ڈالی۔ اپنے مہمانوں کو دیکھ کر بولا: "تم سب لوگ جاؤ۔ اندر سے اپنا سامان اٹھاؤ اور عورتوں کو بلاؤ......اللہ کو نہیں منظور، میں کیا کرسکتا ہوں؟"

جوان اور ادھیڑ عمر عورت، دونوں آگے پیچھے باہر آئیں۔ دونوں نے ریکسین کے تھیلے اٹھا رکھے تھے جو مردوں نے پکڑ لیے اور چاروں سیدھے وین کی طرف چل دیے۔ بوڑھی خاتون واویلا کرتی، ہاتھ ملتی ہوئی آئی اور گیٹ پر رُک گئی۔ سرفراز کے

آگے تن کر کھڑی ہو گئی اور اونچی آواز میں بولی: ''بھائی جی! ہمارا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ ہمارے ساتھ اتنا بڑا ظلم نہ کرو......''

سرفراز نے کہا: ''کیا نقصان ہوا ہے؟ کوئی بیعانہ دیا ہوا ہے تو بتاؤ، میں ڈبل واپس کرتا ہوں۔ بیوپار کا یہی اصول ہے......اور تیرے بیٹے کی دُکان کھلنے کا وقت بھی نہیں ہوا۔اُس کے ٹھیکرے کی خالی ٹینکی میں خود ابھی فل کروا کے آرہا ہوں۔ اتنی پورے دن میں اُس کی دُکان پر سیل نہیں ہوتی......''

بوڑھی مالنخولیا کی مریضہ لگ رہی تھی۔دہائی دینے لگ گئی: ''ہائے ہائے کس طرح کی باتیں کر رہا ہے یہ بندہ؟ بیٹیوں کا باپ ہو کر۔ہماری بے عزتی ہوئی ہے......''

مہمان مردوں میں سے دو نے خاتون کو بازوؤں سے تھام لیا اور چلنے کی استدعا کرنے لگے۔وہ بولتی گئی: ''مجھے بات کرنے دو۔ یہ بندہ بیٹی کو دو گھسنے کیوں نہیں مارتا۔سیدھی تیر ہو جائے گی۔نکاح میں دس منٹ نہیں لگتے۔پھر ہم جائیں اور ہمارا کام......کس طرح کا باپ ہے؟ پولیس والے لڑکی کے مامے نہیں لگتے۔''

سرفراز بول پڑا: ''بیٹیوں کا باپ ہونا گناہ نہیں۔کوئی کھوتی کو ہاتھ لگا لیا ہے؟ میری بیٹی گھسنوں والی نہیں۔تیرا یہی علاج ہے۔مگر تمہاری عمر گھسنوں سے ٹھیک ہونے والی بھی نہیں رہی۔بے عزتی کروانے پر خود تلی ہوئی ہو، ابھی تک تو کسی نے نہیں کی......''

خاتون کو سٹریچر پر ڈالنے کی کسر رہ گئی۔تاہم اُس کے ہمراہ آئے مرد خاموش رہے۔آخرکار اُس کو فرنٹ سیٹ پر بٹھا ہی لیا۔

مولوی صاحب اور نکاح رجسٹرار کی جان میں جان آئی۔ دونوں ایک ساتھ بول پڑے: ''سرفراز احمد صاحب! ہمیں اجازت دیں۔'' سرفراز نے گیٹ کے ستون کا سہارا لے رکھا تھا۔سیدھا ہو کر کھڑا ہوا اور بولا: ''آپ کیسے جا سکتے ہیں۔اندر آئیں......''

ooo

مجموعے

مجموعہ قرۃ العین حیدر: آگ کا دریا، چاندنی بیگم، میرے بھی صنم خانے	قرۃ العین حیدر
مجموعہ محمد حسن عسکری: (انسان اور آدمی، ستارہ یا بادبان، وقت کی راگنی، جھلکیاں...)	محمد حسن عسکری
مجموعہ شفیق الرحمٰن: پچھتاوے، مزید حماقتیں، دجلہ، دریچے، انسانی تماشہ	شفیق الرحمٰن
مجموعہ شفیق الرحمٰن: کرنیں، شگوفے، لہریں، مدوجزر، پرواز، حماقتیں	شفیق الرحمٰن
مجموعہ احمد ندیم قاسمی: در و دیوار، گھر سے گھر تک، کپاس کا پھول، کوہ پیما، آبلے...	احمد ندیم قاسمی
مجموعہ احمد ندیم قاسمی: آنچل، آس پاس، بازارِ حیات، بگولے، برگِ حنا، نیلا پتھر، سناٹا	احمد ندیم قاسمی
مجموعہ ڈاکٹر محمد یونس بٹ: بٹ پارے، بٹ تمیزیاں، مزاح پرے، نوک جوک...	ڈاکٹر محمد یونس بٹ
مجموعہ انتظار حسین: گلی کوچے، کنکری، دن اور داستان، آخری آدمی، شہرِ افسوس، کچھوے، خیمے سے دور...	انتظار حسین
مجموعہ عبداللہ حسین: اداس نسلیں، باگھ، قید، رات، نشیب	عبداللہ حسین
مجموعہ منشی پریم چند: گئودان، غبن، میدانِ عمل (ناول)	منشی پریم چند
مجموعہ منشی پریم چند: (افسانے)	منشی پریم چند
مجموعہ منشی پریم چند: جلوۂ ایثار، نرملا، چوگانِ ہستی، منورما، بیوہ، روٹھی رانی (ناول)	منشی پریم چند
مجموعہ مرزا ہادی حسن رسوا: (امراؤ جان ادا، مرقعِ لیلیٰ مجنوں، اختری بیگم، شریف زادہ)	مرزا ہادی حسن رسوا
مجموعہ راشد الخیری: (صبحِ زندگی، شامِ زندگی، شبِ زندگی، نوحۂ زندگی، فسانۂ سعید، نالۂ زار)	راشد الخیری
ناول افسانے: ([illegible] شیطانی، ماہِ عجم، عروسِ کربلا، شاہین و دراج، وداعِ ظفر، شہوار، آفتابِ دمشق...)	راشد الخیری
مجموعہ عظیم بیگ چغتائی: مضامین، داستان، ڈرامے، افسانے	تدوین: صلاح الدین محمود
مجموعہ عظیم بیگ چغتائی: ناول، ناولٹ	تدوین: صلاح الدین محمود
مجموعہ عاشق حسین بٹالوی: (تاریخ اور افسانہ)	عاشق حسین بٹالوی
مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد: (ابن الوقت، توبۃ النصوح، بنات النعش، فسانۂ مبتلا...)	ڈپٹی نذیر احمد
مجموعہ ڈاکٹر انور سجاد	ڈاکٹر انور سجاد
مجموعہ سید رفیق حسین (آئینۂ حیرت، افسانے، مضامین، شخصی تاثرات)	سید رفیق حسین
مجموعہ آغا حشر (ڈرامے)	آغا حشر کاشمیری
مجموعہ نثار عزیز بٹ (نگری نگری پھرا مسافر، نے چراغے نے گلے، کاروانِ وجود، دریا کے سنگ)	نثار عزیز بٹ

Rs. 600.00

www.sangemeel.com

ISBN-10 969-35-2929-4
ISBN-13 978-969-35-2929-6